

۱۹۷۰ء کے منتخب افسانے

مرتب
ناصر زیدی

ناشر: مکتبہ میری لائبریری، لاہور ۲

حق اشاعت دائمی بحق مکتبہ میری لائبریری محفوظ

ناشر: بشیر احمد چوہدری ڈائریکٹر مکتبہ میری لائبریری لاہور^۲

طابع: پاکستان ٹائلرز پریس لاہور

بار اول: ۱۹۷۲ء

ترتیب

۷	ناصر زیدی	سید علی بات	-
۹	عصمت چغتائی	اشتر کا فضل	- ۱
۲۲	احمد ندیم قاسمی	لارنس آف قلیلیا	- ۲
۱۴۲	ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	منہکار	- ۳
۵۵	استغفار حسین	دہ جود یو اے کوڈ چارٹ کے	- ۴
۳۹	جیلانی بانو	بہار کا آخری گلاب	- ۵
۱۵۸	نصیر انور	مواد	- ۶
۱۶۸	مسعود مفتی	واپسی	- ۷
۶۵	الطاف فاطمہ	نیشن سائنز	- ۸
۱۹۱	حکیم غزنوی	حکمتی	- ۹
۷۷	مسعود اشعر	آکٹو پریسنگ ہاتھ	- ۱۰
۲۲۴	رضیہ رفیع احمد	بڑاں	- ۱۱

۹۲	نویادہ نغم	ریپ	- ۱۲
۲۴۲	پردہ بین سرور	سراب	- ۱۳
۲۹۲	سی۔ ایل۔ کادش	اُہں بازار سے	- ۱۴
۲۹۹	لطیف کا شمیری	رسل جو	- ۱۵
۱۱۵	نگہت مرزا	ماتم یک شہر آوند	- ۱۶
۱۳۱	مشرق احمد	رشتہ	- ۱۷
۲۷۷	نگہت لغاری	مس عالمہ حبیب	- ۱۸

سیدھی بات!

لیجئے عشقہء کے منتخب افسانوں کے ساتھ پھر حاضر ہوں۔ سالہا سال افسانوں کے انتخاب کی روایت کسی بہت بڑی ادبی افادیت کی حامل ہو یا نہ ہو، میرے لئے ایک گونا گونا بخش ضرور ہے۔

جب میں ادب کے خوش ذوق قارئین کے لئے اردو کی نثری ستھری اور نثری ہونی کہانیاں چنتا ہوں تو میری باطنی کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے میں نے کوئی بہت اہم خدمت انجام دی ہے۔

جی ہاں! انسانے کا انتخاب میرے نزدیک بڑی اہم خدمت ہے۔ میں نے قاری کی رہنمائی کی اور اپنی جگہ ملنے ہو گیا ہوں۔ اب اگر وسائل کی دشواریوں کی بنا پر میں نے اپنے اس انتخاب کا حلقہ محدود رکھا ہے تو تصور میرا نہیں ہے۔ اگر آپ کو میرے ذوق انتخاب پر اعتراض ہے تو یہ ایک طرف الزام ہے اور ظاہر ہے کہ ہر قاری

کو یہ الزام عائد کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ میں اُنی سے یہ حق چھیننے والا کون ؟ رہا
 افسانے کے ارتقائی مراحل اور اس کی مابین خامیوں کا مسئلہ تو اس کا ذمہ دار
 افسانہ نگار ہے۔ تاہم ایک حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قیام پاکستان کے
 بعد اس ربع صدی سے کچھ کم عرصہ میں اردو کے افسانوی ادب نے جتنا سفر طے
 کیا ہے وہ کوئی نصف صدی کا تقدہ ہے۔ اس دور میں ہم نے نئے لکھنے والوں کی
 ایک فوج ظفر و قلم ہاتھ میں لئے افسانے کے سحر سے پر نیر و آواز یاد بچھا ہے اور
 یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر لکھنے والے نے حسب استطاعت بڑا تیر مارا ہے، لیکن میں
 نے انتہائی غیر جانبداری سے آپ کے سامنے یہ محبوبہ پیش کیا ہے اور نئے پراٹوں کی
 جاندار تخلیقات کو حتی الوسع نظر انداز نہیں کیا۔ عدل کی میزان آپ کے ہاتھ میں ہے
 ناشر کے اور میرے حق میں کلمہ خیر کہئے یا میری بے ذوقی کا اور نارویئے ع
 بہر پلوسو تسلیم نم ہے

ناصر زیدی

دیر ماہنامہ ادب لطیف

۱۵۔ سرکلر روڈ۔ لاہور

نوم ۵۲۰۹

اللہ کا فضل

”ہن خدا کا واسطہ بنائے کیا کروں؟“ سکینہ بن نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا۔
”بھئی میری تو یہی رائے ہے کہ فرحت کو طلاق دلوادیں۔“

”جے ہے طلاق؟“ وہ لرز اٹھیں، ”آج تک خاندان میں طلاق نہیں ہوئی۔
پھر دوسری بیٹی رضیہ چھاتی پر بیٹھی ہوئی ہے۔ تاک کٹ جائے گی۔ پھر اے کون
پوچھے گا۔ ایسی پیاری بیٹیاں ہیں، لیکن بر نہیں جڑتے۔“ بر کے معنی صرف تند
قبول صورت فوجان ہی نہیں؟ بر کے لئے لازمی ہے کہ وہ بھاری تنخواہ پاتا
ہو اور اچھے کھاتے پیتے خاندان کا ہو۔ کچھ آگے پیچھے کام آئے۔ دیکھو مرد
ذات کی کمی نہیں۔ بڑی بیٹی کے لئے کنویں میں بانس ڈالے تب کہیں چاک
لڑکا بچا۔ لڑکا اشار اللہ سے ساٹھ سینٹھ کا ہے، ایک بیوی اور چار
لڑکیاں ہیں پر میٹا نہیں۔ بیٹے کے لئے فرحت سے شادی کی تھی سو اس
کے نصیب پر ہنر ٹپکے۔ چھ سال چل رہا ہے۔ بیٹا چھوڑ بیٹھی سی نصیبوں جلی ہو جاتی۔

پہل تو لگتا، لیکن وہاں بھولے کو دن بھی نہ چڑھے۔ کتنے تعویذ گنڈے کئے، اجیری خواجہ نے بھی سیکند کیا کی نہ سنی۔

”اے جی تعویذ گنڈوں کے پھیر میں نہ پڑیے۔ اچھے ڈاکٹر کو دکھائیے۔“
 ”ڈاکٹر سے ڈاکٹر دکھائے۔ سب موئے ہی کتنے ہیں لڑکی میں عیب نہیں۔
 بس بن اشد کا فضل ہے۔ ہوا ہوا نہ ہوا تو اس میں کسی کا کیا دخل؟“
 شاید امداد میاں ہی میں کچھ عیب ہو گیا ہو۔

”منیں بن مردقات میں کہاں عیب ہوتا ہے۔ لوگ اکسار ہے ہیں کہ
 تیسری شادی کر دے۔ انہیں کیا کمی ہے لڑکیوں کی۔ اچھے اچھے لوگ بیٹیاں
 تھال میں سجا کے دینے کو تیار ہیں۔“

فرحت مجھے ایک دن سینا میں ملی تھی۔ اچھی چکنی چٹری رس ملائی رکھی ہوئی
 ہے۔ گویا چارنگ، ہنستی ہوئی صورت، بھرا بھرا جسم، اماں کو بیٹی کا گھر گھرنے کا غم
 کھائے جاتا ہے، لیکن خود فرحت کے دل پر کچھ اثر نہیں، مشکل سے بائیس تیس
 کاس ہو گا۔ ابھی تھوڑے ہی دن سے ان لوگوں سے پہل جول بڑھ گیا تھا، سی ڈی
 پھان کا چار کردوں کا فلیٹ ہے۔ بڑی آن بان سے سجا ہوا۔ پہلی جوی کا رہا
 اپنے اماں باوا کے ساتھ رہتی ہیں۔ یہ فلیٹ خاص طور پر فرحت کے لئے لیا ہے
 لیکن اس کے نام نہیں کرتے۔

”غارت کیجئے امداد میاں کو۔ فرحت کو ہزاروں لڑکے مل جائیں گے!“
 مجھے اندر کا خیال آیا، ان دنوں میرے ساتھ ہی رہتا تھا۔ ”سامے پانچ سو
 ملتے ہیں۔ ترنی ہو جائے گی۔“ اس دن سینا میں فرحت کی نظرس باد بارانور پر پڑی

رہی تھیں۔ سکیٹہ بہن بھی بڑی مہربان نظر آرہی تھیں۔ میں نے ان سے ذکر کیا تو کھل گئیں۔

”اے ہے ایسا ہو جائے تو کیا کہنے میں! ماشاء اللہ کیا چاند سورج کی جوڑی رہے گی۔“

”آپ طلاق دلا دیجئے بس آگے میرا ذمہ!“ میں نے وعدہ کیا۔
مگر انور بدک گیا۔

”بھئی میں اس چکر میں نہ پڑوں گا!“
”کیوں بے وقوف اتنی اچھی لڑکی ہے!“
”لڑکی کہاں؟ کسی کی بیوی ہے!“
”طلاق کے بعد....“

”مگر بڑھیا بڑی کانیاں ہے۔“

”ارے بے چاری بہت سیدھی ہیں۔“

”بڑی چلتی پڑھ ہے بھئی تو اس میں سے بارود کی بُرائی ہے!“
مگر انور بے چارے کی ایک نہ چلی۔ ادھر سے سکیٹہ بہن ادھر سے میں نے وہ بانکا والا کہ بدحواس کر دیا۔ گھیر گھیر کے ہم دونوں انہیں ایک دوسرے سے ٹکراتے۔
بڑی بڑی ٹنکیاں چل کے انہیں اکیلا چھوڑ کے مرک جاتے۔ سکیٹہ بیگم آنکھوں میں آنسو بھرتیں اور شکریہ ادا کرتی ہیں۔

یا تو انور میٹھے پر ہاتھ نہ رکھنے دیتا تھا۔ یا اب یہ حالت ہو گئی جیسے بھوت سوار ہو گیا ہو۔ سر پر کا جوش نہ رہا۔ فرحت نے شادی کی جتنی محبت نہیں کی تھی

انور کی محبت نے اسے ایک نئی زندگی بخش دی۔ انور کو سکینہ کی صودت سے نفرت تھی۔ مگر پھر تو وہ ان کا بھی گرویدہ ہو گیا۔ وہ بھی اس پر صدمے داری جاتی۔ اس کے بغیر ان کے حلق سے نواز نہ اُترتا۔ میری اہمیت بالکل ختم ہو گئی۔ شادی سے پہلے ہی انور کسرال کا ہو رہا۔ رات کے دو دو بجے تک وہیں گھسار رہتا، یا فرحت آجاتی اور دونوں کمرے میں بند ٹھنڈول کیا کرتے۔ میں اپنے کام کے سلسلے میں کچھ دن کے لئے پونا چلی گئی۔ وہاں سے کوئی نو معلوم ہوا۔ میرے پیچھے فرحت مستقل طور پر گھر میں رہی کبھی کہاں اپنے گھر چلی جاتی۔ اب تو شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ دونوں کی محبت عروج کو پہنچ چکی ہے۔

”آپ کچھ کر رہی ہیں؟“ میں نے سکینہ سے پوچھا۔ — پہلے تو نالستی رہیں پھر بولیں۔

”ہاں! احمد آباد کے ایک سوامی جی نے ایک بوٹی دی ہے۔“
 ”اوہ ہٹاؤ سوامی جی کو۔۔۔ یہ لوگ پاکھنڈی ہوتے ہیں۔ طلاق کے بارے میں کیا کر رہی ہیں۔؟“

”اس مخوس طلاق کے نام سے مجھے ہول آتا ہے؟“

”لیکن آخر ہو گا کیا؟“

”اللہ اپنا فضل کرے گا۔“

آؤنہ۔۔۔ اللہ خاک اپنا فضل نہ کرے گا۔ سر کیڑے روئیں گی آپ!

ایک جوان لڑکا اور لڑکی کا یوں دن رات ہلنا۔۔۔۔۔

”کیوں؟ کیا ہوا؟ کیا تم سے فرحت نے کچھ کہا؟“ وہ چونک پڑیں۔

”نہیں فرحت نے کچھ نہیں کہا، مگر میرے کیا آنکلیں نہیں ہیں؟ میں بہت دیر تک انہیں اُورنج منی سمجھاتی رہی۔ وہ بہت دکھی سر جھکائے نہ جانے کیا سوچتی رہیں۔“

”سوامی جی نے سات پٹریاں دی ہیں۔ ہر منگل دار کو ایک پٹریا پان یا گرم دودھ کے ساتھ۔“

”فرحت کو دی ہیں؟“

”نہیں ادا میاں کو؟“

”ادا میاں کو —؟“ میں جل کے رہ گئی۔ ”سات پٹریاں کیا۔ انہیں سات

ایٹم بم بھی نکلا دیئے جاتیں تو کچھ نہ ہوگا، کیا ادا میاں آتے ہیں؟“
 ”ہاں ہر منگل دار کو آتے ہیں۔ تہا دھو کر دو رکعت شکرانہ پڑھ کے گرم دودھ کے ساتھ اور....“

”اد بھی؟ یعنی حد جو گئی — یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟“

”اے بہن تو وہ اس کا شوہر....“

”مگر.... انور ادا ادا میاں.... یعنی.... یہ کیا ہو رہا ہے؟ میری

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے بتاؤں۔ کیا یہ کم بخت اندھی ہے؟ مگر میری بہت نہ پڑی۔“

”اگلے منگل دار کو جو تھی پٹریا ہو جائے گی۔“ وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

”سوامی جی کہتے ہیں اللہ نے پانچویں پٹریا....“

”سکینہ بہن اللہ کے واسطے یہ مذاق اچھا نہیں۔ اب فرحت کی طلاق کے

لئے کچھ کیجئے۔ اور کم بخت ادا دمیوں سے ہر دھڑھکیے۔ میں نے سوچا، خود اور
فرحت الگ ٹیلیٹ لے کر زندگی بڑے مزے سے شروع کر سکیں گے۔

”ہر۔۔؟“ سکینہ بن جھونکی رہ گئیں

”کتنا ہے ہر؟“

”خاک بھی نہیں۔ اب آپ سے کیا چھپانا، بیچیں ہزار ہر تھا تو دس ہزار
سرفراز میاں نے کے ولایت چلے گئے۔ ایسے سدھارے ہیں کہ پٹنے کا نام ہی
نہیں لیتے۔ وہیں مسم سے شادی کر لی ایک بچی بھی ہو گئی۔“

سرفراز میاں سکینہ کے بڑے بیٹے کے ایک دوست کی معرفت فرحت کا رشتہ
ہوا تھا۔ عمر زیادہ تھی ادا دمیوں کی۔ مگر بیٹے کے مستقبل کا سوال تھا۔ ”کسی
قابل ہو کر آگئے تو خاندان کی گری ہوئی حالت منجھل جائے گی۔۔۔ سودہ پٹے
ہی نہیں، اُسے چھ ہزار اور منگا لئے کرائے کے نام سے۔ ادا دمیوں بچے بیٹے
نکے سب ہر کے حساب میں لکھوا لیا۔“

”مگر یہ تو ہوسے سولہ ہزار۔۔۔ باقی....؟“

”دری پر ٹیلیٹ ہے۔۔۔۔۔ وہ رضیہ کے نام ہے۔ میں نے کہا کچھ تو جو

نیک بخت کے لئے۔ آج کل کے لڑکے منہ پھاڑ کے دوڑتے ہیں۔“

مجھے فرحت پہلے طرح ترس آئے گا۔ بجائی کے مستقبل اور بہن کی شادی
کے لئے اس کی زندگی مٹی میں ملا دی۔ ایسی ماں اور نانیکہ ہیں کیا فرق ہے؟

اور اس لئے سکینہ بیگم طلاق سے بوکھلائی جاتی ہیں؟

”بہن اگر ادا دہ نے اور شادی کر لی تو ہم لوگ کہیں کے نہ رہیں گے۔“

کیسے کیسے میں نے چلے کیسے ہیں، دلخیزے پڑے ہیں، غیش مانی میں جیسی توشادی نہیں کی۔ دندنہ لوگ تو انہیں خوب ہنسا رہے ہیں؟

مجھے وحشت ہونے لگی۔ کتنی بے وقوف ہے یہ عورت! کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ مگر کوئی ایسی دلی بات ہو گئی تو کیا ہو گا؟

”دیکھئے آپ نکر نہ کیجئے، آپ انور اور فرحت کے ساتھ رہیں گی۔ رضیہ کی بغیر فلیٹ کے بھی اچھی جگہ شادی ہو جائے گی۔ آپ طلاق کی فکر کیجئے۔“
انہوں نے ہوں ہاں کر کے ٹال دیا۔

اور وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ وہ چاروں سے انور کچھ بولکھائے سے پھر رہے تھے۔ فرحت بھی کچھ دیر ان سے نظر آ رہی تھی۔ میں نے بوجھا، کیا کچھ جھگڑا ہو گیا؟ تو دونوں گھبرا گئے۔

رات کو کچھ غیب و صاحبو کر رہی سی انور کے کمرے میں بھی ہوئی تھی۔ اندر سے فرحت کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

”اندر آئیے! وہ مجھے ہاتھ پکڑ کر لے گیا۔“ اس بے وقوف کو سمجھائیے؟
”کیا ہوا؟“

”آئی! وہ میرے پیروں سے پٹ گئی۔“

”یہ کھڑکی سے کود کر۔“ انور بڑی طرح لرز رہا تھا۔

”پانگل ہوئی ہو؟“ میں نے اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ اوپر اٹھایا: سب

ٹھیک ہو جائے گا۔ یوں رو رو کر مکان ہونے سے فائدہ؟ طلاق کے بعد۔۔۔؟

”ہائے آئی جی! امی طلاق کے نام پر منہ پیٹے لیتی ہیں۔“ کنفی ہیں

نکلیا کمالوں کی؟

”اتنی کم بخت کا تو بھیجہ بگھل گیا ہے، تم خود بالغ ہو، طلاق لے سکتی ہو۔
اور پھر اب ایسے حالات میں تو... وہ راضی ہو جائیں گی؟“

”نہیں آنٹی جی، وہ.... وہ نہیں مانیں گی۔ ہاتے میں مرجاؤں؟“

”مرجاؤ گی مگر اچھے حق کے لئے فدا اپنی امتی سے مقابلہ نہیں کر سکتیں۔“

”ان کا مدنا نہیں دیکھا جاتا، کل انھیں بڑے زور کا دورہ پڑا۔ وائٹ بچے
گئے۔ بس اتنی سی بات ہوئی تھی کہ میں نے کہا انھیں منع کر دو، شگل ونگل کو
نہ آئیں، میں ان کی صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔“ مجھے گھین آتی ہے۔ ہاتے آنٹی
آپ کو کیا بتاؤں، وہ تو آدمی نہیں کتا ہے۔“ منہ ٹھک کے رہ پھر سکیں، لینے لگی
”تم نے اپنی ماں کو بتایا؟“

”نہیں جب انھیں اصلیت کا پتہ چلے گا۔ وہ مجھے کاٹ کے پھینک دیں گی۔“
”نہیں جب انھیں اصلیت کا پتہ چلے گا تو مارا دے دیں گی۔ اس کے سوا
چارہ ہی کیا ہے؟ میں صبح جا کر ان سے سب کچھ کہہ دوں گی اور رات دن کے اندر
طلاق....“

”طلاق تو وہ مر کے بھی نہ لینے دیں گی۔ ویسے ہی ہر وقت کہتی ہیں تو تو خاندان
کا نام اچھا لے گی۔ تیرا کیا ہے؟ درمرا ختم کر، پھر تیسرا کر؟“

میں نے اسے سمجھایا، یقین دلایا، اس کی ڈھارس بندھ گئی اور تھوڑی ہی دیر
میں مسکراتے لگی۔ روئی روئی شکل پر ہنس کچھ ایسی پیاری لگ رہی تھی کہ منہ کی
نئی نئی آنکھیں اس کے چہرے پر چمک گئیں۔

میں ان دونوں کو پھوڑکا پٹے کمرے میں آگئی۔ سونے کی کوشش کی مگر نیند آگئی۔ اگر امداد میاں کو پتہ چل گیا تو غضب ہو جائے گا۔ اور ٹٹری میں ہے۔ کم محنت کا کورٹ مارشل ہو جائے گا۔ امداد کی پہلی جی سی نو آؤ ہار کھائے بیٹھی ہیں۔ سکیٹنگ بیگم اور فرحت کی دھجیاں اڑا دیں گی۔ ڈرتی ڈرتی میں صبح ان کے پاس پہنچی۔ حسبِ عادت وہ نگرہ سندھی بیٹھی تھیں۔ میں نے ٹٹری رسائیت سے فرحت کی پٹا سنائی۔ تمہیں کھاکر تھیں دلا یا کہ انور د خانہ دے گا۔ وہ تو اس پر جان چھوڑتا ہے!۔ میں چورس گم ٹم رہ گئی۔ سکیٹنگ بیگم کے کلیجے پر جیسے مٹھن گن کی بارود چل گئی۔ پاگوں کی طرح ہنسیں اور بچوں کی طرح مدد نہ لگیں۔ بچے کی طرح ان کا جسم کانپا اور وہ دبیں ڈھیر ہو گئیں۔ میرے ہاتھ پر پھول گئے۔ رضیہ بالی جلد چلی گئی، فرحت اپنے کمرے میں بیٹھی کانپ رہی تھی۔ انہوں نے کسی کو کوٹا نہ بیٹھا۔ نہ میرے منہ پر تنو کا کہ میرے بھائی نے ان کا نصیب پھوڑ دیا۔

”آپ اسی وقت وکیل کے پاس چلیے اور فرحت کو میں اپنی بہن کے پاس دہلی بھیجے دیتی ہوں۔ امداد پر ہر طرح کا دباؤ ڈالا جائے گا۔ آپ نگرہ کیجئے۔“ ان کے چہرے پر جواہریاں اڑ رہی تھیں سر جھکائے بیٹھی رہیں۔

”وکیل؟“ انہوں نے احمقوں کی طرح کہا۔ ”ہاں۔ مگر اس وقت۔۔۔“ میں پھر آپ کو فون کر دوں گی۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ واپس آکر میں فون کے انتظار میں بدحواس رہی۔ کہیں مددوں والی بیٹی زہر کھا کر دے سو رہیں۔ ساری عمر کی تھمت چڑھ جائے گی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ حالات یوں پٹا کھائیں گے۔

انور کا عجیب حال تھا۔ کہتے ہیں مرد بہ دانا ہوتے ہیں عورت کو مصیبت میں پھنسا کر دھوکہ دے جاتے ہیں مگر انور کی تو جان بکلی جا رہی تھی۔ شام تک انتظار کیا مگر فون نہ آیا۔ جھک مار کر میں نے فون کیا تو جواب نہ ملا۔ جب بہت ہی بے چین ہو گیا تو میں نے انور کو بھیجا۔

انور ڈٹا تو صورت دیکھ کے میرا دم بھل گیا۔

”کیا کہا؟“

”گھر میں کوئی نہیں، تالہ پڑا ہے۔ گورکھ سے پوچھا۔ معلوم ہوا سب گئے!“

”کہاں گئے؟“

”کچھ پتہ نہیں!“

سات اگلا دون پر گئی۔ انور پاٹلوں کی طرح دنیا بھر کو فون کرتا رہا۔ ادویہ کی سسرال کو فون کیا۔ پتہ چلا، کہاں گئے ہیں، کچھ معلوم نہیں۔ شاید دروہا کے فلیٹ میں ہوں گے۔

انور دیوانوں کی طرح در سودا بھاگا۔ میں نے بہت روکا لیکن اس پر تو بہت سوار تھا۔

دہان ایک ڈکر تھا۔ اس نے کہا، کہاں گئے ہوں گے یا چرچ گیٹ۔ ایک آٹا پیٹر روڈ پر بھی تھا۔ وہاں بھی نہ ملے۔ تین چار دن گزر گئے تب معلوم ہوا کہیں باہر گئے ہیں۔ آفس کو پتہ ہو گا۔ منوس کے تین چار آفس تھے کہیں نہ معلوم ہو گا کہ کہاں سر گئے۔

پچھلے ساتویں دن ایک لٹاؤ ملا۔ میلا کھلا پھٹا ہوا۔ لکھا تھا۔

”خدا کا واسطہ لگے بچاؤ۔ اس جنم سے نکالو۔ میری جان پر ایسا سپرہ ہے کہ سانس لینا مشکل ہے۔ اشد میری جان پر دم کرو!“

”فرحت“

خط پڑھ کر تو اور سولی سوار ہو گئی۔ مٹی مٹی مریے پتہ چلا خط یکم بیٹے سے ڈاک میں ڈالا گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ حیدر آباد گئی ہوں گی۔

کون بچائے کیسے بچائے؟ انور دیوانوں کی طرح حیدر آباد بھاگا۔ ادھر ادھر سرار کے لوٹ آیا اکچھ پتہ نہ چلا۔

کیا دل پر وحشت تھی۔ اب بھی سوچتی ہوں تو پھریریاں آنے لگتی ہیں۔ تو کوکن مصیبتوں سے منبھالا ہے کہ بس میں ہی جانتی ہوں۔ اس گناہ میں میری مدد بھی شامل تھی۔ میرے دامن پر بھی بے گناہ خون کے دھبے تھے۔ اسی سال انور کا تبادلہ دہلی کی طرف ہو گیا۔ میری جان چھوٹی! اس واقعہ کو کتنے ہی سال بیت گئے۔ انور کو صبر آگیا۔ چاند سی دامن اور بچوں نے سب کچھ بھلا دیا۔

میں مارک اینڈ اسپنسر سے نکل رہی تھی اور وہ داخل ہو رہی تھیں مگر بڑے ہوتے بچی! تنھوڑی دیر ہم اٹھنوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

”ہن آپ!“ وہ سمور کا کوٹ پہنے محمد سے لپٹ گئیں۔ اشد کتنے سال ہو گئے!“

”سکینہ جین!“ بیل حلق خشک ہو گیا۔

”سرفراز میاں کے ہاں ٹھہری ہوئی ہوں۔ انھوں نے تو پٹے کا نام نہیں لیا۔ میں نے کہا چلو میں ہی ناک نیچی کر کے مل آؤں۔ اس بھانصوایت کی سیر بھی ہو جائے گی۔ اشد! کیا ہشت بہر بنایا ہے ان فرنگیوں نے؟ وہ اٹلی، فرانس

اور سوئٹزرلینڈ کے قحطے بیان کرنے لگیں۔

ان کی صورت پر ایک دم اطمینان اور جوانی ٹوٹ پڑی تھی پہلے سے بھاری بھرکم بھی معلوم ہو رہی تھیں کسی اچھے ہیرسٹون سے ہاں بنوائے تھے۔ وہ حیران پریشان سکیٹھ سوکھی ڈال سے ایک دم لعلمانا چمن بن گئی تھیں۔
”فرحت کیسی ہے؟ میں نے ذرا تکلف محسوس کیا۔

”اللہ کے فضل سے بہت خوش و غرم ہیں میاں بیوی۔ نادرمیاں بھی خیر سے اسکول جاتے ہیں۔ ناظم آباد میں کیا تو دُوق کوٹھی ہے۔ ٹی وی ہے۔ کیا پیرا صورت ہے نادرمی۔ بنا بنا یا باپ ہے؟

”باپ!“ میں الجھن میں پڑ گئی۔

”جی ہاں، وہی چٹا رنگ اور نیلی آنکھیں؟“

”امداد میاں کی نیلی آنکھیں؟“

”اے ہے، آپ تو ایسی بن رہی ہیں جیسے وہ ڈھٹائی کے کھلکھلایا اور جلدی جلدی سامان ٹرائی میں رکھنے لگیں۔

”اور وہ سات بڑیاں؟“ میں نے گریدا۔

”اللہ قسم آپ کو ایک ایک بات یاد رہتی ہے۔ پچھلے چار ہزار دس تھے سوائے“
”ٹیڑیوں کے یا ترکیب کے؟“

”وہ نگوڑا تو کچھ اول فول کے تھا؟“

”یعنی اپنی خدمات پیش کر رہا تھا؟“

”جی اور دس ہزار ایک رہا تھا، مگر نیک بخت کی صورت دیکھ بھانچ پڑھے

تھا: وہ بڑبڑائیں۔

”امداد میاں کو شک تو نہیں ہوا؟“

”اے ہٹائیے بھی — دنیا جہاں کے مرقہ سے جو اپنی اولاد پر شک شبہ کرنے لگیں تو.... بس اب جانے بھی دیجئے۔ اتنی قفل اپنی گروہ میں جوتی تو میری معصوم بچی پر لازم نہ تھوپتے اپنے بوڑھے گریبان میں بھی ایک بار جھانک کر دیکھتے۔ اے مٹی ڈالنے ان باتوں پر دم ٹوٹتا ہے میرا۔“

”انور بے چارہ بہت تڑپا، آپ لوگوں نے صورت بھی نہ دکھائی بیٹے کی۔ میں نے مچکی لی۔“

”بس جانے دیجئے! یہ جو گلی گلی بچے چکاتے پھرتے ہیں تب کیجھ نہیں پھٹتا۔“

بیتا رہے اشد اے درجنوں بچے دے۔ وہ انور کو دعائیں دینے لگیں۔

میں نے ان کے بیش قیمت سمور کو دیکھا اور چائنا سلک کے اسکارف کو۔

پھر قسطل میں ناظم آباد میں پھیلی ہوئی تلی ددنی کوٹھی کا رقبہ نا پا۔ بٹھے میں سے پھلکے ٹوٹا ہرے ہرے پونڈوں کی گڈی دیکھی اور مجھے بے طرح کوفت ہونے لگی۔

میں کیوں جو رہی بیٹھی تھی فرحت کی گود بھرنے میں میری ہمدردیاں بھی تو شامل تھیں۔ اور انور کتنا بد صورت تھا۔ برسوں ضمیر کی ملامتیں سناتا رہا۔ جسے وہ اپنی نالائق میں گناہ عظیم سمجھے بیٹھا تھا وہ تو میں ثواب تھا۔

”میسریں مدی“ دہلی

لارنس آف تھلیبیا

پنگ اتنا چوڑا تھا کہ اس پر جو کہیں بیٹھا تھا وہ چار کھیلوں کے برابر تھا۔ اس کے وسط میں پیش کے ایک گاوٹ لگنے کے سہارے بڑے ملک صاحب کے جسم کا ڈھیر بڑا تھا۔ ان کی انگلیوں، انگوٹھوں، پنڈلیوں، رانوں، گڑبڑیہ کندھوں اور سر کو بہت سے میرانی، تانی، جھیرا، دھوبی، موچی، گھمارا اور کسان و بارے تھے۔ میں ذرا دور بیٹھا تھا اس لئے وہاں سے مجھے یہ منظر یوں دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے ایک بڑے سے خیارے کو چوڑا میں اڑ جانے سے روکنے کے لئے اس کے ساتھ بہت سے بچے چپٹ کر رہ گئے ہوں۔ پھر خدا بخش نے چوہاں میں قدم رکھا۔ بڑے ملک صاحب بولے: ”آج چھوٹا ملک بہت خوش ہے آج اس کا یار آیا ہوا ہے لاہور سے“ انھوں نے ایک لمبی کانگہ کے ساتھ پلٹ کر میری طرف دیکھنے کی اور شاید مسکراتے کی بھی کوشش کی مگر یہ مسکراہٹ مجھ تک نہ پہنچ سکی۔ ان کے سوچے چمکے گالوں اور گھنے گل جھوں سے ٹکریں مار کر وہی کہیں لگتی۔

میں دور اس لئے بیٹھا تھا کہ میرے لئے چائے آنے والی تھی۔ بشکو چپال کے بنام سے کے آخری سرے پر دو کرسیاں اور ایک تپائی رکھ کر اور مجھے ایک کرسی پر بٹھا کر خدا بخش کو لانے اور چائے لانے چلا گیا۔ بشکو خدا بخش کا بہت چہیتاؤ کرتھا۔ نام تو اس کا بھی خدا بخش تھا، مگر خدا بخش اسے بشکو کہتا تھا۔ چنانچہ یہی اس کا نام پڑ گیا۔

خدا بخش کی امی کو نزلے اور بخار کی شکایت تھی اس لئے وہ بار بار اندر چلی کاچکر لگا آتا تھا۔ اب کے وہ واپس آیا تو میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور مجھے بتایا کہ اس کی امی کا بخار اب ہلکا ہے اور وہ آرام کر رہی ہیں۔ ان کا بخار تیز رہتا تو آج میں تمہیں باز کے شکار کا تماشہ نہ دکھا سکتا۔ وہ بولا: لارنس آن عربا کی طرز پر میں نے اپنے باز کا نام لارنس آف تھیلیا رکھ لیا ہے۔ نعل کو تھیلیا میں بدلنے پر تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟ وہ ہنسا: ابھی چائے کے بعد تم اور میں اور بشکو گاؤں سے باہر نکل جائیں گے۔ بشکو میرے باز کا ساتھی ہے۔ وہ پھر ہنسا: یوں سمجھ لو کہ وہ لارنس آف تھیلیا کا اردلی ہے۔ وہ باز کو اپنی منگھلی پر بٹھائے گا اور —

دھم دھم کی آواز سے ہم چوٹکے، دیکھا تو دو آدمیوں نے ایک اور آدمی کو پکڑ کے بڑے ملک صاحب کے سامنے ٹھکرا رکھا تھا اور ملک صاحب اس کی پیچھے ہر منکوں کا مینہ برسا رہے تھے اور ساتھ ہی ایسی گالیاں بھی دیتے جاتے تھے جو صرف بڑے ملک ہی کسی کو دے سکتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ ہانپ ہانپ کر کہتے جاتے تھے: بھری مہلبس میں کہتا ہوں، ملک جی تہ بند سنبھا

ننگے ہو رہے ہو۔ اس حرامزادے کے کوئی پوچھے کہ تمہیں کیا تکلیف تھی۔
میں ہی ننگا ہو رہا تھا تمہاری ماں تو ننگی نہیں ہو رہی تھی؟

خدا بخش نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا: ”اگلی شامت بے چارے
کی۔ اب جب تک یہ ہاتھ پیر پڑھیلے نہیں چھوڑ دیتا۔ ابا اسے کوٹتے ہی رہیں گے۔“
خدا بخش کے لہجے میں برتری کا غرور تھا۔ میں نے کہا: ”خدا بخش تمہیں شرم
نہیں آتی؟“ تم تو پڑھے لکھے آدمی ہو۔“

خدا بخش نے معذرتی انداز میں کہا: ”کیا کریں یار۔ ان لوگوں سے یہی
سلوک کیا جائے تو سیدھے رہتے ہیں۔“

اتنے میں بنگلو چائے لے آیا طلعت کو تپانی پر رکھتے ہوئے اس نے جھک
کر خدا بخش کے کان میں کہا: ”سکین ایسا بُرا لڑکا تو نہیں چھوٹے ملک۔ پھر اسے
مار کیوں پڑ رہی ہے؟“

”اچھا تو یہ سکین ہے! خدا بخش نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔ اس کے تومر
میں زبان بھی نہیں۔“ پانچ وقت کا نمازی ہے اذان ایسی دیتا ہے کرچڑیاں
مسجد کے میناروں پر اتر آتی ہیں۔ اس نے یہ کیا پاک دیا آتا ہے!

بڑے ملک صاحب کے دھوکوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ سکین ان آدمیوں
کے ہاتھوں میں لٹک گیا تھا جنہوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر ملک صاحب
کی آسانی کے لئے ان کے سامنے جھکا رکھا تھا۔

آب چھوڑ دو اس کہنے کو۔ ملک صاحب کرکے اور سکین منہ کے بل ہنتر
کی طرح گر پڑا۔ ”اٹھا لے جاؤ اپنی اپنی ماؤں کے اس یار کو۔ ملک صاحب

پھر گرے۔ اور ایک جھوم کا جھوم سکین کو اٹھانے یوں بے تابی سے بڑھا جیسے سب لوگ سکین کو اٹھانے کے بہانے ملک صاحب کو ہنگ پر سے اٹھا کر پھینکنے چلے ہیں۔ پھر جو لوگ سب سے پہلے بے حس و حرکت سکین کے پاس پہنچتے اسے اٹھانے کے لئے جھکے تو جھکنے والوں میں سے ایک مسیدھا ہو گیا اور بڑی تشویش سے بولا: "سکین تو اذان پڑھ رہا ہے!"

پھر سکین غدی ہی اٹھ بیٹھا۔ ادھر اُدھر دیکھا۔ پھر جیسے ملک صاحب سے جانے کی اجازت لینے کے لئے بولا: "سورج تو بہت ڈھل گیا پیشی کی نماز تو چوکی ہوئی" سبھی کو خاموش پا کر وہ اٹھا تو میں نے دیکھا کہ وہ چوہا کا ایک جیسہ جوان تھا اور جب وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا، چوہاں کے چوتھے کی سیڑھیاں اتر کر گلی میں جانے لگا تو مجھے ایسا لگا جیسے گلی میں ایک مینا چل رہا ہے۔

آجاتے ہیں ماں کے بازو چپاں پر گپ لڑانے کے لئے؟ "بڑے ملک صاحب کہہ رہے تھے: چوہاں پر بیٹھے کی ایک تمیز ہوتی ہے۔ کہنے لگا ملک بھی نیگے ہوئے۔ ہر بھی میں نیگا ہو رہا ہوں تو تم دھیان نہ دو۔ افسانہ دوپہر کے وقت بھی نکلیں بند کر کے تو اس کے لئے سورج ڈوب جاتا ہے۔ پھر تم آنکھیں پھاڑے میری طرف کیا دیکھ رہے ہو؟" ذرا سا بگ کر انھوں نے پٹنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا: "کیوں چھوٹے ملک؟ چائے پلا دی اپنے یار کو؟" جواب کا انتظار کرتے بغیر فوراً ہی انھوں نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا لیا اور بولے: "لو جی! اسے دوبارہ دیکھنے لگا ہے حرازو سے کی پٹیاں کوٹ کوٹ کر۔"

"یہ حرازو کون تھا؟" میں نے آہستہ سے خدا بخش سے پوچھا۔

اُس کا نام سکیں ہے؟ خدا بخش بولا: ذات کا جولا ہے۔ یہ کہیں جو آبا کے پلنگ پر بچھا ہے اس نے بنا ہے، بڑا کارگر آدمی ہے۔ بڑا نیک آدمی مگر بہت بھولا ہے۔ نہ جانے آبا کو ٹوکنے کا قصد کیسے ہوا اس بد نصیب کو! یہ تو بڑا ہی مسکین آدمی ہے! بشکو فوراً بولا: اس کا اصلی نام مسکین ہے جی۔ محمد مسکین۔ سکیں سکیں تو لوگ اسے دیسے ہی کہتے ہیں، جیسے مجھے بشکو، بشکو کہتے ہیں۔

میں نے کہا: یہاں اگر معلوم ہوا کہ مسکین جیسے لفظ میں بھی جگڑنے کی گنجائش موجود ہے؟

”آہستہ بولو یا رے“ خدا بخش نے ڈر کر بڑے ملک صاحب کی طرف دیکھا۔ پھر بولا: اہستہ نے شن لیا تو شاید تمہیں تو کچھ نہ کہیں، میری آفت آجائے گی۔

”نہیں۔۔۔ اب کیا آفت اٹھے گی۔ اب تو ان کا ہاتھ دکھ رہا ہے۔“ خدا بخش کو میرا ہمدرد اچھا نہ لگا اس نے جیسے علامت بھیجتے ہوئے مجھے دیکھا اور بشکو سے کہا: اسطبل میں جا کر دیکھو، بیگے نے گھوڑے تیار کر لئے ہیں یا نہیں۔ زمینیں کس لی ہوں تو ختم جا کر لارنس کو اٹھا لاؤ۔ صبح کا سہو کا ہے: بشکو چلا گیا تو خدا بخش میری طرف مڑا: ”دیکھو میاں یہاں کچھ تمہارا سپلاؤن ہے اور تمہارا ہی طرز کرنے لگے ہو میرے آبا پر۔“ اس ملائے کا ایک منقولہ ہے کہ سر قنارہ نے بتایا ہے۔ درد سر کا رقبہ اتنا ہی پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ آبا کو یہ پٹائیاں جھوڑا کرنی پڑتی ہیں۔۔۔ نہ کریں تو زمیندارہ کیسے چلے۔“ وہ رگ گیا، پھر بولا: ”محم کیا سوچ رہے ہو؟“ میں نے کہا: میں سوچ رہا ہوں کہ جس لمبے چوڑے پلنگ پر ملک صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ اس کے پائے کتنے بڑے بڑے ہیں میں نے انہیں خود سے

دیکھا تو وہ لکڑی کے ٹکے ۛ

حیران ہو کر خدا بخش نے پوچھا ۛ لکڑی کے نہ ہوتے تو اور کس کے ہوتے؟
تم نے پہلے کیا سمجھا تھا؟

میں نے کہا ۛ میں سمجھا یہ پائے نہیں بلکہ پٹنگ کے ہر کو نے کے نیچے ایک
ایک مسکین کھڑا ہے ۛ

ۛ گھاؤں کی کٹلی خدا کا تم پر ٹا اثر ہوا ہے ۛ خدا بخش بولا ۛ تم پکرا گئے ہو ۛ
میں نے اپنی بات جاری رکھی ۛ اور خدا بخش ۛ میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر
پہ چاروں مسکین پٹنگ کے چاروں گوشوں کے نیچے سے نکل جائیں تو پٹنگ
زمین ہمارا ہے ۛ

ۛ گھوڑے تیار میں چوٹے ملک ۛ بشکو ہمارے سروں پر بولا ۛ

بشکو کے بائیں ہاتھ کی بندش پر چڑے کا دستا نہ چڑھا ہوا تھا جس پر وہ رنس
آں تھلیا بیٹھا تھا ۛ اس کے پنجے میں باریک سی ایک زنجیر تھی جس کا آخری برا
دستا نے میں ٹکا ہوا تھا ۛ باز کی آنکھوں پر چڑے کے کھوپے چڑھے ہوئے تھے ۛ
خدا بخش نے سراٹھا کر یہ کھوپے ہٹائے تو میں نے دیکھا کہ باز کی آنکھوں میں
ہلا کی وحشت تھی ۛ

ۛ کیوں کیسا ہے میرا باز؟ ۛ خدا بخش نے پوچھا ۛ

اور میں نے اس کے کان میں کہا ۛ بازوں کا ہر ایک معلوم ہوتا ہے ۛ
خدا بخش ہنس پڑا ۛ گریوں ہنسا جیسے نہ ہنستا تو اور کیا کرتا ۛ اس نے باز کی
آنکھوں پر پھر سے کھوپے چڑھائے اور ہم لوگ اسٹبل کی طرف پہلے ۛ

خدا بخش نے قسمیں کھا کھا کر مجھے یقین دلایا کہ اس نے جو گھوڑا مجھے سونپ دیا تھا وہ ایک عمدہ ملک صاحب کے اصطبل کا مسکین ترین گھوڑا تھا۔ آسانوٹا بازہ گھوڑا مسکین تو نہیں ہو سکتا۔ میں نے شبہ ظاہر کیا۔ مگر اس نے مجھے بتایا۔ ”اس کے اندر کا گھوڑا پتا مار دیا گیا ہے اب یہ طبیعت کا بہت غریب گھوڑا ہے اسے موٹا بازہ رکھنا بہت ضروری ہے ضلع کے افسر لوگ جو اس طرف دیکھ رہے ہیں اچھے سوار نہیں ہوتے، ہوتے بھی ہیں تو کاروں میں پھیل پھیل کر بیٹھنے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ اور گھوڑے کی پیٹھ پر جو کس ہو کر بیٹھا پڑتا ہے۔ سو اتانے اس کام کے لئے یہ گھوڑا چنا کما س پر افسر سوار ہو تو اس کی افسری کی شان بھی قائم رہے اور یوں بھی نہ ہو کہ گلام کو زما سنا بھی ڈھیلا پا کر وہ افسر کو اپنی پیٹھ پر سے ریٹائر کر دے۔ چنانچہ اس گھوڑے پر باؤڈریشی کسٹر بیٹھے ہیں یا آٹھ تم بیٹھے ہیں نے کہا۔ تو جیسی اس وقت تم مجھے پٹواری لگ رہے ہو؟

خدا بخش کا گھوڑا بہت منہ زور تھا۔ کنوئیاں اٹھا کر اور نشتے پھٹا کر وہ جیسے گلام کو چبا کر اڑھانا چاہتا تھا۔ مگر خدا بخش اچھا سوار تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو میرے گھوڑے سے آگے نہ بڑھنے دیا جس کی کنوئیاں تو اٹھی ہوئی تھیں مگر چل یوں رہا تھا جیسے سسرال کے صحن میں پہلی بار داخل ہوتے ہوئے دامین چلتی ہیں۔ بشکو باز کو ہاتھ پر بٹھائے ہمارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ وہ بھاگ بھی نہیں رہا تھا اور چل بھی نہیں رہا تھا۔ بس بین بین کی سی کیفیت میں مبتلا تھا۔

میکروں کے گنہان ذخیرے کا موڑ کاٹتے ہی حیدر ٹک پھیلا ہوا ایک چٹیل دیر انداز تھا۔ جس میں کہیں کہیں بہت فاصلے پر کیکر اُگے ہوئے تھے مگر

یہ کیکو یار سے گتے گتے تھے۔ ان کے تہ بہت چھوٹے اور شاخیں بہت شیریں اور
 نگی تھیں۔ لالہاں شام سے پہلے انہی اکاؤ کیکروں پر آکر بیٹھتی ہیں۔
 خدا بخش نے مجھے بتایا: اور لالی باز کا سن بھانا کھا جا ہے۔ میرا لارنس لالی کو
 دیکھتا ہے تو پاگل ہو جاتا ہے۔ لالی کا گوشت میرے لارنس آف تھیلیا کی دیکھی ہے!
 میں نے کہا: خدا بخش لالی تو بڑا ہی معصوم پرندہ ہے۔ یہ تو چڑیا ہے بھی
 زیادہ معصوم ہوتا ہے۔ اس کی بلی بلی کچی کچی باجھیں اس پر کیسا پھینسا طاری
 کئے رکھتی ہیں۔ پھر یہ پرندوں میں شاید سب سے زیادہ بے ضرر ہے۔ یہ تو نہایت
 مسکین مخلوق ہے۔ آخر تم لوگوں کو سکینوں کا خون پینے کا اتنا شوق کیوں ہے؟
 خدا بخش بولا: اگر تمہیں تقریر کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو راستے میں بھی
 کوئی شیوا آئے گا، تم اس پر چڑھ جانا اور اپنی تقریر جھاڑنا۔ میں اور بشکومت
 بستہ سنیں گے بلکہ ابھی دھاڑک جاؤ۔ میرے لارنس کو دیکھو! بشکومت کی سٹھی پر کیے
 بار بار پھڑپھڑا جاتا ہے۔ اس نے دیرانے کی بوسہ لگولی ہے۔
 لالی! بشکومت کی طرح پھنکارا اور خدا بخش نے گھوڑا بندک لیا۔ میرا
 گھوڑا تو اس کی دیکھا دیکھی چل رہا تھا۔ چنانچہ وہ بھی ٹرک گیا۔
 خدا بخش نے بازی کی آنکھوں پر سے کھوپے اتارنے سے پہلے مجھے خود سے
 تماشہ دیکھنے کی تلقین کی۔ یہ تمہاری زندگی کا ایک کبھی نہ بھولنے والا تجربہ ہوگا۔
 اس نے کہا: مزہ آجائے گا جب باز لالی پر چھپے گا تو ایسی آواز پیدا ہوگی
 جیسے ہوا کو تلوار کاٹ رہی ہے۔ دیکھو!
 خدا بخش نے بازی کی آنکھوں پر سے کھوپے اتارے اور اس کا رخ دُور

ایک ٹیڑھے میٹھے کیکر کی طرف کر دیا جس پر تقدیر نے ایک لالی کو لایا تھا۔ ایک دم باز پر وحشت طاری ہو گئی۔ اس نے دیکھ لیا لالی کو۔ خدا بخش نے خوش ہو کر مجھ بتایا اور بشکو نے باز کے پنجے کو اپنے دستانے سے آزاد کر دیا۔ موت کی تلوار ہوا کا شتی ہوتی چلی گئی اور لالی اڑ گئی۔ مگر باز نے اُن کی آن میں اس کو جا لیا۔ لالی کی ایک چیخ نے اس دیر نے کو ذرا سا چونکا دیا، اور پھر باز لالی کو اپنے پنجوں میں دبا کر واپس بشکو کی مٹھی پر آ بیٹھا تب اس نے لالی کی چیرھاٹ شروع کر دی۔ اس کی مٹھی ہوتی چوخی لالی کے خون میں رنگ گئی، پھر اس نے لالی کی بوٹیاں نوچنا شروع کر دیں اور خدا بخش مسلسل بولتا رہا۔ ”اس کے کھانے کا قرینہ دیکھو — ہڈی پر سے گوشت کیسے اُتارتا ہے“ اس کو بھی ایسا سلیقہ نصیب نہیں اور پھر یہ تو کچا گوشت ہے تازہ اور دھامن سے بھر پور!“

”لعنت!“ میں نے کہا۔ ”تمہاری ذہنیت تو آدم خوروں کی سی ہے۔“ مگر خدا بخش ہنستا رہا اور میری طرف یوں دیکھتا رہا جیسے میں بیمار ہوں اور وہ میری دل آزاری نہیں کرنا چاہتا۔

باز جب لالی کو چبا چکا تو جیسے اسے شہ ہو گیا، اس نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا بخش بولا: ”لارنس آف تعلیلیا آؤٹ ہو گیا۔“ پھر مہنت ہوا وہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ باگ موڑی مگر پھر رگ گیا۔ کچھ سوچ کر بولا: ”کیوں بشکو سیاں تک پہنچ گئے ہیں تو بابا یارو کو کیوں نہ دیکھتے چلیں۔“

بشکو بولا: ”بابا یارو کی آنکھ بھی باز کی طرح تیز ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے

ہیں دیکھ ہی لیا ہو، ہم واپس چلے گئے تو وہ ضرور لگ کرے گا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ خدا بخش میری طرف مڑا۔ چلو نہیں تھل کی جائے پلا تیں۔ یہاں قریب ہی ہمارے پیمانے مزارے : بابا رو کا ڈیرا ہے، وہاں چلتے ہیں۔ ہم اس سے بل کر فروش ہو گئے۔“

بازنے جس وحشت سے لالی کو کھایا تھا، اس سے میری طبیعت بالکل ٹھس ہو رہی تھی۔ میں نے کہا : ”جہاں چاہو چلے چلو۔“

ڈھائی تین میل کا فاصلہ طے کر کے ہم ٹرنی ہائل مٹی سے بچے ہوئے ایک گھروندے کے پاس پہنچے۔ خدا بخش نے چپکے سے اترنے اور آہستہ آہستہ قریب جانے کی تجویز پیش کی۔ وہ بولا : ”بڑا لطف آئے گا۔ ایک بار میں اور شکریہ چپکے سے آئے اور بابا رو کے پاس ایک چار پائی پر بیٹھ گئے۔ بابا رو اپنی رسیاں بٹنے میں مگن رہا، مائی بیگیاں چولہے میں پھونکیں اور تکی رہیں اور لگی ٹوکے سے چارہ کترتی رہی کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔ پھر جب انھیں پتہ چلا تو بابا رو اتنا خرمندہ ہوا کہ کچھ کہہ ہی نہ سکا۔ منہ سے بس پھپھپ کر کے رہ گیا۔ مائی بیگیاں اپنے بڑے پائے کو گالیاں دیتی رہی۔ اور رنگی تو اتنا ہنسی کہ جب بابا کی ہنسی پر بھی اس کی ہنسی رکنے میں نہ آئی تو وہ اندر کوٹھے میں بھاگ گئی۔“

گھروندے کے پچھواڑے گھوڑوں پرست اتر کر ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھے صحن میں بیکر کے بڑے بڑے درخت تھے، نیچے ایک گھاسے اور چند میٹریں بکریاں شاید عادتاً بیٹھیں تھیں کیونکہ درختوں کے سائے اپنے تئوں کے سائے سے بہت دور چپکے تھے۔ ان بھیروں کے پاس کھٹولے پر بابا رو بیٹھا آٹون بٹ رہا تھا۔

دیوار کے ساتھ لگے ہوئے چولے میں آگ جل رہی تھی اور مائی بیگیاں ہانڈی میں بچھ چلا رہی تھیں جیسے پتھر اُبال رہی ہے۔ دونوں اپنے اپنے کام میں ایسے مگھتے کہ انہیں ہمارے آنے کا پتہ نہ چلا۔ پھر اچانک مائی بیگیاں بولی: "ہائے مجھے تو بہت چننا لگ رہی انگی کو اب تک تو آ جانا ہی چاہیے تھا۔"

"آہائے گی۔" بابا یارو بولا: "کہاں گئی ہے؟ اپنے ملکوں کے ہاں گئی ہے نا؟ تو پھر اپنے ہی گھر گئی ہے جانتی نہیں ہو ملک کی بیشی اس کی کتنی پکی سیلی ہے؟ وہ دوپٹہ یاد ہے جو اس نے پھیلی گرمیوں میں رنگی کو دیا تھا؟ آنا بڑھیا رشم تھا کہ رنگی اسے تہ کرتی گئی اور آخوند آنا ذرا سا رہ گیا کہ تمہارے چھٹے کے چھٹے میں آگیا۔ سو روپے کا جو گایہ دوپٹہ۔ وہ اپنی اتنی سیاری سیلی کے پاس گئی ہے تو فکر کی کون سی بات ہے۔ رات بھی رہ لے تو سمجھو فرشتوں کے گھر ہاں ہے۔"

خدا بخش نے آہستہ سے کہا: "میرے خیال میں واپس چلنا چاہیے۔ ان بے چاروں نے ہمیں دیکھا تو خاطر مدارات میں لگ جائیں گے۔"

بشکو بولا: "اور پھر چائے پکانا تو مائی کو آتا ہی نہیں جو شائد گھومتی ہے۔ رنگی جوتی تو پی لیتے۔ ایسی چائے پکاتی ہے کہ فتنہ ہو جاتا ہے۔"

خدا بخش بے اختیار ہنس پڑا تو مائی اور بابا نے چونک کر دیکھا اور ان کے ہاتھ پر چھو لگے۔ وہ خدا بخش سے رکنے بیٹھنے اور چائے پینے کی یوں التجائیں کرنے لگے جیسے اگر خدا بخش نے ان کی بات مان لی تو ان کا گھر ذرا سونے چاندی کے محل میں بدل جائے گا اور ان کی بکریاں گھوڑیاں بن جائیں گی۔ خدا بخش نے انہیں سمجھایا کہ: "سو بچ ڈر نہ کو ہے اور ہم دشمنوں والے

لوگ ہیں۔ شام کے بعد تو ہماری حویلی کی فیصل پر افسوس والوں کا پہرہ ہوتا ہے۔
تم تو جانتے ہو بابا یارو! میں شام سے پہلے گھر نہ پہنچا تو بڑے ملک قیامت بچا
دیں گے، ہمارا باز لالی کا شکار کرنے آیا تھا، سوچا تمہیں دیکھنے چلیں، ٹھیک
ہونا، کوئی تکلیف تو نہیں۔ اچھا اب تم بیٹھو ہم چلے۔" رکاب میں پاؤں رکھتے
ہوئے خدا بخش بولا۔ رنگی کی فکر نہ کرو، اگر سے دیر ہو گئی تو میری بہن اسے
روک لے گی۔ ادا اب تو دیر ہو ہی چکی ہے۔"

بابا یارو بولا۔ "آج صبح اسے ایک بھاڑی کی جڑ میں اُگی ہوئی بہت سی چوئیں
میں۔ اس کی سیسہ کی چوئیں بہت پسند ہیں اس لئے رٹ لگا دی کہ وہ ملکوں کی
حویلی میں جائے گی۔ کپڑے دھوئے، کسکا کر پھینچے اور پھر دوپہر کو چوئیں کی پوٹی
باندھ کر چلی گئی۔ دیسے تو وہ سیانی ہے پر سوچتا ہوں، اگر سے راستے میں شا
پر گئی تو۔۔۔ تو دیر نہ ہے، ڈر لگتا ہے۔"

خدا بخش نے اسے تسلی دی۔ "ہماری زمینوں پہ ایک چڑیا تک کو خطرہ نہیں
تو رنگی کو کیا ڈر ہے۔ سب جانتے ہیں کہ رنگی بابا یارو کی بیٹی ہے اور سب جانتے
ہیں کہ بابا یارو کس کا آدمی ہے۔ تم فکر نہ کرو، لو ہم چلے۔"

واپسی پر خدا بخش نے بازوؤں اور شکموں کے سلسلے میں بے حساب سلوات
سے مجھے لاد ڈالا، میرے ذوق کی رعایت سے اس نے خوش حال خان خٹک
اور علامہ اقبال کے شاہینوں کا بھی ذکر کیا اور بعض پرانے سکوں، تلواروں
کے قبضوں اور لبادوں کے بٹنوں پر بازوؤں کی تصویروں کے بارے میں بتا کر
ثابت کیا کہ باز ایک شاہی پندہ ہے، آخر میں اس نے بے مسکت دلیل دی۔

”تم نے آج تک کبھی نہیں سنا ہو گا کہ کسی غریب آدمی نے باز پالا ہو۔“
 ”غریب آدمی تو لالیاں پالتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

خدا بخش میرے طنز کا کچھ جواب دینے ہی لگا تھا کہ اس نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ لیکروں کے ذخیرے کے موڑ پر ایک ایک فوجی لڑکی ہمارے ساتھ آگئی تھی۔ وہ رنگی تھی۔ نہ جانے اس کا اصل نام کیا تھا۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ رنگوں کا ایک سیکر ہے۔ سات رنگوں میں سے کوئی بھی رنگ ایسا نہ تھا جس سے اس کا وجود محروم ہو۔ اس کی آنکھوں، بالوں، چہرے اور ہاتھوں سے جو رنگ بچ رہے تھے وہ اس کی حد بند کرتے اور اُدھنی میں جذب ہو گئے تھے۔ اس وقت سورج سپاٹ میدان کے پرے کنارے پر ٹھوڑی ٹیکہ جیسے زمین کا آخری نظارہ کر رہا تھا۔ آسمان کے وسط میں بادل کے چند ٹکڑے ابھی سے گلابی ہو گئے تھے اور یہ گلاب لیکروں کے ذخیرے کے اس موڑ پر برس رہا تھا۔ اگر ایک بے رنگ جہلی میں سے نکلے ہوئے رنگی کے پاؤں کے ناخن ٹوٹے ہوتے نہ ہوتے تو اسے زمین مخلوق قرار دینے کے لئے مجھے اپنے آپ سے خاصی طویل جنگ لڑنی پڑتی مجھے ایسا لگا کہ کٹرے کٹر لحد کو بھی رنگی کی ایک جھلک دکھا کر اسے ایک ایسے خدا کا تامل کیا جاسکتا ہے جو اس انتہا کا حسن کا رہے۔

یہ سب کچھ میں نے ایک لمحے میں سوچا جس میں بس اتنا ہوا کہ خدا بخش نے گھوڑے کی لگام کھینچی۔ رنگی ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی اور بشکوہیچے سے بھاگتا ہوا آیا اور ہوات دیکھا چھوٹے ملک؟ رنگی کتنی بے وقوف ہے۔ اسی یہ بھی کوئی وقت ہے اتنے لمبے سفر کا؟ تجھے ملکانی نے روکا نہیں۔“

”پہل واپس۔“ خدا بخش نے بڑی اپنائیت سے حکم دیا؟ جو ہمارے دشمن ہیں وہ ہمارے مزارعوں کے بھی دشمن ہیں، اور ہمارے دشمن بے شمار ہیں سورج ڈوب رہا ہے، چاند کی رات بھی نہیں ہے، آسمانسا دیران راستہ ہے اور چل کھڑی ہوئی ہے اس وقت چل واپس۔ میں جا کر اپنی بہن کی خبر لیتا ہوں کہ ایب سلو کیا جاتا ہے اپنی سہیلی سے غریب سہی پر کیا انسان نہیں ہے رنگی؟ پہل رنگی؟ رنگی صرف دو لفظ بولی مگر انھوں نے بھی اس کے حُسن میں جیسے ایک جہنا کا سا پیدا کر دیا۔ بابا بے چارہ۔“

”ہم سمجھا آئے ہیں بابا کو۔“ خدا بخش فوراً بولا۔ ہم نے کہہ دیا تھا کہ اگر رنگی ہمیں گھاؤں کے پاس مل گئی تو ہم اسے واپس حویلی میں لے جائیں گے۔ ایسے وقت دیرانوں میں نہیں نکلتے نادان۔ زمانہ بڑا خراب ہے پہل۔“

رنگی ہمارے ساتھ چل پڑی۔ گھاؤں میں پہنچ کر وہ بشکو کے ساتھ حویلی کی طرف چلی گئی اور ہم چوپال پراگئے۔ رات کے کھانے کے بعد بڑے ملک صاحب نے مجھ سے باز کے شکار کا پوچھا اور پھر کافی دیر تک بازوں، شکروں، کتوں اور گھوڑوں کی باتیں کرنے لگے۔ میں نے خدا بخش سے سرگوشی کی۔ کیا تمہارے ہاں شکروں اور کتوں ہی کی باتیں ہوتی ہیں؟ انسانوں کی نہیں جوتیں۔؟

”ارے چپکے رہو۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ورنہ آبا پڑا کر سکیں بنا ڈالیں گے۔ بڑے ملک اُٹھ کر بچے گئے تو چھوٹے ملک کی گپوں کی بادی آئی۔ وہ بیشتر وقت اپنے لارنس آف تھیلیا کی تعریف کرتا رہا۔ اور ایک بار بشکو نے اگر اس سے کوئی بات کی۔ اور وہ ٹکا سٹھنے والوں کو مار دیکھیں کا موقع ملا۔ بابا بخش

کہتا ہے کہ وہ ایک صدی کا ہو رہا ہے مگر آج تک اس نے اس بلا کا باز نہیں دیکھا اور کہتا ہے چھوٹے ملک کا باز، بازوں کا شیر ہر ہے؟

جب خدا بخشن بھی تو یہی میں چلا گیا۔ اور شکو بھی میرا بستر صحرانگرا اور تپائی پر پانی کا ایک جگ رکھ کر روانہ ہو گیا تو میں اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ آسمان آنا صاف تھا کہ سیاہ ہو رہا تھا۔ تارے اتنے بے شمار تھے کہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے سر جھکا جاتا تھا۔ گلوں پر مکمل ساٹا تھا۔ رات کا آغاز تھا اس لئے کہتے تک سو گئے تھے، صرف جھینگر جاگ رہے تھے مگر جھینگروں کی آواز بھی تو سناٹے کا ایک حصہ ہی ہوتی ہے۔

تب رنگی کو پیکر میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس تناؤ اور اعتماد کے ساتھ جیسے وہ کہہ رہی ہے کہ کوئی نقص ڈھونڈ سکتے ہو تو ڈھونڈو۔ میں نے رنگی کے اس پیکر کو جسے میں نے شام کے ایک گلابی لمحے میں اپنی ذہن کے اندر محفوظ کر لیا تھا ہر زاویہ سے جانچا اور تب میں نے کہا۔ ہاں رنگی تم میں ایک نقص تو موجود ہے اور وہ نقص یہ ہے کہ تم انسان ہو اور انسان بڑی کمزور مخلوق ہے۔ جہاں کے زیریں آگن میں کیلکری چڑیوں نے دادیلا بچایا، میری آنکھ کھل۔ قریب ہی مسجد میں فجر کی نماز ادا کی جانے والی تھی اور کوئی اونچی آواز میں تکبیر پڑھ رہا تھا۔ قد قامت الصلوٰۃ، قد قامت الصلوٰۃ! صبح کے ہلکے ہلکے آواز میں مسجد کے مینار آسمان کے پس منظر میں متحرک معلوم ہو رہے تھے۔ میرا ایک مینار کے کلس پر ایک چیل اُتری اور اُسے اپنا توازن قائم رکھنے کے لئے دیر تک پڑوں کو بار بار پھیلانا پڑا۔ اس پر بھی جب تک کرنہ بیٹھ سکی تو اڑ گئی، مینار جیسے

یہ جیل کہاں سے آگئی؟ میں نے سوچا پھر میں نے خود کو جواب دیا "جہاں سے
یہ جڑیاں آئی ہیں۔"

سورج ابھی نہیں نکلا تھا۔ جب بشکو میرے لئے طائی سے اُٹا ہوا دودھ کا
ایک گلاس لایا۔ غسل خانے میں منہ پر پانی کا ایک چھینٹا مار کر میں باہر آیا تو
خدا بخش چوپال کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ چلو ذرا ذخیرے تک گھوم آئیں۔ اس
نے کہا: "وعدہ کہ آج میں تم سے انسانوں کی باتیں کروں گا۔"

"چلو۔" میں نے کہا، "پھر میں سیڑھیوں پر رک گیا۔" سنو کیا رنگی چلی گئی؟
دفعۃً خدا بخش کو اس زور کی سنس چھوٹی کہ وہ بہت بہت میرے پنگ پر
جاگرا۔ آخر کار پتھر میں بھی جھونک لگی تو۔۔۔ فبتھوں کے دوران وہ اپنی رانوں کو
پیٹ کر کستا رہا۔ "برف کی تہہ بہت موٹی تھی مگر آخر تو ٹی تو۔۔۔ پھر مجھ سے
پٹ گیا۔" پارہ مجھے تم پر ایک دم بہت سا پیار آ گیا ہے۔ میں سمجھا تھا تم اُٹو کے
اُٹو ہی ہو۔ بڑی مشکل سے سانسوں پر قابو پانے کے بعد بولا: "وہ رنگی تو نہیں کہے
جاسکتی ہے؟" "سی پیٹے گی،" پراٹھا کھائے گی، "اس کی سیلی اسے یوں آسانی سے
تھوڑی جانے دے گی۔" اماں بیمار نہ ہوتی تو رنگی کو میری بہن اپنے کمرے میں سلاتی۔
ابھی تو وہ اٹھی بھی نہ ہوگی۔" پھر ذرا سا رُک کر بولا: "جانے لگی تو تمہیں دکھائی
گے۔ بلکہ آج شام کی چائے وہیں با با یا رو کے یاں کہوں نہ میں؟"
"چوٹے ملک،" بشکو پلایا۔ اور اتنی تیزی سے بھاگتا ہوا آبا کو کیکر پرے
سب جڑیاں ایک ساتھ ڈال گئیں۔

"کیا ہے؟ اماں تو ٹھیک ہیں؟" خدا بخش نے گھبرا کر پوچھا۔

”جی وہ تو شک ہے۔۔۔ پر۔۔۔“ بشکو کی آنکھیں میٹھی میٹھی تھیں، نتھنے پھول رہے تھے اور منہ مسلسل کھلا تھا۔

”پر کیا؟۔۔۔ کچھ بگو۔ خدا بخش نے اسے ڈانسا۔

اور بشکو نے جیسے کائنات کے سب سے بڑے حادثے کی اطلاع دی کسی نے آپ کے لارنس کی گردن مروڑ کر میڈیک دی ہے۔ لارنس مریض ہے۔“ خدا بخش کو جیسے سکھ ہو گیا۔ ایک خاصے وقت کے بعد بولا: ”رنگی کو یہاں لے آؤ۔“

بشکو واپس بھاگا تو میں نے خدا بخش سے پرچھا: ”رنگی کو بلا نے کا کیا مطلب ہے؟“

”ہے ایک مطلب“ خدا بخش بولا۔

حادثہ شدید تھا اس لئے میں خاموش رہا فوراً بعد بشکو واپس آیا: ”رنگی تو منہ اندھیرے ہی چلی گئی چھوٹے ملک؟“

اور خدا بخش اپنی لہو لہان آنکھیں مجھ پر گاڑ کر بولا: ”دیکھا میں نہ کہتا تھا۔۔۔ میرے بازو کو اسی کمینے نے مارا ہے‘ رات وہ بار بار یہی کہتی تھی کہ وہ مجھے مار ڈالے گی۔ میں نے کہا‘ لایاں بازوؤں کو نہیں مار سکتیں‘ ناوان۔ اسی نے مارا ہے میرے لارنس کو‘ میں جانتا ہوں یہ قتل اسی بد ذات، کنگلی تلاش لوکی نے کیا ہے۔ میں اس کی کمال آدھیڑوں گا۔ میں اس کی.....“

”افکار کراچی“

مبارک کا آخری گلاب

”ختم بھی تو شاید شاعری کرتی تھیں؟“

آج انہوں نے چولہے کے پاس روٹی کھانے کھاتے یہ بات پوچھی۔ اور دل کی ہانڈی میرے ہاتھ سے گرنے لگے۔ یہی — میں نے روٹی کے بغیر خالی ہاتھ جلتے تو سے پڑکا دیا — اور پھر چلے ہوئے ہاتھ کو بھونکنے کے بہانے اپنی نظریں ہمکا لیں مگر وہ دم اچانک نہ جانے کدھر دوڑنے لگا میرے سامنے ایک خلی کی سطریں جیسے دھوئیں میں اُبھرنے لگیں۔

”.... ختم شاعری کرتی تھو — ایسی شاعری جو میری رُوح میں اُتر جاتی ہے۔ اور میں جھجکا کے اپنی کہانیوں کی کاپی پھینک دیتا ہوں — اتنی میں ہوئی شاعری — اتنی سرزندہ شاعری! ختم شاعری کرتی ہوں تب میں تمہیں دُنیا کی چھریں عورت سے زیادہ خوبصورت دیکھتا ہوں — آئندہ مجھے اپنی صورت کی تفصیل نہ بتانا۔ صرف یہ کہو کہ آج ختم نے کیا لکھا —؟“

ہاں میں بھی شاعری کرتی تھی؟

کسی اندھے کو یہ جتنا ناگزیر اندھا ہے، کیسی دل خراش بات ہے۔ پھر وہ مجھے بار بار شاعری کا طعنہ کیوں دیتے ہیں۔ میں تو خود اپنے اس جرم کا اقرار کر چکی ہوں۔ اور ہر بار سچ محض تو یہ کہی ہے کہ آئندہ یہ تصور کسی نہ ہو گا۔

انہنوں نے میرا گونگٹ امٹا کے سب سے پہلے یہی کہا تھا۔ ”بھئی سنا ہے تم شاعری کرتی ہو۔“ یہ بات ہمیں پسند نہیں ہے۔

میرے دل پر ایک پتھر اڑا پڑا تھا۔ مگر میں نے پھر اپنا لولہ ان دل ختام کرکھا تھا۔ اچھا میں شعر کہتا چھوڑ دوں گی۔“

پھر میں نے ان کا ہاتھ ختام کر سوجھا۔ اب میں وہی کروں گی جو تم چاہ گے۔ کیونکہ میں ماضی اور مستقبل میں بٹنے وقت لچکا نہیں چاہتی۔ میں اس شائق سے ٹوٹ کر الگ ہونا چاہتی ہوں۔ جہاں سے میرے بندھن نکل چکے ہیں آج سے میں صرف تمہاری ہوں۔ تمہاری۔ تم ہو کہیں مجھ سے ملکر اکے بات نہیں کرو گے۔ ہمیشہ شک و شبہ کی نہری لیٹکا ہوں سے مجھے دیکھو گے۔ اور میں اپنا یہ خود دار اور ضدی سر تمہارے قدموں میں جھکائے رکھوں گی۔

پھر میں نے اپنی آنسوؤں سے مہری آنکھیں کھولیں تو میں سچ محض اُن کے قدموں میں جھکی ہوئی تھی۔ اور وہ بڑے تعجب سے بڑی پریشانی سے میرے چہرے کو گھور رہے تھے۔ شاید وہ گھبرا گئے ہوں گے کہ میں پتہ نہیں کس تصور کے اعتراف میں سر جھکائے ہوئے ہوں! مردوات۔ سوچ رہے ہوں گے کہ نہ جانے کتنے گناہ آج پہلی بار بخشوانا چاہتی ہے۔

اس رات وہ شک کے دہلیز میں ڈوب ڈوب جاتے تھے۔ جیسے میں کوئی ایسا گھر ہوں جہاں پورے دن ہر چیز کا صفایا کر ڈالا ہو۔ اب وہ ان لیٹروں کے قدموں کے نشان جگہ جگہ ڈھونڈ رہے تھے۔

صبح کو انہوں نے جب خالی بوتل کی طرح مجھے ایک طرف رکھنا چاہا تو میں پھر ان کے شانے سے لگ گئی۔

”میرے محبوب — میں نے کہاں کہاں تمہارا انتظار نہ کیا۔ تمہارے لئے کیا کیا سوچا۔ لے بیٹھی تھی۔ آج میں نے اپنی جھولی کے سارے پھول تم پر نچا کر دیئے ہیں۔ اب تم میری خالی جھولی میں کوئی کھل، کوئی ستارہ کوئی سپید مہر ابول بھی نہ ڈالو گے؟ میں سوچ رہی تھی کہ کیا یہ بات ان سے کہہ دوں! مسگر انہوں نے اپنی بات شروع کر دی۔ اماں کو خوش کرنے کا گڑبہ ہے کہ دن رات ان کے ساتھ چو لھے کے پاس بیٹھی رہا کرو۔ دپٹھیں چند دن میں سب کام سکھ دیں گی۔“

”نا بھئی، میں اپنی دلہن کو شاعری دلائی نہ کرنے دوں گی۔ یہ موا ادا ہے جس گھر میں گھسا، لاکھ کا گھر خاک کیا۔“ باہر میری ساس اپنی کسی ٹیڈی کو لگاوا کر رہی تھیں۔

اپنی ساس کی اس بات پر میں جی جان سے قربان ہو چک گئی۔ ہائے کتنی اچھی بات کسی انہوں نے! سچ پچ یہ شاعری لاکھ کے گھر خاک کرتی ہے جس وقت میں نے اپنی نظلیں ایک ایک کر کے جلائی تھیں تو کیا یہ لاکھوں کی دولت نہ تھی؟ کوئی میرا ایسا سخی ہو تو لے جو اپنی کمائی گرا اپنے ہاتھوں آگ لگا دے۔

”ہمیں سبزیاں بہت پسند ہیں۔ چاول بالکل نہیں کھاتے۔“ اب وہ
 اچار — تو بھی اچھا اچار بنانا تو تمہیں سب سے پہلے سیکھنا پڑے گا۔“
 وہ پتہ نہیں کیا کیا کہے جا رہے تھے لیکن میرے سامنے تو اپنی نظموں کا
 دھواں ہی دھواں پھیلایا تھا۔ مجھے ایک آدھ جملے خط کی سطریں یاد آ رہی تھیں۔
 ”... جنہیں کشمیر پسند ہے نا؟ اس لئے ہم کشمیر کی سیر کر رہے ہیں اور تمہاری
 آنکھوں میں چھپی ہوئی پھیل ڈل میں ڈوبے جا رہے ہیں اور تمہارے کانوں سے
 کشمیری گیت سن رہے ہیں۔ تمہارے شاداب چہرے جیسے باغوں میں گھوم
 رہے ہیں اور تمہارے دل کی طرح وسیع میدانوں میں مٹر گشت کر رہے ہیں
 — مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آج ہم صرف کوئی دہائی کا نظم لکھ رہی ہوگی۔“
 میل دل —! میں نے اپنے دل پر ایک نظم بھی لکھی تھی۔ یہ دیوانہ جے جانے
 کون کون سے کنویں جھنکوائے گا۔ یہ دل جو اٹنی مانتے نہ سیدھی سون نکلتے
 قورات کے غم میں روئے۔ رات ہو تو دن کی محبتائی میں تر پے۔

اپنی اس نظم کو پڑھ کر میں خود ہی رو پڑی تھی۔ جانے کیسے سترن دیوانی تھی
 میں کہ اپنی نظموں سے خود ہی پیار کرتی — ہنستی تھی اور روتی بھی۔ یہ نظمیں میری
 راز دار تھیں جو بات دل میں آتی وہ خود خود کاغذ پر پھیل جاتی تھی۔ اب میں کیسے
 کیسے جتن کرتی۔ کاغذ کے ان پرزوں کو چھپانے کے بجائوں کے نام پر صندوقوں
 کی تتوں میں گودس کی کتابوں میں بچو بھی خود چڑیل دیکھ ہی لیتی تھی پڑھتی جاتی
 اور روتی جاتی کیسی عجیب سی بات تھی کہ ہم دونوں بہنوں کا ذکر ایک خطا۔ معمولی
 سی صورت شکل گھر پر چھائی ہوئی منظر اور نظر سے ٹھکرائے جانے کا ذکر۔ اب کا

سیاہ رنگ اور آس کا بے ڈھنگا نقشہ ہم دونوں بہنوں میں تقسیم ہوا تھا۔ بہت دنوں کی بات ہے جب میں شاید ساتویں یا آٹھویں کلاس میں ٹیبل ہوا کرتی تھی، ایک دن اپنے ٹیوشن میں ہم ایک دلہن دیکھنے گئے۔ ہائے کیسی خوبصورت دلہن تھی پہنچ چاند کا ٹکڑا۔

”دیکھا بھیا، ایسی ہوتی ہیں دلہنیں۔ گوری گوری۔“ نمونے رنگ بڑی نظروں سے دیکھا اور پھر اس لمبے میں بولی: ”بھیا اب اپنا سیاہ تو نہیں ہو گا۔ کیونکہ سب دو لہا گوری دلہن چاہتے ہیں؟“

”چپ بے شرم۔“ میں نے اسے دھکا دے کر کھانگروں میں نمونے کی بات نے چاقو چھو کر چھوڑ دیا۔ واقعی میں نے بھی کالی دلہن کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اور پھر میں نے بڑے ڈکھ کے ساتھ سوچا تھا کہ میرا وہ لہا کبھی نہیں آئے گا۔ مجھے کوئی بچہ اسی کہہ کر نہیں پکارے گا۔

بس اسی رات میری شاعری کا آغاز ہوا تھا۔ میں نے پہلی نظم لکھی تھی۔ ایک ایسی لڑکی پر جسے اللہ مہیاں ہر چیز دینا معمول گئے تھے۔ دولت، صورت، محبت، بے فکری — کوئی نعمت اسے نہیں ملی تھی۔

اور پھر تو یہ شاعری کا دو گ جیسے میری جان کو لگ گیا تھا۔ ادھر راتوں ہمارے بڑھتے ہوئے قد کو دیکھ کر ابا کو کھائے ڈالتی تھیں کہ ان لڑکیوں کے لئے کچھ تو جمع کرو۔ مگر کی اس بے سرو سامانی کو دیکھ کر میرا دل ڈوبا جاتا تھا کہ جہاں کوئی گریا لینے آئے گا؟

انہیں دنوں ایک بار میں زہرہ خاں کے ساتھ ان کے کالج کے ایک

فلکشن میں گئی تھی۔ رہاں کوئی نایاب جوانہ نکلا۔ صرف ایک کالی، موٹی ہتھیلی چاری کی صورت عورت آئی تھی اپنی کہانی سنانے، مگر اللہ جانے اس میں کیا بات تھی کہ خلقت خدا کی اسے دیکھنے کو ڈیڑھ پڑتی تھی۔ کالج کی لڑکیاں اس کے آؤ گراف لینے کو مری جا رہی تھیں۔ اور وہ تھی کہ خوشی کے مارے کھلی جا رہی تھی۔ ایک ایک سے ٹھیک ٹھیک کر رہی تھی۔ جب میں نے ایک لڑکی سے پوچھا کہ یہ کون ہیں تو سب کو میری جہالت پر ہڑا ترس آیا۔ اے ہے جاہل بے چاری چاندی کو نہیں پہچانتی۔ اتنی مشہور افسانہ نگار کو؟

اس دن میں گھر لوٹی ہوں تو چاند سورج میرے ساتھ ساتھ آئے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ میں بھی چاندنی بنوں گی۔ لوگوں کی حقارت بھری نظروں کو لات مار کے شہرت کے آسمان پر جا بیٹھوں گی۔ دیکھیں تو پھر دنیا مجھ سے کیسے منہ پھیرے گی؟

رات ہوئی تو میں نے نو کو چاندنی کا قصہ سنایا۔ اسے بھی کسی طرح یقین نہ آیا کہ ایسی بد صورت عورت کی اتنی عزت ہو سکتی ہے۔ دوسرے دن ہم دونوں برقعوں میں کتابیں دبا کر اسکول کی طرف دوڑ رہے تھے۔

پھر دوڑتے ہی چلے گئے۔ اتنے تیز کہ نہ تو مجھے چھوڑ کر آگے بھاگ گئی۔ اس نے ایم۔ اے کیا اور ایک کالج میں لیکچرار ہو گئی۔

لیکن میں شاعری کے کائناتوں میں الجھ کر صرف بی۔ اے کر سکی۔ بقول اماں کے شاعری نے مجھے بہادر کر ڈالا تھا۔ کورس کی کتابوں کو بھول کر

بھی نہ دیکھتی۔ سارے دن انگلیش کی دوسری آلا بکنا بیٹھ جاتی۔ ان کتابوں کو پڑھ کر میرا دلخیز اور بھی خراب ہو رہا تھا۔ رات بھر شل شل کر نطیس نکلتی جاتیں اور دن بھر بنگ پر اندھی لٹی ایڈیٹروں کے تعریفی خطوط پڑھتے جاتی تھیں۔ اماں کہتی تھیں کہ میری صورت پر ٹھیکرے برسے لگے ہیں۔ سسر پر کا ہوش نہیں رہا۔ یہ شہرت جانے کب اور کہاں سے نکل کر میرے ساتھ چلنے لگی تھی جس چوکی تو ہر سالے کا ایڈیٹر کہہ رہا تھا کہ آپ کی نظم نہیں آئے گی تو ہمارا سالہ مکمل نہ ہو گا۔

ڈاکٹر آنا تھا تو اپنے جھولے کے آدھے خط ہماری کمرچی میں پھینک جاتا تھا۔ پھر اماں بڑی کاہلی سے اُٹھتیں اور سوپ میں خط بٹور کے میرے ہانگ پر اٹھیل تھیں۔ ”لو بٹو، تمہاری ڈاک آگئی۔ بیکار خط سوپ میں ڈال دیا جائے چو لسا جلاتا ہے۔“

تب مجھے خیال آتا کہ موت کی کمائی سے ہنڈیا چولے پر رکھی جاتی ہے اور میری کمائی سے چولہا سلگتا ہے۔

آبا ہمارے دو لہا کا انتظار کرتے کرتے قبر میں جا سوتے تھے۔ اماں بھی ہمارے بوجھ سے تھکی جا رہی تھیں۔ انہیں دل دھڑکنے کی بیماری ہو گئی تھی۔ اب گھر کی کیسوں پر تھوٹتی۔ اور موت کی آنکھوں میں کیسی چمک تھی! اس کی چال میں کتنی خود اعتمادی تھی! اس کے سیاہ رنگ میں سُرفی جھلکتی اور وہ ہر وقت چننے جاتی تھی۔ بعض اوقات میں جھجھلا کے سوچتی کہ کون سا فارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے اس لڑکی کو؟

پھر اناں نے ایک دن سچ پچ نمٹو کے ہاتھ تاروں کا خزانہ لگ جانے کی خوشخبری سنائی۔ اس کا پیغام آیا تھا۔ لڑکا نمٹو کے کالج میں لیکچرار تھا اور نمٹو کو بہت چاہتا تھا۔ یہ سن کر میں بھی بہت ہنسی — میری پیاری بہن آخر تجھے اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی نا! آج مجھے بھی تاروں کا خزانہ مل گیا تھا۔ مگر اناں ہمیشہ کی بے رحم میرے قصصوں کو روک کر سنا نا شروع کر دیا۔ ”نموشادی سے انکار کر رہی ہے۔ کہتی ہے میں ختم دو دنوں کو کس مسارے چھوڑوں!“

شام کو نمٹو کالج سے آئی تو کہنے لگی: ”بھیا، آپ کا چنگ کتنا جھلکا ہر گیا ہے ذرا اٹھیے میں نواؤ کس دوں؟“

میں نے خود کیا — نمٹو ٹھیک کہتی ہے۔ میں نے لیٹے لیٹے اس گھر کے چنگ توڑ ڈالے ہیں — پھر میں نے اناں سے کہا۔

”اس لیکچرار کا پیغام نہیں رو کیا جائے گا۔ نمٹو کوئی خدا ہے کہ ہمیں پالے گی! میں کسی اسکول میں ملازمت کروں گی۔ اس پر نمٹو بہت روئی چلائی۔ وہ کہتی تھی: ”بھیا آپ نوکری نہیں کر سکتیں۔ آپ کی شاعری کا موڈ آف ہو جائے گا اور آپ شاعری نہ کریں گی تو مجھے بڑا دکھ ہوگا۔ لوگ کیا کہیں گے....؟“

لوگ — لوگ — ! ان لوگوں کے لئے ہم نے کیا کیا نہ کیا۔ پھر بھی ہم ان کے خون سے مرے جاتے تھے۔ یہ لوگوں کا خون ہی تو تھا جو اتنی شہرت نے مجھے پاگل نہ ہونے دیا۔ مالا لگ مجھے ہرکانے والوں کی کمی نہ تھی۔ اپنے پس میں تو ایک عورت کا نام ہی لکھنے والے مرزدوں کو دیوانی بنا دیتا ہے اور اگر اس نام کے آس پاس شہرت کی چمک دکھ ہو تو ہزاروں دیوانے مر جھٹنے کا

تہیہ کر ڈالے تھیں۔ اب مجھے اپنی ڈاک دیکھ کر پانڈی یاد آتی تھیں۔ اب انہوں نے لکھنا چھوڑ دیا تھا، اور تیسرے شوہر سے بھی طلاق لے کر سنا ہے، پنجاب کے کسی گاؤں میں گناہی کی زندگی گزار رہی تھیں۔

میرے آگے بھی دنیا بہت بڑی تھی۔ اور بھی پھیل جاتی اگر کل ہر طرف سے میلا راستہ نہ بند کر دیتا۔

اُن دنوں میں بڑی میاکی اور افتاد کے ساتھ دوسرے شہروں کے مشاعروں میں جاتی تھی، نشے میں چور ایک دوسرے کو گالیاں دیتے ہوئے شاعروں کے ساتھ راتوں کو مشروکوں پر چلتے وقت مجھے ذرا ڈر نہیں لگتا تھا۔ کہو کہ ہر جگہ دو جھکی جھکی لٹکاؤں میں میری نگرانی کرتی تھیں۔ ہر وقت ایک سایہ میرے پیچھے پیچھے چلتا تھا جیسے میں کسی کی بناء میں ہوں۔ میرے راستے کے سوائے خنجر کوئی آگے سے بٹانا جاتا تھا۔ میرے یوں آزاد گھومنے پر اماں کو سخت اعتراض تھا۔ تو بھی اظہارِ ناپسندیدگی کے طور پر دروازہ کھولنے کے بعد یہ جتنا نہ بھولتی کہ اب رات کے دو بجے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے میری فطرتوں پر بات کرنا چھوڑ دی۔ میری ڈاک سے اسے کوئی دلچسپی نہ رہی۔ جن رسالوں میں میری فطیں پھپھکتی تھیں انہیں اپنی میز سے اٹھا کر میرے پلنگ پر ڈال دیتی تھی، البتہ اس کا خلوص کچھ اور بڑھ گیا تھا۔

”بجیا، آج آپ کے لئے ایک ہینڈ لوم ساڑھی لائی ہوں۔“

”بجیا کے لئے ایک گھڑی خریدنا ہے۔“

کھانے کے وقت بھی وہ خوب شور مچاتی۔

”بھیا انا دماغی کام کرتی ہیں، آپ انہیں روزِ گوشت کا سبب پچھے میرے لئے دال کافی ہے۔“

”تب میں سوچتی، نمونہ کیسی ڈپلومیٹ ہے، وہ کتنی کمری کمری ٹٹ کر فیسے در خواست کر رہی ہے کہ میں اس گھر سے چلی جاؤں۔“

میں اپنی شاعری کے پتکے لگائے آسمانوں پر ہواؤں کی رہی۔ اور نمونے کتنی مضبوطی کے ساتھ اپنے قدم دھرتی پر جاملے تھے۔ ہم دونوں نے ساتھ ساتھ دوڑنا شروع کیا تھا۔ مگر میں کتنی غلط راہ پر چلی پڑی۔ کانٹوں اور بٹخروں نے میرے سارے ارادے لہو لہان کر دیئے تھے۔

بعض وقت نمونہ، ہنس کر کہتی ”بھیا، آپ بغیر سوچے سمجھے جانے کیسے ہر کام شروع کر دیتی ہیں۔“

نمونہ کی یہ بات میرے دل میں اُتر جاتی۔ واقعی میں جانے کیسے ہر بات سوچے سمجھے بغیر کر بیٹھتی ہوں۔ اب اس بات کو لے لو۔

کسی طرح یاد نہیں آتا کہ کھل سے میں نے اپنا جلتا کب اور کہاں شروع کیا تھا۔ حالانکہ وہ ہندی کا بہت مشہور افسانہ نگار تھا اور ہندی والوں سے ہم اردو کے شاعروں کی ویسے بھی کب بنتی ہے؟ پھر کھل تو یوں بھی بھلا کا جھگڑا لیا تھا، ویسے اور کوئی خوبی بھی نہ تھی اس میں — پانچ بچوں کا باپ، بیمار اور چڑچڑی بیوی کا تابانہ وار خوبہر۔ سوکھا چرخ — کسی اخبار کے آفس میں ہزار ڈیڑھ ہزار کا ملازم تھا۔ مگر جانے یہ کیسے ہونے لگا کہ میں جس مشاعرے سے واپس آتی وہ میرے ساتھ ہوتا۔ مڑک پر چلتے چلتے مجھے جب بھی اس کا

خیال آتا وہ میرے سامنے کھڑا ہوتا۔ میں ڈالس پر جاتی تو وہ سب کے سامنے بیٹھا مجھے دیکھ جاتا تھا۔۔۔ میں اُن کے نیچے آتی تو وہ آگے بڑھتا۔

آؤ، آؤ تو آپ نے ہمیں ہلا ڈالا۔ ذرا اپنے گلے کی رفتار روکئے پھر مارو۔ اس شر کے سارے شاعر اپنا منہ کالا کر کے فرار ہو جائیں گے۔“

پھر اس نے مجھے ایک خط لکھا۔ بہت ہی صمد سا۔ یہی کہ میری نظموں نے اسے بہت متاثر کیا ہے۔

یہ خط مجھے بڑا بے ضرر لگا۔ اس کی کچھ طلب کرتی ہوئی چاروں طرف راستہ گھیرتی ہوئی آنکھوں سے زیادہ سکون بخش۔

دیے بھی مجھے اطمینان دیتا تھا کہ کہیں کوئی ایسا آدمی میری طرف نہیں بڑھ سکے گا۔ جس نے مجھے قریب سے دیکھا ہو جو میری فضول سی صورت بے ڈھنگی اور سطحی قسم کی باتوں سے واقف ہو۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مناسی ادبی حلقوں میں کہیں میری بہت افزائی نہیں ہوئی۔

کمل کے خط پڑھتے گئے چند دن بعد تو یہ نامکن سا ہو گیا کہ اس کا روز ایک خط نہ آجائے۔ مجھے اپنی ہر نظم اسی طرح یاد ہے کہ کمل نے اس کے بارے میں کیا لکھا تھا۔ وہ جہاں ہوتا۔ جس سوڈ میں ہوتا مجھے روز ایک خط لکھتا تھا۔ سچا ہے آئس کے کسی کام سے کشمیر جائے بچے کے ساتھ ہسپتال میں جو بیوی کے میکے میں ہو یا کسی ادبی محفل میں۔ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ خط لکھ جاتا تھا۔ کوئی شہنا تو کہیں یقین نہ کرتا کہ میں نے ان محبت اور شہنشاہی سے سب پریشوں کا ایک بار بھی جواب نہیں دیا۔ ہم دونوں میں ایک خاموشی سا سمجھوتہ ہو چکا

تھا کہ وہ بوجی میں آئے مجھے لکھے جانے لگا۔ اور میں صرف سنا کروں گی۔
 مگر وہ کب تک محتاط بنا رہتا! اس نے پہلے اپنے خلیص کو حقیقت میں بدلا
 پھر محبت میں اور پھر لاکھ پن میں اور جتنے اس کے خطا بڑھتے گئے اتنا ہی وہ
 خود بہت کم ملتا تھا۔ ایک شہر میں رہتے ہوئے بھی کہیں کہیں نظر بھی آجاتا تو بڑا
 اجنبی بن کر بڑے تکلف کے ساتھ بات کرتا۔
 ایک دن آخر کل مل ہی گیا۔

ایک بہت بڑا آل انڈیا مشاعرہ تھا۔ ہندی والے بھی اس کے لئے مالی مدد
 کر رہے تھے۔ مشاعرہ شروع ہونے میں کچھ ہی دیر تھی۔ لوگ باہر گہری میں کھڑے
 باتیں کر رہے تھے۔ کل کو اکیلا دیکھ کر میں اس کے پاس چلی گئی۔ اسے ساتھ لئے
 جان بوجھ کر اس طرف بڑھنے لگی۔ جہاں کوئی نہیں تھا، جہاں درختوں کی آڑ میں
 اندھیرا سا کر دیا تھا۔

”مجھے بتاؤ، کل میں نے آج تک تمہارے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔ پھر
 تم مجھ سے اس کی شکایت کیوں نہیں کرتے؟“

”کیونکہ مجھے تمہارے جواب کا انتظار نہیں ہے۔“ اس نے سفید سفید کر کے
 اس وقت ہمارے آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو شبہ بھی نہ ہوا جو گا کہ اس
 وقت ہم دونوں کیسے بھنور میں گھرے چکولے کھا رہے ہیں۔

”تم — تم اتنے اُدھے اور رش رکھتی ہو۔ اتنی جہاں کلا کار ہو، اور پھر تم ابھی
 صرف بیس برس کی ہو۔ تمہارے لئے دنیا بھر پھیلائے کھڑی ہے۔ عزت، دولت
 شہرت ہر چیز تمہاری منتظر ہے۔ میں تمہاری راہ کیوں کھوٹی کروں۔ میں تو ایک غریب

آدمی ہوں۔ بیوی بچوں والا۔ چالیس برس کا بوڑھا۔ اب میرے جیون کا صرف ایک ہی مصروف ہے کہ اپنی ہر ذمہ داری کو پورا کرتا رہوں مگر۔۔۔ مگر پھر بھی میں تمہارا مضمون ہوں کہ تم نے میری کسی بات کا ثبوت نہ دیا۔ مجھے اپنی تنہائی کے صحرا میں کیا گلاب دکھانے کی اجازت دے دی۔ میں نے تمہاری بدولت بیان دیا کہ کسی کے لئے اپنی ذات کو بھلا دینے کا شکہ کیسا ہوتا ہے۔۔۔۔۔“

وہ جانے کیا کیا کہے جا رہا تھا۔ مگر مجھ سے تو اس نے ایک لمحہ میں ہر کچھ چھین لیا تھا۔ اس خود غرض انسان نے جو میری سہارا کی ساری ادھ کھلی کھیاں اُجاڑ کر اپنے من میں گلاب دکھا رہا تھا۔

اگر اس وقت میرے قریب، ایک لگائی بجھائی کرنے والا چھل خود شاعر نہ کھڑا ہوتا تو شاید میں کل کی باتوں میں جا گرتی۔ شاید زور زور سے رونے لگتی۔ نہ تو کتنی غمی، ”بھیا، آپ ہر بات سوچے سمجھے بغیر کیسے کر ڈالتی ہیں؟“ مگر اس روز میں کتنی مصیحت پسند غمی! اگر اس دن میں ان باتوں پر غور نہ کرتی تو شاید وہ دن کبھی نہ آتا جب مجھے کل کے ہر خط کے ساتھ اپنی ایک نظم جلاتا پڑی تھی۔ اور جب سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا تھا تب میں نے سوچا کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو اس راکھ کا انقباب کل کے نام کرتی۔

لیکن میں کچھ بھی نہ کر سکی تھی۔ بلکہ صد شاعرہ کو آتے دیکھ کر میں نے جی سنجیدگی کے ساتھ انہیں سلام کیا تھا۔

”اب کیسے ہیں آپ!“ یہ بات میں نے پاس سے گزرتے ہوئے کسی شاہ سے کہی تھی بالکل سے! خون میرے کانوں میں سنسنار رہا تھا۔ اور میں گرنے سے

پہلے کسی سہارے کو تھامنا سہا جتنی تھی، پہلو۔ ختم اب گھر واپس چلی جاؤ۔ اپنے گھر جاؤ۔ کل مجھے تنہا کر کر رہا تھا۔ نہیں گھر میں بھی جگہ نہیں رہی۔ کہیں بھی جگہ نہیں ہے۔ پھر کل مجھے رکشائیں بٹھا کر گھر لایا۔

جب مجھے جوش آیا تو اتاں مجھے موسمی کارس پلا رہی تھیں کھل سا سننے مگر سی پر بیٹھا تھا اور تمناؤں سے کہہ رہی تھی: ”آپ ٹھیک کہتے ہیں کل بھائی بیٹا تو بھیا کے بھی کہی ہیں۔ مگر بھیا بیاہ کے لئے راضی ہی نہیں ہوتیں۔ اشد بھانے کس کا انتظار کر رہی ہیں۔“

”ایک لڑکا تو سیکریٹری ایٹ میں تین سو کا نوکر ہے۔“ اتاں نے فوراً تفصیل شروع کر دی۔

”وہ خود ہی شاعر ہے، مٹا ہے مولانا، بھلے بلگرامی کا شاگرد ہے، چائے، سگریٹ، شراب کچھ نہیں پیتا۔ پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہے۔“

”مگر بھیا۔۔۔ بھیا کا موڈ۔۔۔ بھیا کی پسند۔۔۔ تم میری طرف دیکھو دیکھو کر گھورتی جا رہی تھی۔“

”بس بس بہت ہو چکا تمہاری بھیا کا لاڈ۔“ اتاں نے غصے میں نگوں کی بات کاٹی۔ ”جائے کیوں اشد میاں نے اس کا داغ ہی اوندھا کر دیا ہے جب ہی تو ایسی حالت ہو گئی۔ اب میں کچھ نہ سوچوں گی۔ کھل صاحب، آپ اپنی عورتوں کا ساتھ ساتھ ساتھ بیاہ کر دیجئے، بتائیے بھلا میں کسی مرد کے بغیر ان دونوں کے فرض سے کیسے سبکدوش ہوں گی؟“

”وہ تو ٹھیک ہے، میں سب کچھ کروں گا۔ آئندہ آپ کو میرا فرض یاد دلاؤ“

کی مزدورت نہیں پڑے گی۔ اماں! کسل جان بوجھ کو میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔
 مگر ان کا جیون ساختی کوئی آرٹسٹ ہونا چاہئے۔ بڑے لطیف ذوق والا،
 بڑے حوصلے والا۔ جو انہیں مستحبا لے رہے۔ ان کی شاعری کی رفتار مدھم مدھم
 پڑ جائے، ورنہ عام لکھنے والیوں کی طرح کہیں گھر داری میں گھر کے.....
 کہیں... کہیں....“

”بس بس رہنے دیجئے۔“ میں نے جھجلا کے کہا: ”شراب سگریٹ چائے
 کچھ نہیں پیتا۔ تین سو روپے کماتا ہے، اور کیا سہا ہے مجھے۔ اماں تم تم کو کے
 بیاہ کی تیاری کرو۔ اب تاریخ مقرر کرو۔“

پھر میں نے سوچا کہ جانے میرے لئے اس پیغام کو ڈھونڈنے کے لئے
 تمہو نے کتنی جدوجہد کی ہوگی۔ میں کب تک اس گھر میں بیٹھی رہوں گی۔ کوئی
 ٹھیکہ لے رکھا ہے، تمہو نے میرا؟ تم کو کو کتنا ارمان ہے دلہن بننے کا، ہم دونوں
 بہنوں کو بٹھایا گیا تو اچانک تمہیں پڑی۔ اس نے اپنا گھر نکلت ہٹا کے
 مجھے دیکھا اور آہستہ سے بولی بچیا آج مجھے بڑی ہنسی آرہی ہے؟
 ”تو ہنسنا۔“

”مگر آپ۔۔۔ آپ۔۔۔؟“ وہ میرے چہرے پر جانے کیا دیکھ کر گھبرا گئی؟
 ”ہاں مجھے بھی ہنسی آرہی ہے تمہو۔ آج تو جی چاہتا ہے۔ دنیا کی ہر
 بات پر ہنسون، ہر چیز کا مذاق اڑاؤں؟“

”..... تم جب دلہن بنوگی، میں اس وقت بہت دُور بیٹھا تمہیں دیکھ رہا
 ہوں گا۔ جانے تمہارا دل لہا اس خوبصورتی کو دیکھنے کی تاب کہاں سے لائے گا!

آج تمہارے چہرے پر کتنے نوحہ و صورتِ خوابوں کا اُجالا ہو گا؟

”اس صبح جب تم ادبِ شاعری اور میری بکواس سے پرے — کسی پرے

اپنا تن من بچھا کر رہی ہو گی تو تمہیں کس یاد آئے گا کہ کوئی تمہیں اپنی روح کی گہرائیوں کے ساتھ مبارک یاد دے رہا ہے۔

”آج تمہارے شکم کا گلاب تمہارے دلہا کے چہرے پر کھلنے والا ہے۔“

”اب میں تمہیں کبھی خط نہ لکھوں گا۔ بس ہر نئی نظم میں

تمہاری کامرائیوں کی خبریں سن لیا کروں گا۔“

جلتی ہوئی روٹی کو جلدی سے راکھ میں چھپا کر میں سوچتی ہوں کہ میں نے اپنی کامرائیوں کی کوئی خبر کس کی زبانی۔

یہ کیسی اچھی بات ہے کہ میری بہار کا آخری گلاب ابھی تک نہیں مڑھایا۔

کہیں میرا ایک خوب صورت سا، ہنستے گلاب جیسا خیال زندہ ہے کس میں

چھپا ہوا۔

”بانو“ مرلی

وہ جو دیوار کو نہ چاٹ سکے

پھر یہی ہوا کہ باجوج باجوج رات بھر دیوار کو چاٹا کرتے۔ یہاں تک کہ دیوار تحلیل ہوتے ہوتے انڈے کے چھلکے کی مانند ہو گئی اور پھر باجوج باجوج ٹھک گئے اور انہیں نیند آنے لگی اور وہ یہ کہہ کر سو گئے کہ باقی دیوار صبح کو چائیں گے۔ مگر جب وہ صبح کو اٹھے تو دیوار بھراؤنی اور موٹی ہو گئی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ پھر اپنی کوتاہی پر پھپھکتے۔ اور انہوں نے پھر عزم باندھا کہ آج تو ہم دیوار چاٹ کر ہی دم لیں گے۔ سو جب شام ہوئی تو پھر وہ اپنی لمبی لمبی زبانیں نکال کر دیوار کو چاٹنے لگے۔ چاٹتے رہے چاٹتے رہے۔ یہاں تک کہ رات کا کجرا پھیلنے لگا اور دیوار انڈے کے چھلکے کی مثال رہ گئی مگر باجوج باجوج اب ٹھک کر چور ہو گئے تھے اور زبان ایسے ٹھنڈے لگی تھی اور پوٹے نیند سے بوجھل ہو رہے تھے۔ انہوں نے آپس میں کہا کہ سید سکندری کو ہم نے واقعی چاٹ لیا ہے۔ دم کے لئے سو لیں۔ پھر تازہ دم ہو جائیں گے اور دوزبانیں پھر کراس کا ستر لٹا کر دیں گے۔ سو باجوج نے ایک کون ٹیپے بکھایا اور دوسرا کان ماڑا کر سو گیا۔ باجوج نے

بھی اپنا ایک کان نیچے بچھا یا اور دوسرا کان اوڑھ کر سو گیا۔

یا جوج یا جوج صبح کو سوکھٹے تو انھوں نے دیکھا کہ دیوار تو پیر پہاڑی مثل ان کے سروں پر کھڑی ہے۔ یہ دیکھ کر وہ ایسے ڈھے گئے جیسے برسات میں کچی دیوار ٹھے جاتی ہے۔ یا جوج نے بہت دُکھ کے ساتھ یا جوج سے کہا کہ ”اے یا جوج! کیا ہمارے عمل کا کوئی حاصل نہیں ہے؟“

یا جوج ڈھکی آواز میں بولا کہ ”شاید ہماری تقدیر ہی یہ ہے کہ روز رات کو دیوار پانچا کریں اور روز صبح کو دیوار کو وگراں کی طرح ہمارے سروں پر کھڑی ہو جائے۔“ اس پر یا جوج مایوس ہو کر بولا کہ ”اگر میں بات ہے تو دیوار کو ہم چٹا کئے تو کیا اور نہ چٹا کیا تو کیا میں قبل اس کے کہ وقت ہمیں چاٹ لے سہیں چاہیے کہ دیوار کی طرف پشت کریں اور متھوڑا زندگی کو چھکیں۔“

تب قوم یا جوج یا جوج کا وہ بوڑھا جواب اپنی عمر کے ہزاروں سال میں تھا۔ پہاڑ کی کھوہ سے نکل کر باہر آیا اور بولا کہ ”اے یا جوج یا جوج ہر شے کے ایک معنی ہیں اور ہر عمل کا ایک حاصل ہے۔ کوئی دیوار ایسی نہیں کہ سدا کھڑی رہے۔ ڈھینا دیوار کا اور چٹا زبان کا مفرد ہے۔ اور میں نے تمہارے باپ یافت سے اور تمہارے باپ یافت نے اپنے باپ نوٹ سے یہ سنا ہے کہ اولاد ان کی مذہب سبکدہار کو ایسے چاٹ لے گی جیسے دن رات کو چاٹ لیتا ہے۔ پھر وہ آزاد ہو کر کھلے میدانوں اور ساداب سبزہ زاروں میں پھیل جائے گی اور وہ زبانیں جو پتھر جاتی تھیں۔ خیر چشموں تک پہنچیں گی۔ پہلے قوم یا جوج یا جوج کا اگلا گروہ طبرستان کے ٹھنڈے پیٹھے چشے تک پہنچے گا اور وہ اتنا پیاسا ہو گا کہ چشے کا سارا پانی

پی جائے گا۔ جسدِ بیکلا گروہِ دہاں پہنچے گا تو خشک چشے کو دیکھ کر کہے گا کہ شاید یہاں آگے کبھی پانی تھا۔

بوڑھا تو واپس پہاڑ کی کھود میں چلا گیا مگر اس کی بات ماجوج کے بیٹے نے سن لی تھی اور اس نے اپنے پہاڑ میں جا کر آلِ ماجوج کو جمع کیا اور سوال ڈالا کہ اُسے آلِ ماجوج، کیا تم سب سکندری کے ٹوٹ جانے پر بھی پیچھے رہ جانے والوں میں رہو گے؟

آلِ ماجوج نے پوچھا کہ تو نے کیا دیکھا جو ایسا سوال زبان پر لایا؟ ماجوج کا بیٹا بولا کہ کیا تم نہیں دیکھتے کہ آلِ ماجوج نے سرسبز پہاڑ پر قبضہ کر رکھا ہے اور ہمارے حصے میں بخر پہاڑ آیا ہے۔ وہ پیٹ بھر کر تل کھاتے ہیں جبکہ ہم بخر چاٹ کر پیٹ پالتے ہیں۔ اب جبکہ سب سکندری ٹوٹنے کو ہے تو میں نے قوم کے بزرگ سے یہ سنا ہے کہ جو گروہ اس قیدی سکندری سے پہلے نکلے گا۔ وہ طبرستان کے شیریں چشے پر پہلے پہنچے گا اور سیراب ہو گا۔ جو گروہ بعد میں نکلے گا وہ چشے پر بعد میں پہنچے گا اور اسے خشک پائے گا تو اُسے ماجوج کے محروم بنو گیا تم اس قید سے رہائی کے بعد بھی پیچھے رہ جانے والوں میں رہو گے؟

یہ کلام سن کر آلِ ماجوج نے تاؤ کھایا اور بیخ کر کہا کہ اپنے باپ ماجوج کی اس لمبی زبان کے دم سے بوسہ سکندری کو پاٹ کر پوست بیضا بنا دیتی ہے ہم پیچھے رہ جانے والوں میں نہیں رہیں گے اور تشنہ لبوں میں شمار نہیں ہوں گے۔ اور سر آلِ ماجوج کو بھی یہ خبر مل چکی تھی کہ سب سکندری اب ڈھینے والی ہے۔ اور آلِ ماجوج سب سے پہلے نکل کر طبرستان کے چشے سے سیراب ہونے کے

نے گمراہ رہی ہے۔ آل یا جوج نے یہ سُن کر غصہ کیا کہ ماجوج کی آل نے ابھی سے چشموں پر قبضہ کرنے اور سبزہ زاروں پر چھا جانے کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے ہیں۔ اُنہوں نے غصہ کیا اور اعلان کیا کہ ہم ان میں سے نہیں ہوں گے جو پیچھے رہ جاتے ہیں اور سوکھے چشمے سے کنکر چنتے ہیں سو ابھی رات باقی تھی وہ اپنے پہاڑ سے نکلے اور دیوار کی سمت چلے۔ مگر ادھر ماجوج کے بیٹے بڑے بھی اپنے پہاڑ سے نکل پڑے تھے اور آل یا جوج سے پہلے دیوار مسجد پہنچ جانا چاہتے تھے۔

رات کے اندھیرے میں یا جوج کے بیٹوں نے ماجوج کے بیٹوں کا راستہ کاٹا۔ اور ماجوج کے بیٹوں نے لپک کر یا جوج کے بیٹوں کو بالیاقب یا جوج کے بیٹے ماجوج کے بیٹوں سے اُلجے اور ماجوج کے بیٹوں نے یا جوج کے بیٹوں کو لٹکا رہا۔ وہ آپس میں لڑتے مارتے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی اور اُنہوں نے دیکھا کہ ماجوج ماجوج سوئے پڑے ہیں اور سد سکندری بھراؤچی اور موئی ہو گئی ہے۔ یہ دیکھ کر اُنہوں نے اپنی راہ لی اور واپس اپنے پہاڑوں میں چلے گئے۔

جب پہاڑ ساون کٹ گیا اور رات نے ڈیرہ کیا، تب یا جوج ماجوج نے پھر اپنی زبانیں تیز کیں اور دیوار چاشنی شروع کر دی اور ابھی رات باقی تھی کہ دیوار کے ڈھلوانے کی امید لے کر در شیریں چشمے سے سیرابی کا تصور باندھ کر آل یا جوج اپنے پہاڑ سے نکلے اور آل ماجوج اپنے پہاڑ سے ہماؤ ہوئی۔ اُنہوں نے پہلو باندھ کر کادستہ کاٹا اور پھر آپس میں دست دگر بیاں ہوئے۔

یا جوج ماجوج کے بیٹے رات بھر آپس میں لڑاؤ رکھے اور غم غم ہو گئے۔

جب تڑکا ہوا تو انہوں نے یہ دیکھا کہ یاجوج ماجوج سو گئے ہیں اور دیوار پھر میاڈ کی طرح بلند اور سنگین ہو گئی ہے۔ یہ دیکھ کر وہ بیزار ہوئے انہوں نے اپنا اپنا رستہ پکڑا اور واپس اپنے اپنے پہاڑوں کو پہنچے۔

دن پھر کسی نہ کسی طور گت گیا اور رات پھر آگئی مگر آج آل یاجوج یہ تہیہ کر کے نکلی تھی کہ روزِ روز کا خرخشہ ختم کر د اور رستے کا لانا نکال بیسیگی۔ تو انہوں نے بنے بخری میں آل ماجوج کو جالیا اور ان کے پہاڑ سے نکلنے سے پہلے ان پر پلہ بول دیا۔ انہوں نے ان کے گھروں کو لوٹا، جوانوں کو قتل کیا اور عورتوں کو بے عزت کیا۔ یہ قیامت دیکھ کر ماجوج کی بیٹی اپنے خیمے سے نکلی اور یاجوج کے بیٹوں سے مخاطب ہوئی کہ ”اے مرے دادا کے بیٹے کے بیٹو! کیا تم ہم میں سے نہیں ہو اور ہم تم میں سے نہیں ہیں کہ تم ہمارے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہو؟“

یاجوج کے بیٹے نے یہ سن کر تڑکھایا اور کہا کہ ”اے ماجوج کی بیٹی ہم تم میں سے کیونکر ہو سکتے ہیں اور تم ہم میں سے کیسے ہو جبکہ ہم یاجوج کی اولاد ہیں اور اپنے پہاڑ میں رہتے ہیں۔ اور تم ماجوج کی اولاد ہو اور اپنے پہاڑ میں آباد ہو۔“ ماجوج کی بیٹی پیش کر چلائی اور بولی کہ ”اے مرے دادا کے بیٹے کے بیٹے! کیا تم اس سے انکار کرے گا کہ یاجوج ماجوج ایک باپ سے پیدا ہوئے اور ایک ماں کی گود میں پلے؟“

یاجوج کا بیٹا تھکن انداز میں بولا کہ ”اے ماجوج کی بیٹی! میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ ہم ماجوج کے بیٹے تو ہم ماجوج ہیں اور اپنے پہاڑ سے پہاڑ جلتے ہیں۔“ ماجوج کے بیٹوں نے پیش کر بہن کو بھیچے دھکیلا اور ادنیٰ آواز میں کہا کہ

”ہم ماجوج کے بیٹے قسم ماجوج ہیں اور اپنے پیارے بچانے جاتے ہیں۔“
اور پھر آل ماجوج نے آل ماجوج پر اور آل ماجوج نے آل ماجوج پر بول دیا۔
ماجوج کی اولاد نے ماجوج کی اولاد کے خون میں اور ماجوج کی اولاد نے ماجوج
کی اولاد کے خون میں ہاتھ رنگے۔

صبح ہوئے پورا ماجوج کی بیٹیوں نے جسموں پر ثاٹ باندھے، بال پریشان کئے
اور برہنہ پا نالہ کناس ماجوج کے پاس پہنچیں اور چلاتیں کہ ”اے ہمارے بابا،
تو گریہ کر کہ تیرے بھائی کے بیٹوں کے ہاتھوں ہمارے گھر برباد ہوئے، ہمارے سہا
اُجڑے اور ہمارے ماں جانیوں کے خون سے ہماری زمین لالہ زار ہو گئی۔“

ماجوج نے اپنی آل کا یہ حال دیکھا اور ماجوج کے پاس جا کر بولا کہ ”اے
ماجوج تیرے بیٹوں نے میرے بیٹوں کو تہ تیغ کیا اور میری بیٹیوں کو رسوا کیا۔“

ماجوج یہ سن کر لال سیلا ہوا اور بولا کہ ”اے ماجوج تیرے فرزند اب میں سے
ہیں جو شیریں چشموں سے سیراب ہونا چاہتے ہیں اور دوسروں کو پیاسا رکھنے
کے در پے ہیں۔“

ماجوج ماجوج میں ٹکرا رہے تھے اور بات بڑھتی ہی چلی گئی۔ ماجوج نے
طیش کھایا اور کہا کہ جو زبان ستر سکندری کو چاٹ کر اٹھے کے چھلکے کی مثال
بنادیتی ہے وہ ماجوج کو کبھی چاٹ سکتی ہے۔ ماجوج پھینچنا یا اور بولا کہ ماجوج کی
زبان چاٹنے میں ماجوج کی زبان سے زیادہ تیز ہے۔

بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی کہ شام ہونے پر ماجوج ماجوج نے اپنی اپنی
زبانیں نکالیں اور ستر سکندری کو چاٹنے کی بجائے عالم غیظ میں ایک دوسرے کو

چاٹنے لگے۔ وہ رات بھر ایک دوسرے کو چاٹتے رہے حتیٰ کہ یا جوج یا جوج کے چاٹنے سے اور یا جوج یا جوج کے چاٹنے سے انڈے کے چھلکے کی مثال رہ گیا۔ یا جوج نے دل میں سوچا کہ اب یا جوج میں رہ ہی کیا گیا ہے۔ اب سوئے جاتا ہوں۔ صبح اٹھ کر ایک زبان مادریں گا اور یا جوج کو چاٹ جاؤں گا۔ سو اس نے اپنا ایک کان بچھا یا اور دوسرا کان اڑھو سو گیا یا جوج نے بھی دل میں ہی کہا کہ یا جوج کے نام کا تو اب ایک چھلکارہ گیا ہے۔ تھوڑا آرام کر لوں۔ صبح اٹھ کر ایک زبان بھیروں گا اور اسے صفا چٹ کر جاؤں گا سو وہ بھی ایک کان نیچے بچھا دوسرا کان اوپر سے لے پڑ رہا۔

جب یا جوج یا جوج سو کر اٹھے تو یا جوج نے یا جوج کو اور یا جوج نے یا جوج کو نازہ دم پایا اور حیران ہوئے۔ پھر یا جوج کے پاس آل یا جوج اور یا جوج کے پاس آل یا جوج نالہ و شہین کرتی پہنچی کہ رات بھر آل یا جوج نے آل یا جوج کا آل یا جوج نے آل یا جوج کا خون بہایا تھا۔ تب پھر یا جوج نے یا جوج برداشت کچکپائے اور کہا کہ میں تجھے ادنیٰ آں کو یوں چاٹوں گا جیسے سدر سکندری کو چاٹا ہوں۔ اور یا جوج نے یا جوج پر زبان تیزی اور جھٹاکہ میں سدر سکندری کو بعد میں ادنیٰ آں کو پہلے چاٹوں گا۔ اور شام پڑے سے وہ پھر ایک دوسرے کو چاٹتے گئے اور چاٹتے ہی چلے گئے حتیٰ کہ دونوں انڈے کے چھلکے کی مثال رہ گئے۔ مگر اب ان کی زبانیں ریشہ چکی تھیں اور آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی۔ یا جوج نے طے کیا کہ یا جوج بوند برابر تو باقی رہ گیا ہے۔ اتنا صبح کو چاٹ لوں گا۔ سو وہ اپنا ایک کان نیچے ڈال دوسرا کان اوپر تان سو گیا۔

ماجون نے بھی یہی سوچا کہ باقی ماندہ یا جوج کو صبح چاٹ کر ختم کر دوں گا۔ وہ بھی ایک کان کو گندا بنا کر اور دوسرے کان کو محاف کی طرح اوڑھ کر سو گیا۔

صبح جب یا جوج کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے کان کے اندر سے جھانک کر ما جوج کو دیکھا اور اسے تازہ دم دیکھ کر متحیر ہوا۔ پوچھا کہ اے ما جوج کیا میں نے تجھے چاٹ نہیں لیا تھا؟ ما جوج خود اسے خندہ رست دیکھ کر متعجب تھا۔ پوچھنے لگا۔ مگر اے یا جوج میں نے تجھے کیا چاٹ نہیں لیا تھا؟ اور پھر دونوں کی آل، خونم خون اپنے اپنے بزرگ کے پاس پہنچی اور فریادی ہوئی۔ یا جوج ما جوج اپنی اپنی اولاد کی فریاد سن کر پھر ایک دوسرے پر غراتے پھران کی لمبی لمبی زبانیں ان کے منہ سے یوں باہر نکلیں جیسے بانسی سے سانپ نکلتے ہیں۔

یا جوج ما جوج ایک دوسرے کی طرف زبان لہراتے تھے کہ بوڑھا دانشمند پھر اپنی کھوہ سے باہر نکل آیا۔ یا جوج ما جوج کو دیکھ کر اس نے افسوس کیا اور کہا کہ اے یا جوج ما جوج اتھار ابراہو کہ تم سید سکندری کو تو نہ چاٹ سکے مگر ایک دوسرے کو پہنچ جائے لے رہے ہو۔

تب یا جوج نے اپنی آل کا سالٹنایا اور ما جوج نے اپنی آن کا اتم کیا۔ دونوں نے بوڑھے سے انصاف چاہا۔ بوڑھا دانشمند دونوں کی بات سن کر بولا کہ میں تمہیں اور قبیل کے درمیان توفیق دے سکتا تھا کہ کون ظالم ہے اور کون مظلوم ہے کہ ان میں سے ایک قاتل تھا اور دوسرا مقتول تھا مگر یا جوج کے باب میں کیے فیصلہ کروں کہ میں یا جوج کی زبان کو ما جوج کے خون سے اور ما جوج کی زبان کو یا جوج کے خون سے لال دیکھتا ہوں ۛ

یا جوج نے کہا کہ "اے بزرگ، کیا تو چاہتا ہے کہ آل یا جوج طبرستان کے چشمے سے سیراب ہو، اور میری آل سوکے چشمے کے کنکر پتھر چاٹے؟"

ما جوج بولا کہ "اے بزرگ، کیا تو یہ گوارا کرے گا کہ آل یا جوج طبرستان کا پورا چشمہ ڈکوس جائے اور میری آل تشنہ لب پھرے؟"

بوڑھا بولا کہ "طبرستان کا چشمہ کس نے دیکھا ہے۔ وہ سید سکندری کے اُس طرف ہے۔ اس چشمہ سے تو وہ سیراب ہو گا جو پہلے پتھر چاٹے گا کہ وہ بولہو چاٹے گا؟"

تب یا جوج نے اعلان کیا کہ میں پہلے ما جوج کو چاٹ لوں، پھر سکندر کے کھڑے کئے ہوئے پتھر چاٹوں گا۔ ما جوج گر جا کہ میں یا جوج کو اس کے آخری بچے تک چاٹ لوں گا۔ پھر میں سید سکندری کو چاٹوں گا اور اپنی آل کو لے کر طبرستان کے چشمے تک پہنچوں گا؟"

بوڑھے نے انہیں افسوس کے ساتھ دیکھا اور کہا کہ "پاٹنا یا جوج ما جوج کی زبانوں کا مقدر ہے۔ وہ سید سکندری کو نہیں چاٹیں گے تو اپنا لہو چاٹیں گے؟"

اور یا جوج ما جوج اپنی لال لہو زبانوں کے ساتھ پھر آپس میں غصہ گتھا ہو گئے۔

بوڑھے دانش مند نے انہیں غصہ گتھا دیکھ کر بعد افسوس کہا کہ "یافث کی اولاد دد منہا سانپ بن گئی کہ خود ہی کو ڈس رہی ہے؟ اور یہ کہہ کر وہ واپس اپنی کھوہ میں چلا گیا۔"

یا جوج ماجوج اس اندھیاری رات میں ایک دوسرے کو بھنبھوڑتے
رہے، چاہتے رہے۔ اُنہوں نے ایک دوسرے کو چاٹا، اتنا چاٹا کہ دیوہیکل
یا جوج ماجوج گھٹ کر انڈے کے چھلکے سے بھی کم رہ گئے۔

”فنون“ لاہور

نیون سائنز

اور ہم نے سرا کی مسوا دوا اندھیری راتوں میں لارنس جانا چھوڑ دیا ہے۔ اور اس بات کا بچے قلق بھی بہت ہے۔

پوچھو! وہ کہیں؟

یوں کہ لارنس کی ٹھٹھری ہوئی کالی راتوں میں رات کی رانی کی آواز ہلک اور لانے لانے گئے اور عمر رسیدہ درختوں کے حبیب سائے بہت یاد آتے ہیں۔ گھب اندھیرے میں اُونچے درختوں اور بے چراغ لمب پوسٹوں سے گھری پنختہ سیاہ روش اور دور درختوں کے کج میں سے ٹم ٹم نظر آتی عزت مراد شاہ کے مزار کے دیووں کی روشنی بہت حیدت زدہ کر دیا کرتی تھی۔ نامعلوم سس دہشت کی ایک خشک اور جہادینے والی لہر سارے وجود میں دوڑھیا کرتی تھی۔ اور خوف و دہشت انسان کے لئے کتنی اہم اور ضروری شے ہے۔ کہ انسان خوف زدہ نہ ہو تو بہت پھیلتا ہے اور آدمی سے آدمی ڈوب جاتا ہے۔

اور جب وہ وحشت زدہ ہوتا ہے تو وہ سکڑتا — اور ایک دوسرے کے بہت قریب ہوتا چاہتا ہے۔

ہاں تو ہم اپنی سانسوں اور آہٹوں سے ڈرتے لڑتے ہم خانے والی ہڑک پر چلتے چلتے پنخیاں کلب کی جانب آ نکلتے۔

کلب ہال کے شیشوں سے چھین چھین کر آتی روشنی اور سایوں کے سوا ایک آواز بھی نہ سناؤ دیتی اور ہمیں خوب معلوم ہوتا تھا کہ اندر تاشوں کی بازی اور ہسکی کے پیگ پر بزنس پیکٹ طے ہو رہے ہونگے، لیکن دین کے معاطے اور ٹھنڈے مادیے زور زور سے کہتے جا رہے ہوں گے۔

دھکی کے ایک پیگ کے گردش میں آنے اور کسی عورت کے ادھر سے اٹھ کر اُدھر بیٹھ جانے پر لاکھوں اور ہزاروں کے دارے نیارے ہو رہے ہوں گے۔ اور ہمیں بھی خوب معلوم ہوتا تھا کہ اب لوگ شراب پی کر بدست نہیں ہوتے، بے خود ہونے کے بجائے اپنی بزنس کے سارے معاطے اسی عالم میں کرتے ہیں اور اگر لوگ شراب پی کر بدست ہو جایا کرتے تو انھیں ایلن ایس ٹوی ایجاڈ کرنا پڑتی۔ پھر بھی اس شرک پر اگر خون مجھے لگتا اور ہر لحظہ یوں معلوم دیتا جیسے کوئی ابھی

جھوٹا جھاننا آپڑے گا۔ قدم تیز اٹھتے، سانس تیز تیز چلتی اور ہم سروی میں تھکتی گاڑیوں میں بے آرامی سے سوئے ہوئے ڈرائیوروں کو دیکھتے، اور ان سے بھی ڈرتے جلد جلد قدم اٹھاتے اس گھبٹ پر آنکھتے جس کے عین مقابل آرٹ کو فسل کی عمارت ہے۔ اور جس کے ساتھ برگڈ کا گھنا اور تازہ بردست درخت ہے کہ اس کی جڑ سے بختہ اور شفاف مرکز کے ساتھ ساتھ فٹ پائڈ کو جا بجا سے شق کر دیا ہے اور

وہ ایک بہت بڑے جڑیے کا درخت کی صورت میں ابھرا آئی ہے اور اس درخت سے آتے ہی ہمارے قدم خشک جایا کرتے تھے۔ ہر گدا کا درخت تڑپتی ہوئی فٹ پاتھ 'ہر گدا کے تنے میں ابھرے ہوئے پھوٹے اور موکھلے اس کی گھن مہیب ٹالوں کے اندھیرا روکھ لگتی جٹائیں یعنی برگد کی داڑھیاں ' خاموشی ' اور مہیب اندھیرا۔

وقت ختم جاتا ' زمانہ کی پائیں بچا اٹھتیں۔ برسوں پرانی زندگی چمچ ہم قصاں نظر آتی گئے وقتوں کے قافلے قطا اور قطا گزرتے اور اس بوڑھے برگد کے ریشے ریشے میں خیلے خیلے میں کتے عہد خوابیدہ ہوتے اور کتے نئے زمانے انگڑا لیتے محسوس ہوتے ' تکرار سر پر مہ کھڑی ہوتی۔

اور یہ ساری طلسمات اندھیرے اور تاریکی کی تھی۔

ہر شب یہی کچھ ہوتا!

دستاوی انداز میں بولتے بولتے وہ اچانک یوں خاموش ہو گئی۔ جیسے کسی پہلو چٹنے کے سوتے قطرہ قطرہ ٹپکتے ٹپکتے اچانک خشک ہو جائیں۔

تب اس نے اندھیرے کمرے میں شکر کے لمبے پوسٹ کی شیشوں میں سے چھن کر آتی روشنی کی مدھم گلیروں سے قائم ہونے والی روشنی میں ٹوٹل کوکھری کھل کی سبز ڈبی ٹکانی ٹوٹل کوکھری نکال کر روشن کیا۔ اور ڈبیہ آگے سرکا دی۔

”پناہ میں؟“

پھر وہ اندھیرے میں ہنسی۔

میں نے سگریٹ کا کوئی براؤنڈ مفر نہیں کیا ہے۔ کارٹن سے لیکر ادکے اور کٹے ٹک سارے کے سارے پہرے ہی برنڈ ہیں۔ البتہ ماچس کا براؤنڈ مفر درخت ہے کہ

میں ہمیشہ اور ہر کام کے لئے فلاحیور باسکٹ ماچس استعمال کرتی ہوں کہ اس کی تیلی لکڑی سے نہیں، مومیاے ہوئے کاغذ سے تیار کی جاتی ہے۔ اور میرے نزدیک لکڑی کو آگ دکھانا گناہ ہے۔

لکڑی جو خود درخت ہوتی ہے، بزرگ و بار لاتی ہے اور درخت جتنا پرانا ہوتا ہے اتنا ہی خاموش، پر وقار اور صبران ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کبھی انسان بھی چڑوقار اور صبران ہوا کرتا تھا۔

ہاں تو پھر کیا ہوا۔ ایک دم ہی داستانی انداز پھر لے پر غالب آ گیا تھا۔ ایک رات یوں ہوا۔

ایک سرے پر بزرگ کا درخت تھا اور دوسری طرف وکٹوریہ گیٹ اور اس کے آگے دیواروں سے گھرا ہوا راستہ یعنی چڑیا گھر کی سڑک۔

تو کیا ہوا کہ اس شب برگد تلے وقت کی چھا لگیں خاموش رہیں اس کی ایک بھی پائل نہ بھی۔

اگلے اور پچھلے زمانوں کے سارے قافلے گم تھے۔ جیسے کسی نے ببول سے رات کے بجائے دن کو کوئی کہانی سنا دی ہو۔ اور سارے زمانے رمنہ ببول گئے ہوں۔

اور ہم نے چونک کر دیکھا تو وکٹوریہ گیٹ کے کٹر پر کو کا کولا کا ایک بہت بڑا سائون سائن نصب تھا۔ ایک بڑا سا گول دائرہ ۱۰ اور اس کے اندر کئی دائرے۔

ہر دائرے کا رنگ دوسرے سے مختلف تھا۔

ہر دائرے کا اپنا الگ رنگ تھا۔

اور سارے دائروں پر حاوی۔

کو کا کو کا کا نام تھا۔

یہ سارے دائرے۔

گاہ جل اٹھنے اور گاہ بچھ جاتے۔

آنکھوں میں چمکا چوند سی ہوتی، نظر تملاتی۔

اس طرف برگد کا پرانا درخت تھا۔ اور اس طرف فری میسن ہال کی تاریکی

کی متلاشی ہوا سرد صارت۔

ہمارے اس لمحہ کو وا پڑا بلڈنگ کا پیارہ نما سبز روشنی سے لہریز رقبہ تھا اور اس

سے کچھ آگے۔ افلاح کی روشن جبین۔ اور اس کی نیون سائز سے دکتی پیشانی پر

سروس شدہ دانوں کا بار بار لپکتا ہوا چوتا۔

مد ہو گئی تھی.....

ہمارے صدمہ کی راتیں سو گوار اور ماتم کناں تھیں۔ تم نے راتوں کی غوتوں

پر چھاپے مارے ہیں۔ پہلے تم نے ہماری اذانوں کے اسرار گم کئے سائی گھون کی

لہروں پر کھت آذانوں میں دی جانے والی اذانوں میں کوئی بھیدا اور کوئی راز

باقی نہ رہا۔

اور اب تم نے ہماری راتوں کے سماگ بھی لوٹ لئے۔

اور شبوں کا تقدس تو ان کی افسروگی، ان کی ظلمتوں اور بکیتوں سے عبارت ہے۔

اب نہ ہماری راتوں میں سکوت باقی ہے اور نہ ظلمتیں۔ انسان اب راتوں کو بھی

اتنا ہی نڈر ہے جتنا وہ دن کو تھا۔

نیون سائز نے رات کی چادر کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔

نیون سائٹز۔ رات کے جسم پر چمکتے ہوئے داغ جیسے ان سے خوف آتا ہے۔ اور ان کے نظارے سے میری بینا نگہیں درد کرنے لگتی ہیں۔

پھر اس روشنی میں انسان کچھ بھی تو نہیں دیکھ سکتا۔ اور اس دنیا میں کتنی بہت سی چیزوں کو انتظار ہوتا ہے کہ ان کی طرف دیکھا جائے۔

مگر اے نیون سائٹز۔

میں تاریکی اور غلمتوں کی ضرورت ہے۔

کہ بہت سی روشنی نظر کو خیر و کرہتی ہے۔

وہ پھر اندھیرے میں منہسی۔

اور عجیب بات ہے کہ اتنی بہت سی لگی اور بے سرو پا باتیں کرنے کے باوجود اس کی منہسی میں ذرا بھی پگھلا پن نہ تھا۔

اور پتہ ہے کیا ہوتا ہے۔ جب ہم بہت دیر تک چند حیا دینے والی روشنی کی طرف دیکھتے ہیں تو وہ ہماری آنکھوں میں بس جاتی ہے۔

ہم آنکھیں بھی بند کر لیں تو بھی ان بند آنکھوں میں وہ روشنی در آتی ہے۔ اور پتہ ہے کیا ہوا۔

شاید یہ نیون سائٹز میری آنکھوں میں ساگئی ہیں۔ یہ ہر گھڑی رنگت بدلتی اور اندھیرے اُجالے سے آنکھ بھرنے کی سیلتی ہوئی میری آنکھوں میں بس گئی ہیں۔

جب ہی تو میں نے یہ نیون سائٹز انسانی چہروں پر چلتی بھتی دیکھی ہیں۔

اب اس کی آواز ہر وحشت تھی۔

دیکھو مجھے لگتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نہیں نہیں لگنا کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے۔

میں کریک ہو گئی ہوں، مجھے لگتا ہے کہ جیسے میرے دماغ کا ایک حصہ خراب ہے۔

تیس روشنی کرلوں اس کے ساتھی نے گھبرا کر پوچھا۔

تم روشنی کر کے کیا پاؤ گے، جسکا اندھیرے اور اُجالے میں فرق ہی نہیں رہ گیا۔

اُجالے اب اتنے حلقا تو نہیں۔ اب تو راتیں بھی اندھیری نہیں ہوتیں۔

سامریکی میں سگریٹ کا روشن سرا بجھ جانے والی ضلع کے گل کی طرح دمک رہا تھا۔

پھر بھی روشنی کر لینے میں کیا حرج ہے۔ تم یوں سدا اندھیرے میں تو نہیں بیٹھ سکتے۔
تم روشنی کر لو۔

تب اس نے تہی جلائی۔ اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ نہایت مٹھن اور
باہوش نظر آ رہی تھی۔

اس کو اطمینان سا ہوا۔ اور حیرت بھی۔

ارے!

ارے کا کیا مطلب، تمہیں کس بات پر حیرت ہوئی!

کچھ نہیں، اس نے بات بنائی، تمہارے گرد قلم ہیں، کاغذ میں برش ہے۔

دنک اور روغن ہیں۔ تم کیا ایک وقت میں دو دو کام کرتی ہو۔

دوا صل میں کچھ بھی نہیں کرتی ہوں جب ہم سب کچھ کر دینا چھوڑ دیتے ہیں

تو اپنے ارد گرد بڑا لطراف اکٹھا کر لیتے ہیں اور لوازمات کا ایک جال بٹن لیتے ہیں،

اور بہت بولتے ہیں۔

ایچھا! اب تم نے اصل بات کہنے سے گریز کر کے دوسری بات کیوں کی تھی! کہ تم نے یہ نہیں کہا چاہتا تھا کہ 'اے تم تو ذرا بھی پاگل نہیں نظر آ رہی ہو نہیں' نہیں پاگل نہیں ہوں، لیکن میرے دماغ کا ایک حصہ ضرور خراب ہے جب ہی تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے ارد گرد میرے چہل چل جانباہاروں اور ان لوگوں کے چہروں پر جن سے میں خوب اور اچھی طرح واقف ہوں یہ بڑے بڑے سے بڑا ڈاؤن ہوا ہے جو گھڑی گھڑی رنگ بدلتے اور جھلکتے جھکتے ہیں۔

اور اب یہ حال ہے کہ میں کسی کو بھی نہیں پہچان پاتی۔

اب ہر شخص اجنبی اور ہر گھڑی نیا نظر آئے گا، لوگوں کی محبتیں، وفائیں، غرضیں اور سارے اصول گھڑی گھڑی بدلتے ہیں۔

کون کیا تھا؟ اور اب کیا ہے؟

یہ فیصلہ مشکل ہو جائے گا۔

کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے، 'میں یہاں اجنبی ہوں اور اپنی بستی سے ناواقف۔

جیسے میری بستی کھوئی گئی ہو۔

میرے رختے گم ہو گئے ہوں۔

چہرے بہت جلد جلد اپنے رنگ بدل رہے ہیں، لگا لگت اور یگانگی کے فاصلے

ختم ہو چکے ہیں۔ ایک ایک انسان کے بے شمار روپ مجھے اپنے محیط میں لے رہے ہیں۔

تب اس کی آنکھوں کی چمک سے گھبرا کر اس نے ایک بار اور التجا کی۔ میں روتی

گل کر دوں، بستی بھجوا دوں۔

ہاں 'ضرور' اس نے فوراً جواب دیا۔ 'عجبیرے اور ظلمات میں بڑا تحفظ اور ڈری

کیسا نیت ہے۔ اندھیرے بڑے پردہ پوش ہوتے ہیں۔

بٹن بجھی تو وہ اچانک چونک کر پوچھنے لگی۔ ہاں نہیں کیا کہہ رہی تھی۔

کیا بہت ضروری ہے کہ انسان کچھ نہ کچھ کتابی چلا جائے؟

ہاں کم سے کم اس کے لئے بہت ضروری ہے۔ جسے ہر ہرے پر چھوٹے بڑے

بے حساب دائرے نظر آتے ہوں۔ گھڑی گھڑی جھلتے بجھتے رنگ بدلتے اور تمام دائروں

پر محیط کوئی نہ کوئی اشتہار نمایاں اور خوبصورت حروف میں لکھا ہو۔

اب انسان کس کس سے کسے اور کس کس کو جتنا پورے کہیں نے تمہارے کون

کون سے اور کتنے روپ دیکھے ہیں۔ اور یہ بتاؤ! کہ تمہارا کوئی سچا اور اپنا روپ بھی ہے۔

اب گئے دن کی بات ہے کہ میں نے وہ چہرہ دیکھا جس سے میں بہت واقف

تھی اور میں نے اسے بہت دیکھا تھا۔ اور اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ کتنا بدلا

اور میں نے اس پر کتنے دائرے اور کتنے رنگ دیکھے۔ حد تو یہ ہے کہ اس پر کھلے ہوئے

اشتہار بھی گھڑی گھڑی بدلتے تھے اور اس چہرے کے مقابلے میں کو کا کو کا دو نہیں

سائن کتنا بہتر لگا تھا کہ جس کے دائرے گھڑی گھڑی رنگ بدلتے اور جلتے بجھتے تھے۔

لیکن کم سے کم ایک چیز تو مستقل اور برقرار تھی کہ اس پر مستقل کو کا کو کا کا اشتہار آویزاں تھا۔

اور اب کیا تمہارا خیال ہے کہ مجھ پر یہ فرض تھا کہ میں اپنی اس واقف اور دست

کو بہ باقی کہجے تمہارے چہرے پر مختلف دائرے نظر آتے ہیں اور ستم بالا سے ستم یہ کہ اس

پر کوئی مستقل قسم کا اشتہار بھی تحریر نظر نہیں آیا ہے۔

نہیں یہ بات درست نہیں کسی کو اس کے بارے میں بتانا اور جتنا بڑا خطرناک

اور غیر منصف بخش سودا ہے۔ دوسروں کے پردے فاش کرنا ہم پر لازم نہیں۔

کہ خداوند سنا را العجوب ہے۔ وہ خود پردہ پوش ہے۔ اور اس نے انسان کو نیوں سا سبز عطا کئے ہیں۔ کہ وہ اپنے چہرے کو نقاب اندر نقاب رکھیں۔

لیکن یہ بات بھی ہے کہ دیکھنے والی نظر کا خیال نہ کیا۔ کہ یہ گھڑی گھڑی جتنی بھتی روشنیاں نظر پر ظلم کرتی اور بڑا دکھ دیتی ہیں۔ اور بس اوقات نظروں میں سا کر رہ جاتی ہیں، کہ میں اس رات کو جہت کو سستی اور نہیں چاقتی ہوں کہ جس رات میں نے برگد تلے سے کھڑے ہو کر دیکھ کر یہ گیٹ کے ٹکڑے پھیل کر نے کو کا کو لاکے اس نیوں سا رنگ کو دیکھا تھا۔ اور پھر اس شب کے بعد اُمحالے اور اندھیرے نے اپنے آپ کو ان کے محیط میں محصور پایا۔

لاڑس کی راتیں اب بھی ویسی ہی سوز کا موش اور اندھیری ہیں۔ اور روشنی رات کی رانی کی آوارہ دمک بھٹکتی ہے۔ اب بھی جم خانے اور خباب کلب کے بار شیشوں سے چھن چھن کر آنے والی روشنیوں کی کریمیں تکی کے پردے چاک کرنے کی ناکام کوششوں میں مصروف نظر آتی ہیں۔ اب بھی وہاں تاش کی بازیوں اور عورتوں کے اُلٹ پھیرے محافلے اور سودے طے ہوتے ہیں۔ لوگ بڑھیا سوٹوں میں جیسے بڑھیا شراہوں کے جام ہاتھوں میں اٹھائے اپنے چہرے پر نیوں سا سبز کے بورڈ آؤیزاں کئے ہنس بول رہے ہیں۔ اور رات گئے با صبح کا ذب کے دھنگ ہیں کوئی بیرا ان کو نیم بے ہوشی کے عالم میں گھسیٹ کر لٹ کی گاڑیوں میں ڈال دیتا ہو گا اور ڈرائیور کا شانہ ہلا کر اس کو بیدار کرتا ہو گا۔ انہیں لے جاؤ کہ ان کے محافلے اور سودے مکمل ہو چکے ہیں؟

وقت دے قدموں یوں ہی اپنے کاموں میں مصروف رہے گا۔ اور میں شاید

اندھیرے اور ظلمتوں کی عافیتوں کی تلاش میں یوں ہی بے کُن رہوں گی۔ میرے ارد گرد نیون سائز کے بورڈ کسی درخت کی ڈالوں پر تیزی سے بڑھتے ہوئے پتوں کے اصنافی اور ضربی عمل کی صورت میں بڑھتے جائیں گے۔ اور کہتے ہیں جب تخت ناقص پتوں اور ڈالوں کا بوجھ اٹھائے اٹھائے اگتا جاتا ہے تب خزاں کے قدموں کی آہٹ سُنائی دیتی ہے۔ اور خزاں کے دامن میں بہاروں سے کتنی گنا زیادہ رنگ ہوتے ہیں۔ پتے پتے کاروبار بدلتا ہے۔ پتے پتے کارنگ بھڑکتا ہے۔ تم نے دیکھا ہے کہ کبھی فصل خزاں کا وہ دور جب پتہ پتہ رنگ بدلتا ہے اور پھر صبر و صبر تمام رنگ آپس میں گنڈھ ہوتے ہیں تو مکمل اور بھرپور خزاں آتی ہے۔ اور یہ کہیں فصل خزاں تو نہیں۔

کہیں تم نے خزاں کے پاؤں کی چاپ تو نہیں سُنی!
 نہیں ٹھہرو۔ پہلے میں اپنی کھڑکیاں اور دروازے مضبوطی سے بند کر لوں۔
 تب کوئی جواب دینا۔

اچھا چھوڑو! مجھے نیند آرہی ہے۔
 میں نے تمکبیر پر سر رکھ لیا ہے۔
 اور اب تم بھی سو جاؤ!

اس کے ساتھ ہی نے اس کی نیند میں ڈوبی آواز کو آخری بار سُنا۔
 اور بہت دیر بعد مکمل سکوت کو محسوس کیا۔ بجز دھیرے دھیرے آتی ہوئی،
 نرم نرم سانسوں کے۔

کھڑکی کے شیشوں میں سے چمن چمن کر آتی ہوئی روشنی میں اس کے ہاروں

طرف بکھرے ہوئے کاغذ تھے اور بلا کیپ کو ایک قلم تھا۔ جس کی روشنائی شایقہ
 ہو چکی تھی۔ اور گھرٹوں کی راکھ سے لبریز راکھ دانی۔ برش رنگ و روغن کھڑکی کے
 شیشوں میں سے آتی ہوئی مدھم روشنی اپنے سائندہ درختوں کی ڈالوں کے جو سائے
 لائی تھی وہ دیوار پر مدھم اور پراسرار نقش اُبھار رہے تھے۔

پھر اس نے اُن کو کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا اور کھڑکی کے دروازے کھول کر
 دیکھا، سامنے کو کا کو لاکا بیڈن سائن گھڑی گھڑی چل بچھ رہا تھا۔

”سیپ“ کراچی

آنکھوں پر دونوں ہاتھ

تم کیا سائرن جواتھا؟ یہ سب لوگ باہر کیوں نکل آئے؟“ اس نے اپنے برابر ریڈنگ پر جھکی اس لڑکی سے پوچھا جس سے بات کرنے کے لئے وہ صبح سے کوئی بیٹا تلاش کر رہا تھا۔ لیکن اس وقت تو وہ کسی سے بھی یہ سوال کر سکتا تھا، یہ تو محض اتفاق تھا کہ اس کے قریب وہی لڑکی کھڑی تھی۔ اسے یاد ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس آواز پر یا کس کے کہنے پر ہنر بڑا کر اپنے کہیں سے باہر نکل آیا تھا۔

وہ لڑکی ریڈنگ پر اس طرح جھکی ہوئی تھی کہ اس کا سینہ اس کے دونوں ہاتھوں میں چھپ گیا تھا اور اس کی کمرے لچک کر اس کے ہرے بھرے کوہوں کا اندھ بھی نمایاں کر دیا تھا۔

”تم تو اس کے گول گول کوہوں پر ہاتھ پھیرنے کے لئے سرے جا رہے ہو اور

بس — — —!“

اور بس — — —!“ اسے یہ کہہ کر صبر کیا؟ اس نے گھوم کر کہیں کے کہیں کی

طرف دیکھا، سب لوگ اپنے مکیدوں سے باہر نکل آئے تھے۔ ہر شخص ریٹنگ پر جھک کر اندھیری ندی کے پانی میں کچھ دیکھنے کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا کیوں کی کٹریکوں سے چپن چپن کر آنے والی روشنی سے اسٹیر کے آس پاس ندی کا غور ڈرا سا حصہ نظر آ رہا تھا مگر روشنی میں پانی اور بھی ٹیلا ہو گیا تھا اور اسٹیر کے چھنے سے جو لہریں پیدا ہو رہی تھیں اس سے وہ گدلا پانی بار بار رنگ بدل رہا تھا، کبھی اس کا رنگ کالا ہو جاتا، اگر کالا کبھی نیلا اور کبھی سرخ۔ ندی سے اُٹھنے والے بھاپ کے بخور سے اُد کا لے بادل سرخ لائٹ کی تیز روشنی کا رس نہ روک رہے تھے۔ سامنے بھاپ کی بھوری دیوار کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے خیال آیا کہ شاید اسٹیر متھر گیا ہے۔ مگر جب اس نے غور سے سُنا تو انجن اور پانی کی جلی جلی آوازیں براہِ راست تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ اسٹیر چل رہا ہے۔ اور اس نے اپنی رفتار بھی بھیجی تک کم نہیں کی۔ اس نے ٹرکی کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل مطمئن کٹری تھی، جیسے اس کے لئے طوفان اگر گزر بھی چکا ہو، جیسے وہ صدیوں سے اسی طرح پرسکون کٹری ہو مگر دیکھ کا عجیب عالم تھا۔ تھوڑی دیر پہلے وہاں جو آرام کرسیاں ترتیب سے رکھی تھیں وہ منتشر ہو گئی تھیں۔ کچھ کرسیاں چھوٹی میزوں پر کھدی گئی تھیں اور کچھ اٹلی پر تھیں۔ ریٹنگ کے ساتھ ٹکٹے والی لائف بیلٹ کھول دی گئی تھی۔ ڈائینگ ہال کے بیرے اور مشین روم کے لوگ اُدھر اُدھر جا گئے پھر۔ جیسے ٹھنڈے ڈائینگ ہال کے اندر سے بھی کھٹ پٹ کی آوازیں آرہی تھیں جیسے برتن پٹنے جا رہے ہوں اور الماریوں کے دروازے کھول کھول کر بند کئے جا رہے ہوں۔

پھر اس نے کچھ اجنبی پھرے دیکھے جو ڈائینگ ہال کے دروازے سے نکل کر تیزی

سے نور کلاس کی طرف جاتے اور اسی تیزی سے واپس آجاتے وہ حیران ہوا کہ یہ کون لوگ ہیں اور کیا چانک کہاں سے آ گئے؟ پہلے تو اس نے انہیں نہیں دیکھا۔ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟

مگر وہ نین غیر کلی کہاں گئے؟ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ کر ایک سفید فام لڑکا، ایک بوڑھی عورت اور ایک بوڑھا مرد مرد نے پاؤں والے سفید فراک پہن رکھا تھا۔ بوڑھی عورت سر پر سفید بھال باندھے تھی اور لڑکے نے سفید قمیض اور خاکی پتلون پہن رکھی تھی۔ وہ لڑکا بھی دن بھر خاموشی سے اُس لڑکی کو دیکھتا رہا تھا جو اس وقت اُس کے ساتھ ریڈنگ پڑھ چکی ہوئی تھی۔ بوڑھی عورت آرام کرسی پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھتی رہی تھی اور بوڑھا مرد ٹھنڈا رہا تھا۔ وہ بیٹوں جب تک اس کے سامنے رہے بالکل خاموش رہے۔ اسے تو ایسا لگا کہ انہوں نے اپنے کہیں میں جکر بھی کوئی بات نہیں کی ہوگی وہ حیران تھا کہ اگر یہ بولے تو ان کی آواز کیسی ہوگی؟ وہ ڈیک پر خاموش بیٹھ رہے یا غصے رہے۔ پھر فائینگ ہال میں اسی کلیسا والی متبرک خاموشی کے ساتھ کھانا کھاتے رہے۔ زیادہ رات ہوئی تو اپنے کہیں دیکھنے میں چلے گئے۔ پھر۔۔۔ وہ بھی کتنا پاگل ہے۔ وہ فوراً تے ہی میں کسی گھاٹ پر اتر گئے تھے۔ اُدھی رات کے وقت۔۔۔ مگر کس گھاٹ پر اتر گئے تھے۔؟

تو کیا اُدھی رات ہو چکی ہے؟ اس نے ریڈنگ برائڈنگ کراٹھانوں کو دیکھنے کی کوشش کی مگر وہاں ایک بھی ستارہ نہیں تھا، اور بادل اتنے کالے اور اتنے گھنے تھے کہ اس کی آنکھوں کی روشنی انہیں پار نہیں کر سکتی تھی۔ پھر اس نے اپنے سامنے ندی کے کنارے پر نظر جانے کی کوشش کی کہ شاید ادھر کوئی ایسی چیز نظر

آجائے جس سے وقت کا اندازہ ہو سکے ٹھہراتے ہیں ٹوکی کٹری تھی اور عدی ہاکوئی کنارہ نہیں تھا۔

”میں اپنے کہیں میں تنہا ہوں اور اس میں دو بستر ہیں۔“

ٹوکی نے گنگا گھوڑا گھوڑوں پر سے لانی اور گھنٹی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا جیسے اس کی بات سن لی ہو اور اسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر تیز آگے کر ٹھیک کر اپنے سامنے سے کچھ کھانا اور کھینچ کر ہنس پڑی۔

”خوب صورت ہیں آپ بہت خوب صورت! مگر اس لینڈ اسکیپ میں آپ کا یہ تنگ لباس کچھ اچھا نہیں لگا۔ یا۔ اچھا لگتا ہے! ایں۔؟“

”تمہارا کیا خیال ہے۔؟“ یہ بات اس نے کبیرے کسی اور زور سے کہی۔

”کس ہاؤس میں۔؟“

”لابیٹر بہت مزے کی چیز ہے۔“

”اور لابیٹر بھی اس اسٹیئر کے۔“

ساری حرکت کبیر کی تھی۔ اس نے کہیں الگ الگ لئے اور ٹھائینگ ہال کی چاروں میزوں میں سے چھانٹ کر اس میز پر بیٹھا تھا جو بالکل اس ٹوکی کے سامنے تھی۔ پھر وہ پلکیں نہیں اٹھائیں۔ یا خود اس نے ہی ڈر کے مارے اس کی طرف نہیں دیکھا۔

”اب ہم کل دو میز تک کھانا پہنچ سکیں گے۔“

”کیوں۔؟“

”اسٹیئر نے راستہ بدل دیا ہے۔“

”راستہ کیوں بدلا؟“

”وہ یا ناراض ہو گئے ہیں۔ ہم خلیج بنگال کے قریب ہیں اور سارے طوفان ہمیں

جنم لیتے ہیں۔“

”سارے طوفان ہمیں جنم لیتے ہیں؟ اس نے دریا میں تیرتے ہوئے جل کڑی

کے پردے پر بیٹھی تلی کو دیکھا۔ یہ تلی جو ایک کنارے سے چلی ہے اور جل کڑی کے پردے

پر بیٹھ بیٹھ کر دریا پار کر جائے گی۔ مگر اس تلی کو دریا پار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ

ایک ہی کنارے پر زندہ گی کیوں نہیں گزاردیتی۔ اُس نے اُس لڑکی کو دیکھا۔ وہ بھی

شاید اسی تلی کو دیکھ رہی تھی اور اس کا ساتھی گھوم پھر کر تصور پر یہ آثار رہا تھا۔ اُسے

ہنسی آگئی۔

وہ دونوں بیک وقت ایک تیسری چیز کو دیکھ رہے ہیں۔ کتنا شاعرانہ خیال ہے!

وہ اور ایک خوب صورت ترکیب۔ اور تیسری شے! دونوں میں مشترک! — اور پھر

مشترک حقیقت۔ یہ سفر۔!

پھر اسے شبہ ہوا کہ اس نے اس لڑکی سے کچھ پوچھا بھی تھا یا محض اس کا خیال

تھا کہ اس نے پوچھا ہے؟

”کیا سائرن ہوا تھا؟ سب لوگ باہر کیوں نکل آئے؟“

اس نے زور سے کھٹک کر گلا صاف کیا اور چاہا کہ پھر اس سے وہی سوال کرے۔

لیکن پھر سوچا کہ سوال کرنے سے کیا حاصل؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ لوگ اپنے کینڑوں

سے باہر نکل آئے ہیں اور ریلنگ پر رکھ گئے ہیں، جو ریلنگ پر نہیں کھٹک سکے وہ

ایک دوسرے کا منہ تکتے پھر رہے ہیں۔ جیسے دو مردوں کی آنکھوں میں نہیں اپنی نکت

کاساماں نظر آئے گا۔ وہ خود ریٹنگ برٹکنے والوں میں سے تھا کیونکہ جن آنکھوں میں وہ اپنے بچاؤ کی تدبیریں بڑھا چاہتا تھا وہ بھی ندی کے تھیلے اور تاریک پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

”ارے یہ کیہ کر رہ گیا؟“ اس نے گھوم کر اس زمین کی طرف دیکھا جو لوئر کلاس کے تنگ تاریک غار کی طرف اترتا تھا اور جس کی طرف جانے کے لئے وہ صبح سے کئی مرتبہ ارادہ کر چکا تھا۔ مگر جب بھی قدم بڑھاتا وہ آنکھیں اس کاماتہ روک لیتی تھیں۔ یہ یقیناً نیچے ہو گا بلکہ ہو سکتا ہے وہ مسافروں کا سامان اکٹھا کر کے انہیں گھاٹ پر اتارنے کے لئے تیار کر رہا ہو۔ مگر کونسا گھاٹ؟ ایک گھاٹ تو گزر گیا۔ اب کونسا گھاٹ آئے گا؟ اور وہ تینوں غیر ملکی جس گھاٹ پر اتارے وہ کونسا گھاٹ تھا؟ وہ رات کا کونسا پہر تھا؟ اسے پتہ کیوں نہیں چلا! ہو سکتا ہے وہ بھی وہیں اتر جاتا۔ تو پھر وہ سند بن کیسے پہنچتا؟!

”اب اسٹیمر سند بن کے راتے جائے گا۔“ اسے یہ اطلاع دوپہر کے کمانچہ پر ”اچھا۔۔۔!!“ وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ وہ خوش تھا کہ مقررہ وقت سے پہلے ہی وہ سند بن دیکھ سکے گا۔

”مگر وہ تو آدھی رات کے بعد کہیں آئے گا۔ آپ کیا دیکھ سکیں گے؟“
”کچھ بھی نہ دیکھ سکیں! اس کی خوشبو تو سونگھ سکیں گے۔“

پھر اس نے پہلی بار گھاٹ پر آنکھوں اور بجاپ دیتے سانولے جسم کی گرگڑائی خوشبو اپنی ناک آنکھوں اور ہونٹوں کے قریب محسوس کی۔ وہ بیماری بیماری کی بڑی تکلیف سے انہیں پھر سارے دریاؤں کی گہرائی نے اس کا جائزہ لیا اور

حکیم گلوں پر جبک گئیں۔ اس نے جلدی سے لابسٹری نرم نرم میٹک سے اپنا منہ بھر لیا اور محسوس کیا کہ چشہ پوشی چیز کھاتے جوئے بھی منہ میں پانی بھر سکتا ہے۔ اب سفر اچھا کٹ جائے گا۔ اس نے سوچا۔ !

پھر دائیں ہاتھ والی میز سے تینوں غیر ملکی اٹھے اور اپنے کیمپوں کی طرف چلے گئے۔ ان کے بائیں جانب امینز رہتا بیٹھ گئے پولیس افسر نے اخبار پڑھنا شروع کر دیا وہ بھی خاموش تھا تینوں غیر ملکی بھی خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے تھے۔ وہ بڑی بھی بچہ سا تھی سے کوئی بات نہیں کر رہی تھی، سفید وردی میں ملبوس دیشر بھی ایک کونے میں بت بنا کھڑا تھا حتیٰ کہ کبیر بھی خاموشی سے لابسٹری ٹانگیں توڑ رہا تھا۔

اس مکمل سکوت سے اسے ڈر لگا۔ اتنی گہری اور گہمیر خاموشی! بنگال کے تمام

دریادوں کی گہرائی اور سارے جنگلوں کا سناٹا اس وقت اس دامننگ ہال میں گھس آیا تھا۔ اتنے گہرے سکوت کے بعد کچھ کچھ ضرور ہو جاتا ہے، مگر کیا ہو جاتا ہے؟ پھر اس نے خاموشی توڑنے کے لئے بھاری رستے والی شیفلڈ کی پھیری اٹھائی اور اپنے سر کے پاس لے جا کر زور سے لکڑی کے فرش پر چھوڑ دی اور سامنے کھڑکی کے شیشوں میں سے کھلے آسمان کو دیکھنے لگا۔ آٹھ آنکھوں نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا اور ویز چمک کر پھری اٹھانے کے لئے لپکا۔ کبیر نے پہلے تو اسے گھمبیر چھپا کر اس کو دیکھا پھر مسکرا کر گرم گرم جھینگے چالے لگا۔ خاموشی پھر چھا گئی۔

لوٹو کلاس کی طرف جانے والی میز جیولر رسافروں کی بھیڑ تھی، چند نہیں اتنے بہت سے لوگ کہاں سے آگئے تھے۔ ہر شخص نیچے اترنے کے لئے بے قرار تھا اور جاتا تھا کہ سب سے پہلے وہی نیچے پہنچ جائے مگر ایسا لگتا تھا کہ آگے کسی چیز نے راستہ

روک رکھا ہے۔ آگے والے سرک ہی نہیں رہے تھے۔ ہر آدمی اپنی جگہ جا کھڑا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ اس کے آگے والا قدم بڑھائے تو وہ بھی اپنا پاؤں نیچے اتارے۔ اس نے لوگوں کے سروں پر سے نیچے جھانکنے کی کوشش کی مگر اندھیرا اتنا تھا کہ کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر اسے کبیر دکھائی دیا جو اجنبی لوگوں کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ کبیر حسب معمول گھبرا یا ہوا اور پریشان تھا۔ وہ بار بار اپنے منہ پر ہاتھ پھیرتا سر ہلاتا اور زور زور سے ہاتھ ہٹاتا۔ اجنبی لوگ اس کے سامنے بالکل خاموش کھڑے تھے۔ جیسے کہنے کی ساری باتیں کبیر کے پاس نہیں اور وہ سننے کے لئے مامور کئے گئے تھے۔ مگر۔۔۔۔۔ انہیں اس کام پر کس نے مامور کیا تھا۔ اس وقت جبکہ اسٹیبلر ٹوفان زور شہر ہا ہوا ہے یہ لوگ اتنے مطمئن اور اتنے بڑے سکون کیوں ہیں؟ کبیر یقیناً ان لوگوں سے مدد طلب کر رہا ہو گا۔ تو گویا کبیر ٹوفان میں کسی کی مدد حاصل کر سکتا ہے۔

کبیر۔۔۔۔۔ بھائی۔۔۔۔۔ اس نے زور سے آواز لگائی اور نیچے سے آنے والے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اتنے بہت سے لوگوں کی موجودگی میں اس کی آواز کبیر تک کیسے پہنچ سکتی ہے مگر جیت اس بات پر ہوئی کہ اس کے قریب کھڑے لوگ بھی اس کی آواز پر نہیں چونکے تھے جیسے انہوں نے کوئی آواز سنی ہی نہیں۔ تو کیا وہ خواب میں چب رہا ہے۔ یا صرف سوچ رہا ہے کہ وہ چیخ رہا ہے؟! پھر اسے شک ہوا اپنے آپ بڑے اپنے خیال اور اپنی سوچ پر۔ وہ لوگ جو راستے میں کسی گھاٹ پر اتر گئے کیا واقعی غیر ملکی تھے؟ یا یہ بھی محض اس کا خیال ہی تھا؟ صرف اس پر ہنسا سفید فرائک دیکھ کر ہی اس نے فرض کر لیا تھا کہ وہ غیر ملکی ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ غیر ملکی نہ ہوں، صرف انہوں نے لباس ایسا پہن رکھا ہو مگر اس سے کیا

فرق پڑتا ہے کہ وہ ملکی تھے یا غیر ملکی۔ وہ مسکرایا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ وہ رات میں کسی وقت چپکے سے کسی گھاٹ پر اتر گئے۔ تو وہ کونسا گھاٹ تھا!! اس کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔ اس لڑکی کو ضرور معلوم ہو گا۔ وہ بھی بڑی میٹھی میٹھی نظروں سے اس لڑکے کو دیکھ رہی تھی۔ مگر۔۔۔ اس کے دماغ میں اچانک ایک کونسا سا پکا۔ اس لڑکی کا سا تھی نظر نہیں آیا۔ کہاں گیا وہ جھنسی۔۔۔ جھنسی۔۔۔؟

”عجب بات ہے خوب صورت لوگوں کے ساتھ مرد ہمیشہ بد صورت ہوتے ہیں۔“
”ہوتے نہیں لگتے ہیں۔“

اس نے بے ساختہ قہقہہ لگا یا اب اس کے ارد گرد کھڑے بہت سے چہرے اس کی طرف مڑ گئے اور ساری آنکھیں اس کے چہرے پر گڑ گئیں۔ نیم تاریکی میں اس نے دیکھا کہ اُن کا لے بھجنگ چہروں سے تیل ٹپک رہا تھا اور رنگ و طرح جسم اس میں آپس میں چٹے ہوئے تھے جیسے انھیں گوند سے چپکا دیا گیا ہو۔ پھر وہ چہرے ساکت ہو گئے اور سارے جسم پیسنے میں چلے گئے گوشت کی دیوار بن گئے۔ اب صرف آنکھوں کی سفیدی جگر جگر کر رہی تھی۔ وہ ڈرا لگئیں اس کا جسم بھی تاریکی کے اس وسیع جسم میں تحلیل نہ ہو جائے۔ اس نے خوف سے جھجھری لی اور زور سے آنکھیں بند کر لیں۔

نہ جانے رات کا وہ کونسا پہر تھا۔ جب وہ اپنے کہیں میں گیا تھا۔ اسی وقت اس نے بہت سے لوگوں کی آوازیں سنی تھیں، جو ایک ہی لے اوں ایک ہی آہنگ میں۔
”اٹھو۔ اٹھو۔ اٹھو۔“ کہہ رہے تھے۔ جیسے بہت بھاری بوجھ یا جیوٹ کی بھاری بھاری گانٹھیں اسٹیر سے دھکیل کر گھاٹ پر لے جاتی جا رہی ہو اور بوجھ اور نمٹن کا احسا کم کرنے کے لئے ”اٹھو۔ اٹھو۔“ کی آواز لگاتی جا رہی ہو۔ تو گویا وہ کوئی گھاٹ تھا اور وہ

تینوں ضرور اسی گھاٹ پہناتے ہوں گے۔ مگر وہ کونسا گھاٹ تھا اور اسے اس وقت خیال کیوں نہیں آیا۔ اب کیوں آ رہا ہے۔؟

لوئر کلاس کی طرف جانے والی سیڑھیوں پر بوجھ گھٹا تھا اُس سے زیادہ جمع اب اس کو پیچھے جو گیا تھا اور سب مل کر اسے دوبارہ بے تھکے اس نے آہستہ آہستہ آنکلیں کھولیں اور اس طرف دیکھنے کی بہت کی جدوجہد تو کی رینگ پر چبکی ہوئی تھی۔ چاہا کہ آگے بڑھے مگر راستے میں ایک لمبی سی واڑھی والا دیوار بنا کھڑا تھا۔ وہ ٹھٹھک گیا نیچے اترنے والا راستہ ننگ و مٹرننگ جھوم نے روک رکھا تھا اور اوپر جانے کا راستہ اس واڑھی والے نے۔ اس نے اپنے پیروں کو دیکھنے کی ناکام کوشش کی اور بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا۔ کیڑا چھا رہا تو پہلے ہی نیچے اتر گیا۔ اس نے واڑھی والے کی آنکھوں میں آنکلیں ڈال دیں جو سکت نہیں اور اسے تھکے جا رہی تھیں۔

”اس لڑکی کا سانپ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا ہے۔ وہ اکیلے ہے مجھے اوپر جانے دو۔“

پھر اسے کھفت خیال آیا کہ کہیں وہ بھی تو ان تینوں کے ساتھ اس نامعلوم گھاٹ پر نہیں اتر گیا! اتودہ لڑکی کو اکیلا چھوڑ گیا۔؟! اس نے واڑھی والے کے کندھوں پر سے اچک کر اوپر دیکھا۔ ڈائینگ ہال کے دروازے تک آدمی ہی آدمی تھے۔ اب تو رینگ کے پاس بھی انسانی جسموں کی دیوار بن گئی تھی۔ اب وہ اس مقام تک نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جہاں اس کا خیال تھا لڑکی کھڑی ہے۔ مگر یہ اتنے لوگ کہاں سے آ گئے! وہ حیران ہوا۔ اوپر آٹھ دس کینوں میں زیادہ سے زیادہ سوڑھا سا مسکا سکتے تھے۔ ڈائینگ ہال کے اسٹاف کو بھی شامل کر لیا جائے تو پانچ چھ افراد اور بن گئے۔

تو پھر سینگڑوں نگے تیل پکاتے جسم کہاں سے آگئے۔! وہ خون سے کانپ گیا کہیں اسٹیئر ہی نہ ڈوب جائے۔!

”دیکھ رہا تھا..... ٹی.....“

پہرا سے سب اُپر بیٹھنے والوں کا خیال آیا۔ وہ ہوشیے کے گھروندے میں بیٹھا کہ اسٹیئر کو راستہ بتاتے ہیں طوفان آیا تو سب سے پہلے وہی متاثر ہوں گے! مگر اس وقت ان کا کیا حال ہے — ۱۹!

جس کلاس میں وہ سفر کر رہا تھا۔ اس میں سے اُپر جانے کے لئے کوئی راستہ نہیں تھا۔ یا اگر راستہ تھا تو اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُپر پہنچنے کے لئے سب سے خفیہ کلاس میں اُترنا پڑتا تھا — جب وہ اُپر چڑھنے کے لئے نیچے پہنچا تو اس نے درکلاس کے مسافروں کو کہیں دیکھا جو کوڑے کرکٹ کے ڈبیر کی طرح کڑی کے فرش پر اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ پیسے میں جھپٹانے کا لے بھگا مرد عورتیں اور بچے جو ہال میں کافی جگہ جمنے کے باوجود ایک دوسرے سے اس طرح چٹے ہونے لگے کہ اگر بلیغہ ہوئے تو ان کا وجود ہی ختم ہو جائے گا — ابھی وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اسٹیئر کی اصل زندگی میں لوگ ہیں کہ بچوں کے پیشاب پاخانے بوڑھوں کے بلغم اور جوان جسموں کی تیز بوٹے اسے اور کہیں کو فوڈ اُپر پہنچا دیا۔

اُپر بیٹھنے کے گھر میں بیٹھے اس شخص نے جو جوفی گھما رہا تھا اسے گور کر دیکھا اور اپنے سامنے سے کچھ کھا۔ پھر وہ دوسرا آدمی کہیں سے باہر آیا اور کہیں ایک طرف لے جا کر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگا — کیر نے بھی سب سے تعلقات قائم کر رکھے ہیں — اس نے سوچا اور دُور دروغتوں کے درمیان تنگ ہوتی ندی کے نوٹ لینے

لگا۔ ندی چر سکون تھی۔ خاموش پانی میں بہتے جل کٹری کے پودوں نے بھی جیسے زمین میں جڑ پکڑ لی تھی۔ کناروں پر کھڑے درخت بالکل خاموش تھے۔ صرف آسمان پر بادل تیر رہے تھے جو اتنے نیچے تھے جیسے ذرا سا اچک کر انھیں ہاتھ لگایا جاسکتا تھا۔ البتہ یہاں پہنچ کر دریا کا پانی دُور ہو گیا تھا اور کنارے بھی کہیں دُور بہتے دکھائی دے رہے تھے۔ بڑا شہر کی چھت ہے!۔ اس نے اپنے آپ سے کہا اور ہم سب مسافروں کے سروں پر کھڑے ہیں!! پھر وہ دُور رسوں کے درمیان چلتا ہوا سب سے آگے دُور کے سرے پر پہنچ گیا اور نیچے جھانک کر دیکھا۔ نیچے ایک کشتی سوئے ہوئے رسوں سے بندھی اٹھ کر کے ساتھ لٹک رہی تھی اور اس میں دو آدمی بیٹھے مٹھیاں بھر کر کھاتے اور مچھلی کھا رہے تھے۔ وہ جھکا تو ان دونوں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور منہ میں بھرے ہوئے مچھلی کے کاٹے زور سے ندی میں تنوک دیئے۔ وہ بچے بٹ گیا۔ اچھے لگا جیسے ان دونوں آدمیوں نے اسے دیکھ کر تنوک کا ہے۔ مگر کیوں!!

اب وہ لڑکی اور اس کا ساتھی بھی اُپر آ گئے اور اس کا ساتھی کبیر کو بیک گراؤ بنا کر اس کی تصویر تار رہا تھا۔ کبیر اس کے پاس آگیا تھا اور بنگال کی جامد گریبنوں کا ذکر کر رہا تھا اور اس لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جو اب کبیر کے قریب رینگ کے ساتھ بیٹھ گئے، سینہ اُبھارے، گردن کے ذرا سے خم کے ساتھ ٹھوڑی اُپر لی کئے سیاہ بال ہوا میں لہرا رہی تھی اور اس کا ساتھی تصویر کیسے کے لئے کبیر ہی سیٹ نہیں کر پا رہا تھا۔

اسے پھر رسوں سے بندھی ہوئی کشتی کا خیال آیا۔ طوفان آجائے تو یہی کشتی مسافروں کو کنارے تک پہنچاتی ہے۔ مگر ایک چھوٹی سی کشتی کتنے مسافروں کو کنارے

تنگ پہنچا سکتی ہے! اور اگر وہ خود ہی اٹ جائے تو —
 ”تم تو عیشۂ الٰہی ہی بات سوچتے ہو۔“

اس نے بچوں کے بل کھڑے ہو کر کالے بسا بندے گوشت کی دیوار پر سے نیچے
 جمنا تھا کہ شاید کبیر کہیں دکھائی دے جائے۔ گلاب اتنی تاریکی ہو گئی تھی کہ کچھ بھی نظر
 نہیں آ رہا تھا۔ سوائے ایک جسم کے جو اسٹیر کے انجن کے ساتھ سانس لے رہا تھا
 اور یہی سانس ندی کی لہروں کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئی تھی۔ انسانوں، اسٹیل اور دھات
 کی لہروں کے ایک ساتھ سانس لینے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسٹیر بھی چل رہا ہے
 اور اس کی رفتار میں بھی فرق نہیں پڑا۔ اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہی جیسے
 تاریک چروں کا جائزہ لیا اور حیران ہوا کہ اس عرصہ میں کوئی بھی گھاٹ نہیں آیا کہ
 طوفان گزرنے تک اسٹیل وہاں ٹھہر جاتا۔!! پھر اس نے دقت کا اندازہ لگانے
 کی کوشش کی۔ کیا دقت ہو گا۔؟ اس نے اس عرصے میں گزرنے والے تمام واقعات
 پر غور کیا۔ پھر سوچا کہ باہر بھی تنگ کالی رات برس رہی ہے، اندر ویسا ہی جیسا تنگ
 اندھیرا ہے جھگڑ کی خوشبو بھی ابھی تنگ نہیں آئی کہ سندھین آئے کی نوید ملتی ہو تو
 آنا تو رات کا پھپھلاہٹ پر بھی آتا اور پھر صبح — گھر اس کی گھڑی کہاں گئی؟ اس
 نے گھبرا کر اپنی دونوں کلاٹیاں آنکھوں کے ساتھ لگا لیں۔ شاید وہ کہیں میں
 ہی بھول آیا گھڑی ہوتی تو کم سے کم اسے دقت تو معلوم ہو جاتا۔ پتہ نہیں طوفان آیا تو اس
 کی گھڑی بھی مل سکے گی یا نہیں۔ اور اس کا باقی سامان؟ کیا سب کچھ غائب ہو جائے
 گا۔؟! — کبیر نے بہت دھوکا دیا۔ خدا جانے وہ اسے چھوڑ کر کچے کیوں بھاگ گیا۔
 کبیر جوتا تو وہ اس سے باتیں ہی کرتا۔ آگے بڑھنے یا واپس جانے کی باتیں۔

جوں جوں وہ آگئے بڑھتی گئی۔ واسے میں دانے بکھیرتی گئی کہ واپسی میں راستہ نہ
بمحل جائے لیکن جب وہ طویل اور کٹھن راستوں پر پہنچ کر ٹوٹی تو کوا سارے دانے
چگ گیا تھا۔ مگر میں تو راستے میں دانے بھی نہیں بکھیر سکتا! اپنی بے بسی کا
احساس کر کے وہ خوفزدہ ہوا۔ میرے آس پاس پانی ہی پانی ہے جو سارے نشانِ مٹا
ڈالتا ہے۔

اب اس کے کپڑے بھی پیٹنے میں بھیگ کر اس کے جسم سے چپ گئے تھے۔
اور اسے اپنے جسم سے بھی دوسرے جسموں کی بو آئے گی تھی۔ وہ کمرے کمرے تنگ
گیا تھا اور چاہتا تھا کہ کہیں تنواری سی جگہ بھی مل جائے تو بیٹھ جائے۔ اب تو وہ
اندھیرے میں گھپلتے ہوئے جسموں کے قدموں میں بھی بیٹھنے کو تیار تھا۔ مگر ان جسموں
کے پاؤں کہاں ہیں؟! اور میرے پاؤں۔۔۔ اس نے ہمت کر کے دایاں پاؤں
اوپر اٹھانے کی کوشش کی مگر دوسری ٹانگوں کی طرح اس کا پاؤں بھی کلڑی کے فرش
میں جم گیا تھا اور اس کی طاقت جواب دے گئی تھی۔

پھر وہ سرے پاؤں تک کانپ گیا۔۔۔ یہ طوفان کب آئے گا؟ کیوں نہیں
چمکتا۔۔۔ یہ کیسا عذاب ہے۔۔۔ اس نے جی کر کر کے ایک بار پھر کبیر کو آواز
دینے کے لئے منہ کھولا۔ لیکن ابھی وہ حلق سے آواز نکالنے ہی والا تھا کہ اوپر ایک
بلند رخ بلند جوتی اور سارا اسٹیمر لرز گیا، پھر تمام سکت آنکلیں اپنے غول سے ہلکی
پڑیں اور کان لمبے ہو کر کیبنوں کی قطار تک پہنچ گئے۔

”اس نے ندی میں چھلانگ لگا دی۔“

اس نے؟ کس نے؟! اس کون؟! تو کیا وہ میں تھا۔۔۔!۔۔! مگر میں نے تو

ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔

پھر اس نے زود سے دونوں آنکھیں میچ کر اور دونوں کان بند کر کے سینے کے پردے زود سے آواز لگائی۔

”کبیر — ہا.....ئی.....ای“

لیکن اس کے آس پاس کھڑے لوگوں میں سے کسی نے بھی اس کی آواز نہیں سُنی تھی۔

”ضوین“ لاہور

نوید انجم

ریپ

پہلے تو ایک ہی گھر تھا مگر جب جھگڑا احد سے بڑھا تو بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر دی گئی اور پھر جوں جوں وقت گزرنے لگا۔ نت نئے جھگڑے بڑھتے چلے گئے۔

ہرمین برآمدے میں مٹی کے تیل والا چولہا لے آگئی سوچ میں غرق مٹی مٹی۔ سر کے بال اُلجھے اُلجھے اور کبھرے ہوئے تھے۔ سر کا دوپٹہ رستی کی صورت بن کھار گردن کے گرد پڑا تھا اور کپکے فرش پر انگشت شہادت سے وہ بار بار لکیریں سی کھینچنے لگتی اور ایسے میں نظریں نکلتیں کہ بار بار دیوار پر جا پڑتیں۔

ابھی ابھی زمین ہوا اس کے پاس سے اُٹھ کر باہر گئی تھیں۔

وہ خوب جانتی تھی جو کچھ مٹی مودی آپا کے ہاں پک رہی تھی اس کا مطلب کیا تھا اور بے قرار میاں جس اُچھٹن سے نکلتے کو ہاتھ پاؤں مار رہے تھے اس کی نوعیت سے بھی آگاہ تھی۔ غضب یہ تھا کہ میاں انظم کے بعد اب جیسے ساروں کو انگر اسی کو رہ گیا تھا اور فکر بھی ایسا کہ اس سے کچھ بچھڑا تو یا ایسا گناہ تھا جو مرد ہو جا

تو جانور اسلام خطرے میں پڑ جاتا!

یہ جو سارے ہمدرد کھٹکھٹس ہیں گئے تھے اس کی ابتدا کہاں اور کیسے ہوئی اب وہ کیا کیا سوچتی۔ پیچ بوجھ تو جب سے اس نے ہوش سنبھالا یہی کا ناچوہی سمجھتی چلی آرہی تھی 'بات کی گہرائی میں کچھ اور جاؤ تو یہ پھنکارتی ہوئی سرگوشیاں اسی دن سے وجود میں آئیں جس دن اس نے آنکھ کھولی۔

مودی آپا تو اسے ناجائز اولاد سمجھتے تھے جب وہ بچوں نے ہی ایسا جانا تو پھر دیوار پر سے والے کیوں نہ ہاں میں ہاں ملاتے۔ ساروں کا گنا ہے۔ کہ اعظم میاں دلائی کیا گئے کہ گوری چڑی والی میم سے آنکھیں چار کر بیٹھے۔ اے وہ کیا جانے کھ کیا ہے اور وہیں اسلام کس چیز کا نام ہے۔ نماز نہ روزہ، زکوٰۃ نہ حج کسی بات کی تو خبر نہیں اور لے آئے گھوڑی کی نشانی اک لو تھڑے ایسی بھی۔ بیچ کی بات تو یہ ہے کہ بڑی ساری جائداد دہرائے میں پائی تھی۔ سو گھڑے اڑائے گئے، جو من میں آیا کیا روکنے ٹوکنے یا پوچھنے والا کون۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ خواہ مخواہ میں مانگ اڑاتا؟

کبھی بات بدل چھتے تو ساروں پر میاں اعظم کا بڑا رعب تھا، زندگی میں تو کہیں کسی نے چوں نہ کی۔ مودی آپا کہیں کبھی رانک جموں چڑھا کر کوئی تیز یا سڑا جلد کہہ دیتے تو وہ یوں نظر انداز کر دیتے کہ وہ اپنا سامنہ لے کر وہ جاتیں اور پھر منہ کاہنہ بدلنے کو جگ کرنے کی نشان دہی مگر پر دین کی پیدائش کے سو سال بعد ہی ستم یہ ہوا کہ اعظم میاں نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں اور بن ہاں کی بھی انگلیوں ہٹا چوستی رہ گئی!

ستمبر کا مہینہ واقعی ستم گر بن کر آیا۔

یوں بھی کو سنبھالنے والے بہترے تھے خیر سے ملکی چھو بھی اماں بھی نہیں مگر اس
نفسی سی جان کے ساتھ ڈھیر ساری باتیں لو کی چمک کچھ اتنی تیز تھی کہ ادھر ادھر
سارے آن اکٹھے ہوئے۔ قریبی رشتے داری جانے کو سبھی نے لیاقت بگھادی۔
ہر ایک اپنی پوری قوت سے چخا چلایا۔ بھانت بھانت کی بولیاں بولی گئیں۔ ایک
پڑھے لکھے لائق میاں نے اپنی سنگیم سمیت بچی کے سر پر ہاتھ بھی رکھ دیا۔
مگر قسمت کو کچھ اور سی منظور تھا۔ ان کی بیوی کو بناؤ سنگھار کچھ زیادہ ہی محو
تھا اور غرارہ پہنے کی تو اتنی شوقین تھیں کہ نئے فیشن کے غرارے دیکھ کر بھی
آپا کا منہ کڑوا ہونے لگا۔

جانے ان کے غرارے کو کس کی نظر کھا گئی کہ کچھ عرصے بعد وہ شو بہنا ادا جس
کی بند سٹیاں دیکھ کر دیوار پر سے والے صم صم جاتے رہوں ہی کی سازش کا شکار
ہو گئے اور ایک بار پھر ساروں کو پردہ کے سر پر ہاتھ دھرنے کی فکر دامن گیر ہوئی۔
فاطمہ آپا تنگ گود پھیلانے پھپھس پھپھس کرتی دھڑی آئی اور ایک وہ لاغری سا
بڑھا جو خود کو سب کا غلام کہنے نہ شکتا۔ ساتھیوں سمیت پہنچا بڑی بوا کا ہے کو
جینچے نہیں وہ بھی اس دوڑ میں شریک ہوئیں اور عالیہ بوا ساری باتیں ادا کا حساب کتاب
انٹکیوں پر گنتی اور اعداد و شمار سے خود کو جائز قرار دیتے دیتے ایک دم سے اتنے سادوں
کی ہڑ بونگ دیکھ کر کچھ اتنی بھال ہوئیں کہ مستقبل کے پروگرام کا خاکہ دھندلانے لگا۔ مہر
مرزا بھی اپنی سنگیم کا بازو دھماکے بھاگے آئے اور مودی آپا کو تھیکا دکھاتی سنگیم نے پڑوسہ
میں گانے کی کوشش کی تو نفرت سے منہ سکڑ کر آپا مودی نے اپنے طور پر پھڑکرتے ہوئے
یہ شمر ڈھا:

”اس غیرتناہید کی ہرمان ہے چیکہ“

انہوں نے گانے کی کوشش فوراً ترک کر دی۔ عالیہ بو کو البتہ ترس آیا اور کچھ دیر کو اس کا جی بھلایا اور جھرمی میں جڑی بو کو کہا: وہ بے چاری گانا تو الگ رہا، ایک شعر بھی سلیقے سے نہ پڑھ سکتی تھیں۔“

مرزا جی اپنے ہاتھوں میں اس کا ہاتھ تھامے اس کا جی بھلانے کی کوشش کرتے رہے، پردہ مزاج کی ذراتیز تھیں، اپنے پد چوٹا نہ برداشت کر سکیں اور میر تقی میر ساڈیں ہوئیں کہ اللہ کی پناہ!

پھر وہی اہاں کہیں کہہا جب بات برداشت سے باہر ہونے لگتی تو جج کر سمجھانے کی کوشش کرتیں مگر رفتار خانے میں کسی کی آواز سنی جاتی ہے؟

دیوار پر سے والوں سے تو کب کی ٹھن چکی تھیں وہ مزے سے تناؤ دیکھ کر کہنے اور زیر لب سکراہٹ قبضوں کے روپ میں ڈھکھکی بھر کر شروع اپنا صندوق کھول کر روپ دکھانے کے بہانے شال لاکر سامنے دیوار پر ڈال دیا کرتے اور ادھر لڑنے بھگڑنے والے وقفہ وقفہ سے چھپائی نظروں سے اس کو گھور کر رہ جاتے۔

اس شال کا بھی عجیب قصہ تھا۔

اس خاندان میں بڑی پرانی چلی آرہی تھی۔ یوں سمجھو کہ جب بھی اس گھر کا وارث پیدا ہوا اس کی پیدائش پر اسے اس قیمتی شال میں لپیٹا گیا اور اعظم میاں تک کو اس پر بڑا نام تھا۔

مگر جب بیچ میں دیوار گھڑی ہوئی تو دیوار پر سے والوں کے ساتھ اس شال کا تناؤ شروع ہو گیا اور جب اعظم میاں کی آنکھیں بند ہوئیں تو بھگڑا کچھ اور بھی بڑھ گیا۔

در اصل ستمبر کے مہینے میں جب ساہیوالہ کاظمیوں کی جدائی میں جمع ہو کر ایک بھائی تھا کسی کو دھوپ میں پڑی اس شال اور دو اور ضروری چیزوں کا خیال نہ رہا۔ کسی تو جیسے ان قیمتی چیزوں کو بھولے ہوئے تھے !

دیوار پر سے والوں کا جی لٹایا، سوتیلے جتنے نوکیلا ہوا کسی نہ کسی طرح اپنا حق تو جتایا ہاں سنا ہی ہے سو آؤ دیکھنا نہ تاؤ دیکھنا اور قیمتی چیزوں کے ساتھ شال بھی دیوار پر سے گھسیٹ لی۔ ادھر جانے کس کی نظر پڑی اور کوئی چٹایا "ارے ذرا لینا پکڑنا۔ وہ شال لے چنے۔"

عالیہ ہوا کا کنا ہے۔ ادھر کسی نے شال نہیں پکڑی ورنہ دشمن کیوں کامیاب ہو جاتے، وہ تو اتفاق سے اس طرف لگی ایک کیل میں شال اُلجھ گئی تین حصے وہ لے گئے ایک حصہ کیل سے لٹکا ٹھونڈا رہ گیا۔ اب کیل نہ ہوتی تو ساری شال ہاتھ سے گئی تھی ! مگر بڑی ہوا کا کنا تھا کہ انھوں نے شال گھسیٹتے دیکھا ادھر سے پلو پکڑ لیا۔ اور پھر وقتی طور پر تیز جوتے جذبات کو آسودہ کرنا چاہا۔

تو اب شال تب سے اسی حالت میں دونوں طرف والے لئے بیٹھے تھے تین حصے ادھر اور پھر اٹھا حصہ ادھر اور کوشش دونوں طرف سے برابر تھی کہ کسی ایک طرف پوری پوری شال آئے اور صندوق میں سما جائے۔

ابھی اسی کشمکش میں کچھ وقت گزرا تھا کہ دشمنوں کی نظر لگ گئی اور سر پر وہ عذاب نازل ہوا کہ جسے اب سارے یاد کر کے توبہ توبہ کرتے ہیں۔

بات کچھ یوں ہوئی کہ اعظم میاں نے جائیداد کی دیکھ بھال کو ایک منشی رکھا تھا۔ نوجوان سا گورا گورا خوبصورت سا بیٹھا، صبحی کو اس پر اعتماد تھا خاں میاں خاں میاں

کہتے کہتے سبھی کا منہ خشک ہوا جانا اور وہ بھی ہر ایک کے گنگے مسکین بنا ہی حضوری
کئے جانا مگر وہ بڑا کونیاں نکلا !

سبھی اس کی طرف سے بے فکر بیٹھے تھے 'یوں بھی اس پر عبور نہ کرنا ہی ہوتا تھا کہ
ساری جائیداد کی تفصیل وہ خوب جانتا تھا۔ زمینوں کی آمدنی ان کا خرچہ مزارعوں کی
بازیر میں اور دیوار پر سے والوں کی نعیدی نظروں کو گھوم کر دکھانا اسے سبھی کچھ خوب آتا تھا۔
ظاہر آپا سے لے کر عابدیوں تک اور بڑی برائے لے کر مرزا بھی اور ان کی سلیم سبھی ان
کی جانفشانی کے قائل ہو رہے تھے۔ اسے بلاتے پاس جھٹاتے حساب کتاب پوچھنے
حال احوال پوچھنے، شاہباشیاں دیتے اور یوں ان کا حوصلہ بڑھاتا چلا گیا۔

حوصلہ کھداتا بڑھا کہ پھر اس کا بھی گیارہ برس کی پردہیں کی حالت بڑھا کر تھا !
اس کا کہنا تھا کہ وہ تو اس جن ماں باپ کی بچی کا ہمیشہ سے خیر خواہ ہے۔ اس کی
پیدائش سے لے کر اس کے گیارہ برس تک کی ہونے کے سارے حالات وہ خوب جانتا
تھا۔ جو جو ستم اس ننھی سی جان پر کئے گئے اس نے دیکھے اور صرف دیکھے ہی نہیں اچھی
طرح سے جانے حتیٰ کہ کئی بار ایسا وقت بھی آیا کہ مرزا بھی نے خود ہلا کر اسے جائیداد
کی آمدنی میں حصہ دار بنانے کا ارادہ ظاہر کیا۔

میرزاں کا کہنا تھا کہ وہ بچکا مسلمان تھا۔ دیندار تھا اور ایسی دھاندلی اسے بالکل
پسند نہ آئی اور صاف انکار کر دیا۔

ایک بی بی کا کہنا تھا کہ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ اہل میں وہ بی بی کہ جسے گانا تو ایک
طرف رہا شعر چڑھنے تک سلیقہ نہ تھا۔ خان کی بڑی مداح تھیں اور یہ کہتے وقت ان
بی بی کی آنکھیں جھپٹیں تو بڑی ہوا کی باجھیں کھل جاتیں اور پھر پوتوں پر بڑی گہری اور

زہریلی مسکراہٹ چمکانے لگتی۔

قصہ مختصر یہ سمجھو کہ ایک دن جب اس نے اپنے اندر جھانک کر دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ اب اندرون خانہ ہیرا زبانی کے بعد وہ ہیرا ہم بات کا اہل بن چکا تھا۔

گھیار: برس کی پیردین جی کو کچھ آنتا بجائی کہ وہ بے اختیار چوگی

جس نے سنا دنگ رہ گیا۔ چہرے ہلکی ایسے پیلے پچک، اتنے اتنے سے منہ کلک آئے۔ لوجی دیکھ لویہ انجام ہوتا ہے بے اتفاقی کا، ہر دل اپنے آپ میں کڑھا اپنی اپنی استعداد پر غور ہوا اور سمجھو بے ہولے دن گزرنے لگے تو خان کو خوش کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔

پہلے پہل تو سچر ہی اماں تک نے کہہ دیا: "اے جو ہوا اچھا ہوا۔ میں تو پہلے ہی نجبا کئے دیتی تھی کہ ہوش کے ناخن لو۔ کیوں آپس میں جو تم بیزار ہو رہی ہو۔ پر میری کون سنتا ہے جو تیروں میں وال بیت کے رہی ہر اب بھی سنبھل جاؤ۔ چلو اب بھی کچھ نہیں گیا۔ دیر ہوئی اندھیر نہیں ہوئی؟"

لیکن پھر دیر کے ساتھ ساتھ اندھیر بھی ہو گئی!

سب سے پہلے یہ بات جس نے کی "اسے خود اپنے آپ پر اعتبار نہ تھا۔ ہے جے گیاد"

سال کی ناسمجھ کے ساتھ یہ ظلم!؟ توبہ! توبہ!

پھر طالع ہوانے سرٹھایا اور یوں بھی ان کا ذہن کمپیوٹر کی طرح حساب کتاب میں ڈرا ماہر تھا۔ جو جو دن گزرا وہ خان کے گھر میں جمع ہوتا دھن حساب کے نقطوں کی صورت ان کے ذہن میں ڈھالتا اور وہ ہر سب کے عین درمیان بیٹھ اپنی انگلیوں کے پردوں پر تجزی سے گنا کرتیں۔ "ایک دو۔ تین، ہزار لاکھ۔ لاکھ کروڑ۔ کروڑ"

لاکھ کر ڈکی باتیں سننے والے کہتے عالیہ بوا کا دماغ چل نکلا ہے اور خوب ہنستے مگر ہنسنے ہنسنے آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔

اسی دنوں کام کچھ اتنا پیچھا کھبے چارہ خان تنہا کیونکر سر انجام دیتا۔ سو اس نے ادھر ادھر نظر دوڑانی شروع کر دی۔

اُس کی نظروں میں آنے کو سب دوبارہ پر توڑنے لگے حالانکہ وہ ان سب کی امیدوں پر گھروں پانی بجانے کے بعد خوب کھل کھیلنے لگا تھا۔

سو ہی آپا دیو سیوں میں گھر کر دو ایک بار اندر چ کر آئی تھیں اور اب جائے نماز پر بیٹھی تاک بھوں چڑھایا کرتیں عالیہ بوا ابھی تک اپنے طور پر حساب کتاب میں الجھی بیٹھی تھیں بڑی بھاننا غمہ آپا کے سنگ مرزا جی کو دلایت خطا پر خطا کھنکارتیں دے تو کہیں کے میاں سے سارے رشتے مٹے توڑ کے مسند پار جا بیٹھے تھے، عالیہ بوا کہیں کہیں چوٹک کرتا یا کرتی تھیں کہ ان کے خرچے پورے نہیں ہوتے وہاں مانگ گیری کر رہے ہیں۔ اشد! اشد! دیکھ لو بولنے زانے کا سالہا پھر خاں بابا کے اور گردنٹی نہی خشکیں گھر ڈالنے لگیں، اسنی میں ایک نو جوان بہر کے کام کرنے پر امور جوار تک سک کا اچھا، جوانی کے خون کی لالی سانولے سے چہرے پہ سیٹھ کئی ایک کو وہ بڑا بھٹلا نظر آتا۔ بڑی بوا کو ایک بار اک ہمدردی بی نے کان میں جھونکا۔

”خان کے اجڑوں میں سے ہوگا“

کسی نے بولے سے سرگوشی کی؟ پردین بھی تو خیر سے جوان ہو رہی ہے؟

سبھی کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ یہ خاں بابا کیا کرنے لگا۔

پھر ادھر ادھر وہ چھ کچھ شروع ہوئی۔ معلوم ہوا نام تو کچھ اور تھا مگر تخلص بے قرار تھا۔ خون بھی گرم گرم تھا اور رہتا بھی ہر دم پارے کی طرح میٹھا اور تھلا۔ باہر کے کاسوں میں

بڑا ہوشیار اور خان بابا کے خلاف کوئی بات سننے کا تو بالکل روادار نہ تھا۔ جو کچھ کہنے کو کوئی آگے آتا تو جھٹ سے تھین کی استین چڑھا مقابلے کو تیار ہو جاتا۔
پچھلوں کے بارے میں تحقیق ہوتی تو خبر ملی کہ کسی سے کم نہ تھا۔ اینٹوں کے کسی پتھر کا تین تینا مالک تھا اور پھر کیا تھا سبھی کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے خان بابا نے پوچھنا کا بر تلاش کر لیا ہے۔

لیکن زمانہ کی رفتار دیکھو، ادھر بڑا ادھر آسمان بدل گیا۔

بات کچھ یوں ہوئی کہ مودی آپا کی ایک جاننے والی جو پندرہس سے آئی تھیں ایک دن دیوار پرے والے گھر گئیں۔ دراصل وہ شال کے جھگڑے کو پٹانے کی کوشش میں ہی پھیرے پے پھیرے ڈال رہی تھیں کہ وہاں سے یہ بات سن کر حیران پریشان سرسید ہو کر بھاگی بھاگی مودی آپا کے ہاں آئیں۔

مودی آپا اس وقت قرآن شریف کی تلاوت کر رہی تھیں۔

حیران پریشان بی بی سیٹھے پر ہاتھ مار مار کر وہ راز دہانے کی کوشش کرنے لگیں۔

مگر کب تک یہ کوشش ہوتی؟ پیٹ میں ڈھیر سارا درد اٹھنے لگا؟ اب مودی آپا کچھ سنو گی بھی کہ نہیں؟

”کاشے کو مری جاتی ہو۔ دیکھتی نہیں یہ آیت ختم کروں“

آے خوب دیکھ رہی ہوں میں اب تم یہ سلسلہ ختم کرنا اور میری سنو“

مودی آپا اس بات پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جائیں مگر ان بی بی کا چہرہ گواہی دے

رہا تھا کہ اس وقت جو بات تھی وہ کچھ زیادہ ہی اہم تھی۔ سو جلدی سے فاسخ ہو کر پچھے لگیں۔ کیا ہوا جلدی ہو لو؟

”یہ پوچھو کیا نہیں ہوا۔ اے بی بی پوچھو کہ پچھلے چہرہ برسوں سے کیا کچھ نہیں ہو رہا!!“
 اے ہمیں تو بس یہ خبر ہے کہ میاں بیقرار کو چینی کچھ زیادہ ہی پسند ہے سو بازار میں
 مستحاثوں کا بھاؤ۔۔۔۔۔“ وہ تیزی سے بات کاٹ کر بولیں۔ ”بس بوا تمہیں ہوا کیا ہے؟ کیوں
 کوئی کامینڈنگ بنی جا رہی ہو؟“

”تو پھر تم ہی بتاؤ دیر کیوں لگتی ہو؟ مودی آپا کا سانس پھول گیا
 کیسے بتاؤں تو بہ تو بہ۔“

”اے اب کد بھی چکو کیوں میرے دل کو دبا دے جاتی ہو؟“
 ”تمہاری قسم کس منہ سے کہوں! میں تو سنتے ہی دی بخود ہو گئی۔ بات کدں تو کیے؟“
 مودی آپا کو آگ لگ گئی میں کوں بس تمہاری یہ بات ابھی نہیں۔ خواہ خواہ مجھے
 کوفت پہنچانے لگی ہو۔ ابھی طرح خبر ہے تمہیں، مجھ سے یوں پسیلیاں نہیں بولیں جاتیں۔“
 ”اے بی بی وہ اپنی پردین کی بات ہے؟ وہ پھر روک گئیں۔“

”اللہ اب کد بھی چکو۔“ مودی آپا نے زح ہو کر کہا۔ ”تمہیں میری قسم؟“
 ”ہائے! ہائے!“ ٹھنڈا سانس بغیر وہ بی بی بولیں۔ ”بس یوں سمجھو کہ پردین کو خان
 نے کہیں کا نہ چھوڑا۔“

”اے؟“ مودی آپا نے چیخ ضبط کی
 کہنے والے نے تو قسم کھا کر کہا ہے کہ گیارہ برس کی بچی پر ہی یہ ظلم ہو گیا۔ اب تو خیر
 سے سترہ برس کی ہو گئی ہے۔“

”اے؟“ آپا مودی کی چٹکیاں پھیلیں۔ ”یہ بوجھوں۔ اللہ قسم؟ ایں سچ کو تمہیں
 میرے سر کی قسم!“

ان بی بی نے آنکھوں پر پتھر رکھ لیا۔ میں کس منہ سے کہوں اسے اعظم میاں کے بعد یہ
حشر ہونا تھا۔ یہی آیا۔ یہ کیا اندھیر ہوا؟

مودی آیا اس ظلم کا جان کر دل گئیں بلکہ یوں سمجھو کہ انہوں نے جس کسی کو بتایا وہ بھی
پھٹی آنکھیں بنے دانتوں تلے انگلیاں دبانا رہ گیا۔

”نکاح ہو جاتا تو پھر بھی تھا۔“ عالیہ بوا نے آنکھوں پر عینک جھاتے ہوئے کہا۔
”جے ہے معصوم پر یہ ستم! توبہ توبہ!“

یہ انکشاف سرگوشی کی صورت اُبھرا اور پھر شعلوں میں دھل کر پھیلنے لگا۔ سادہ میاں
پس پڑ گئی۔ سفید روٹی ایسے سرگھڑی بالوں بھرے سروں کے ساتھ جڑنے لگے۔ نظر آیا
دولتے بی بی، عالیہ بوا اور دوسرے سب جو خود آپس میں ٹھن پکنے کے بعد ٹوٹی ملا کے
موتیوں کی صورت بکھر چکے تھے اب اس آگ کی لپیٹ میں آئے کہ پلاسٹک کی طرح سکڑ
اور کھینچ کر دوبارہ ایک دوسرے کے ساتھ آن لگے۔ یہ انکشاف جیسے وہ دھاگہ بن گیا
جس نے دوبارہ انہیں ایک دوسرے کے قریب لا کر سی دیا۔

بہت سوچا مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ کریں تو کیا کریں۔ جے ہے مسلمان کے گھرمیں یہ
ظلم۔ یہ تو کافروں سے بھی گئے گزرے ہو گئے۔

پھر سب کے سب برقعے اوڑھ پھر بھی اماں کے ہاں پہنچے،

دہاں کا سال نہ پوچھو تو اچھا ہے۔ نالغہ آیا نقاب اٹھاتے پھینک پھینک کر دیں
مودی آپا کا مارے جھکیوں کے بُرا حال ہوا۔ وہ جو ہمیشہ مرد کی رائے کو ترجیح دیا کرتی
تھیں اس بُرے وقت میں پھر بھی اماں میں مردانگی ڈھونڈنے لگی تھیں، عالیہ بوا پودوں
کو لگی گن اور عینک منہ جاتے بے حال ہوئیں اور پھر بڑی بوا ایک نے دو چار انٹھپکائے

اور دوتے بی بی نے سرگوشیوں کا آغاز کیا۔

ہولے ہولے سب کا رونا دھونا مٹتے ہوئے لفظوں میں ڈھلا اور پھر بھی اماں کو بتایا گیا کہ بدنیت خاں نے معصوم کو زبردستی اپنی ہوس کا شکار بنا لیا تھا۔

ہر دن اس مظلوم پر نیا دکھ لے کر آتا ہے اور گئے ہیں کہ اپنے اپنے جھگڑوں میں بے حال ہو رہے ہیں۔

ان کا خیال تھا کہ پھر بھی اماں کو اس واردات کی خبر ہی نہ تھی۔

پھر بھی اماں کی آنکھیں غصے سے کھلیں اور تب انہوں نے بتایا کہ ”اری کھنونا بچے تو یہ سب معلوم ہو چکا ہے میں تو اس انتظار میں تھی کہ تمہاری آنکھیں کھلیں جنہیں کچھ سمجھ میں آئے تو پھر سب مل کر اس کے تدارک کا بندوبست کریں۔“

”تو پھر اب کیا کیا جائے؟“ کئی آوازیں بیک وقت اٹھیں۔

پھر بھی اماں دیر تک سفید سریر دایاں ہاتھ رکھے سوچ میں ڈوبی رہیں۔ اور نگے میں پڑی سفید موتیوں کی مالا کو بانیں ہاتھ کی انگلیوں سے مساتے وہ افسردگی سے سر ہلاتی رہیں۔

”میرا خیال ہے حقہ پانی بند کر داس کا“ نصیحاں بی بی پہلی بار دیں۔ انہیں حقہ چنے کا بھی شوق تھا۔

شبے وقوف نہ بن۔۔۔؟ سوئی آپا نے ڈانٹا۔

”اے تو کیا وہ حقہ نہیں پیتا؟“ عالیہ ہوائے معصومیت سے پوچھا تو پھر بھی اماں کا جی چاہا کہ اپنا سر پٹ لیں۔ میں کون محموداں؟ انہوں نے سوئی آپا کو مخاطب کیا۔ تو جی اتنی عالم فاضل بن رہتی ہے تو کچھ انہیں بھی عقل دی ہوتی۔!“

”اے چھوٹی ماں! مودی آپ کی آنکھیں نمبر آئیں۔ مجھے کیا کشتی ہو میں تو آپ پرنا
بیٹھی ہوں۔ یہ گھوڑیاں مجھ ہی کو کشتی دہنتی ہیں مگر یہ تو پردین کی سیدائش ہی سے اس
کے خلاف ہے۔“

”جیسی بچی بات کو جھٹلانا کیا۔ دوتے بی بی بولیں۔“ جب سے اعظم میاں مندر
پار گئے ہیں تو تم ہی نے تو مخالفت کی تھی۔۔۔۔۔“

”بس رہنے دو بڑی آپ“ مودی آپ نے تنک لگوا۔ ”گزری باتیں مجھے تو یاد نہیں جاتے
تم کون سی بات کہاں سے لے اڑتی ہو۔ بغیر سیاق و سباق کے خاک معلوم ہوتا ہے اہل
بات کیا ہے؟“

اب ناظمہ آپا بڑے ہنسے بیٹ پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ ”چلو جانے دو پرانے گڑے
مرد سے اکیڑنے سے فائدہ؟ اب تو یہ سوچنا ہے کہ مصوم کو اس کے بچوں سے کیسے نکالیں؟
”مصوم کی فکر کیسے ہے؟“ چھوٹی ماں نے فحشے میں سچ بات کی۔ ”سبھی کو اپنی اپنی
ہانڈی روٹی کی فکر ہے۔“

سبھی نے نظریں نیچی کر لیں۔

”اب غصہ خنوک دو چھوٹی ماں۔“ ناظمہ آپا نے التبا کی۔

”ورنہ ہم کہیں کے نہ رہیں گے؟“ عالیہ براہمت کر کے بولیں۔

خانہ ان میں جو مٹری مٹری ہو گی وہ الگ اور بو خنوک پکار رہی ہے وہ بیٹھ۔۔۔

ایک بی بی ابو بولیں۔

”میں اور کیا کر سکتی ہوں“ چھوٹی ماں نے کانپتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے پوچھا

”تم سب کچھ کر سکتی ہو۔ سب نہیں جانتے ہیں چھوٹی ماں۔“ ناظمہ آپا بولیں۔ ”او“

معصوم کو بچا لو؟

”میری رائے بھی یہی ہے۔“ دوتے بی بی ناک پہ انگلی دھر کر بولیں۔

”جے چاری پر بڑا ظلم ہو رہا ہے۔“ عالیہ بولا بولیں۔ ”میں خوب جانتی ہوں سوہاگل معصوم ہے۔“

”گیارہ برس کی عمر میں اسے بھلا دنیا کی اونچ نیچ کی کیا خبر تھی؟“ مودی آپا سر پر کپڑے کرچولے سے بولیں۔ ”وہ کس سے فریاد کرے؟“

پھر بھی اماں کا دل بھرا آیا۔

اب سب کے ہاتھ ہوتے سرود بارہ جڑ گئے اور پھر سرگوشیوں میں تباہی مچنے لگی۔

آخر میں فیصلہ ہوا کہ پنچایت بلائی جائے۔

اس فیصلے کے بعد معلوم ہوا کہ پنچایت بلوانا کوئی گڈے گڑیا کا کھیل نہ تھا۔ ناظمہ آپا مودی آپا۔ دوتے بی بی اور عالیہ بوا وغیرہ سے کئی ایک خفا تھے۔ کئی بڑے بزرگ ان عورتوں کے کڑوت خواہ جانتے بوجھتے تھے۔ اور بے حد اُلاں تھے۔ کئی ایک تو ان کی رگ رگ سے واقف ہونے کے ناطے خان بابا کو سچا اور مسلمان جانتے تھے۔

لیکن پھر بھی اماں ایک ایسی سستی تھیں کہ جن کے سفید بالوں اور بڑھا چکے ہی سب کو پاس تھا اور جب انہوں نے ان عورتوں کا ساتھ دیا تو کئی بزرگ ان کا اعتبار کرنے لگے۔ اسی اثنا میں ناظمہ آپا کا انتقال ہو گیا۔ تو کئی ایک ہمدردی میں ساتھ دینے لگے۔

ادھر بے قرار میاں کو جب اس سازش کا علم ہوا تو خان بابا کے کہنے کے مطابق غلو نے ان کا توڑ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ اچھے بھلے مرد کے منہ کو عورتیں آنے لگی ہیں غصہ غصہ

اصل سچ بات یہ ہے کہ بے قرار میاں کو اپنے مالک پر پورا اعتبار تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ دین ایسی معصوم جس کی بدولت وہ ہر طرح سے صاحب الارائے بنا ہوا تھا خاندان کا کسی عظم کا شکار نہیں ہو سکتی۔ ادھیڑ عمر کا مرد اور اتنی سی بچی۔ قبر میں پاؤں ٹکوانے والا اپنی عاقبت دلوں خراب کا ہے کو کرنے لگا۔

پنچایت جلوائی گئی۔ خوف شروع ہوا۔ بڑے جسے حمایتی آئے دونوں طرف سے بڑی بڑی تقریریں جوئیں اور جب پھر بھی اماں نے صاف صاف کہا کہ ان کو یقین ہی نہیں بلکہ اس بات کے شواہد بھی ہیں کہ خان بابا معصوم پر دین کو اپنی ہوس کا شکار بنا رہا ہے۔ تو یوں محسوس ہونے لگا جیسے سب لوگ خان بابا کے مخالف ہیں اور سب ہی حق کا ستھدیں گے۔ پھر بحث شروع ہو گئی۔

خان بابا بھاگے پھرتے سب کو گلاب کے پھول پیش کرتے۔ بے قرار میاں نے ان کے خلاف عاید کردہ الزامات کے جواب دیئے اور گرما گرمی میں بحث کا اختتام ہوا۔ بالآخر پنچایت نے آخری فیصلہ نام شروع کیا لیکن ابھی آغاز ہی ہوا تھا کہ بھلی نفل ہو گئی تب لائیں کی روشنی میں پورا فیصلہ سنا گیا جسے سستے ہی مودی آپادھاڑیں ملاد کر رونے لگیں اور پھر ان کے رونے میں عالیہ بوا بڑی بوا دوتے بی بی اور سب ہی نے ساتھ دینا شروع کر دیا۔ رو رو کر نالہ آپا یاد آئیں۔ اچھا ہوا جو اس بڑے وقت کا منہ دیکھنے سے پہلے آنکھیں بند کر گئیں۔

ایک پھر بھی اماں تھیں کہ خاموشی سے سینے میں اُبلتے ہوئے جذبات و باکرو گئیں اور آنکھوں میں ایک ذرا سا آنسو آیا تو اسے آنکھوں نے ضبط کر لیا اور لائیں کی جلتی ہوئی تہی کو گھور کر دیکھنے لگیں۔ اس وقت منہ سے کچھ کہنا بیکار تھا۔ وہ جانتی تھیں اس

زمانے میں سونے کا ذرہ بھی سوریج بن گیا ہے !!

ابھی خان بابا کے ہاتھوں زخم کھاکر کوئی سنبھلا بھی نہ تھا کہ ایک اندھ ظلم ہو گیا۔

دیوار پرے والوں نے شال کے تسانے پر مشتعل ہو کر پردین پر حملہ کر دیا !!

غور سے سوچو تو یہ خساروں بڑھا کہ خان بابا کے ہاتھوں زخم خوردہ پردین بدن بدر
نڈھال ہو رہی تھی اور شال والے جھگڑے کی وقعت قدرے کم ہونے لگی تھی کہ ایک روز
دیوار پرے والوں نے شور مچا دیا کہ پردین دیوار پر سے چھلانگ لگا کر منڈق تنک پہنچی اور
ابھی اس کا ڈھکنا اٹھا کر شال باہر نکالنے لگی تھی کہ انہیں خبر ہو گئی۔ سواغفوں نے اسے
مارنا پینا شروع کر دیا۔ اس کی دل و دھنیں ٹس کر اس کے حاسی آگے اور دیوں جھگڑا بڑھا
مگر جانے والے جانے کہ شال کے انتہائی قیمتی ہونے کے سبب ہر دو فریق کے
حاصل کئے ہوئے ہیں اور اب پردین کو نڈھال دیکھ کر دیوار پرے والے موقع
سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے انہیں اس طرف ہونے والے واقعات کی ساری خبر
تھی۔ سو شال کا چوتھا حصہ بھی مل جائے تو اور کیا چاہئے۔

شال کا جھگڑا سب کے لئے انتہائی اہم تھا۔ سو ساری بہادری نہا پنے اپنے

جھگڑے بھول کر ایک جان ہو کر دیوار پرے والوں کا مقابلہ کیا۔

سادوں کا کہنا تھا کہ سب ہی نے مقابلے کا حق ادا کیا اور پھر انہی دنوں میں

بے قرار میاں کو بھی معلوم ہو گیا کہ کتنے والے غلط نہیں کہتے تھے۔ خان بابا واقعی اس
معصوم پر ظلم کر رہا تھا۔

یہ خبروں ہوئی کہ زخمی پردین سترہ گھرے زخموں کے مارے کو ہستی پہنچا

پر ڈی تھی کہ میاں بے قرار ڈاکٹر سے اس کے لئے دوا لے کر آئے اور اندر صحن میں

اگر دیکھا کہ سانسے ٹکڑے کا دروازہ بند ہے۔

دھکا دیا دروازہ کھل گیا مگر

وہ دیکھتے ہی چلا کر قدم پیچھے کو ہٹے۔

خان بابا بے خودی کے عالم میں دنیا و مافیہا سے بے پرواہ جلدی دارو کے نشے

میں زخموں سے چور نازک سے بدن پر ٹھیکا ہوا تھا۔

”خفی اہم فریاد میں ڈوب رہا تھا“ مجھے تنگ مت کرو بابا“

”تنگ کہہ کر تا۔ تم تو میری جان ہے۔“

”تم نے کیا کیا ظلم نہ کئے ہیں، بسکسی سسی بھری“ اب تو کچھ خیال کرو۔“

”ہم تمہیں خون و جگر سے پاتا، کیوں گھبراتا؟“ خان بابا بولا

”مجھے چھوڑ دو۔“ اس نے کسمسا کر اپنے آپ کو سینٹا جابا، پھول ایسے چہرے پر

بالوں کی لٹ بکھری پڑی تھی اور سینے کے اُستبار پر دو سفید کبوتر اپنی اپنی پیاز کی چوٹیوں

چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ”مجھے چھوڑ دو خدا کے لئے!“

بنے قرار مہیاں کا مارے غصے کے بُرا حال ہو گیا۔ سارے جسم کا گرم گرم خون پارے

کی طرح چہرے پر آیا اور اُردو خساروں پر پھلنے لگا، مسٹیاں بھینچ کر انہوں نے زور سے یا

علی کا غرو لگا یا تو خان بابا کا سارا جسم کانپ گیا گھبرا کر اس نے ہر دین کو بھٹ دیا اور

پلٹ کر بغیر ارمیاں پر حملہ آور ہوا۔

دوروں کو لڑنا دیکھ کر پوری سسکیاں لینے لگی اور اپنے شیم پر سہ جسم کو جس پر بڑے بڑے

زخموں کے منہ کھلے تھے۔ وہاں اپنے کی کوشش کرتی کرے کے کونے میں سٹ کر لالہ لالہ

جلدوں والی کتابوں کی آڑ میں چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔

لڑائی ہوئی اور خوب ہوئی مگر بقیہ درمیاں کے ہاتھوں میں صرف دوا کی شیشی تھی اور خان بابا نے لپک کر کرے کے کونے میں پڑی سمند پار بنی بندوق اپنے دائیں ہاتھ میں اٹھالی اور بائیں ہاتھ میں وہ دوائی پکڑی جو ابھی پچھلے دنوں ایک مزاح نے اسے بطور تحفہ پیش کی تھی۔

ظاہر ہے شکست بقیہ درمیاں ہی کی ہوئی تھی۔

روال سے ماتھے سے ہار کا پسینہ پونچھتے وہ اس گھر سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوئے تو راستے میں مودی آ پا مل گئی۔

دیوار پرے والوں کے ہاں جانے والی بی بی سے سارا حال سن چکی تھیں۔ بڑی طنز سے مسکرائیں، برقعہ کی ادٹ سے سلام کیا حال پوچھا اور یوں گویا ہونے سے بدل کہاں سے لیا۔ بڑا قیمتی معلوم ہوتا ہے۔

وہ کچھ نہ بولے تو پھر کہا کہ میاں ہم تو پہلے ہی جانتے تھے تمہارا یہ حال ہوگا!

ادھر بھی ابھی اماں تھیں کہ سارا حال سنا اور ضبط نہ کر سکیں پہلے ہی نیمہ ردہ پہن رہی تھیں۔ اب جو ہر طرف سے ہشتی ہوئی سرگوشیوں کی چھنگاروں میں گیسویں تو دل ہی دل میں پردین کو ظلم کے شکنجے سے بچانے کی آرزو نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند دیں۔

پھر بولے بولے دن سرکٹے چلے گئے۔

پردین نیم جان سی کمزور کمزور پہلے چہرے کے ساتھ اٹھ کر برآمدے میں آن بیٹھی مٹی کے تیل والے جوتے لٹھا کر خان بابا کے بیٹ بھرے کا سامان تیار کرتی اور کھانسی کھانسی کر بے حال ہو جو جاتی اور بچے فرش پر ڈھے جاتی۔

دیوار پرے والے خوش ہو ہو کر لڑ رہے تھے کہ پھر شا ان کے ہاتھ بھی ایک پردین کی

لڑکی اگنی ہے جو زخموں سے چور بھوک کے مارے بکتنی آہیں بھرتی رہتی ہے اور وہ جس کدشال کے ذریعے اگلے زخموں کو ڈھانپنے کی کوشش کرنے کرتے تنگ آ چکے ہیں۔

مودی آپا کو یہ سن کر عالیہ بوا بولیں: ”میرا تو خیال ہے اب اللہ اللہ کیا کروں ہر وقت حساب کتاب کرتے رہنے کی عادت نے دماغ شل کر کے رکھ دیا ہے۔“

پر مودی آپا کے تو عزائم ہی کچھ اور تھے: ”ابھی سے جی بار بیٹھیں؟ تم نے ساتھ نہ دیا تو کون ہاتھ تھامے گا۔؟“

”اے اب تو میاں بقیار بھی تمہارے ساتھ ہیں۔“

”لو اور سنو: مودی آپا اتنے پر ہاتھ رکھ کر بولیں: ”مجھے تو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتا ہوا“

”اے وہ کیوں؟“

”اے بوا۔ مجھ تو اس کی یہ یعنی پسند کرنے والی عادت بالکل پسند نہیں غضب خدا کا زیادہ چینی کھاؤ تو شکر کی چاری ہونے کا احتمال رہتا ہے۔“

”کمال ہے مودی آپا۔“ عالیہ بوا بولیں: ”پر میں تو غصہ کبھی ہوں۔“

”تھکاوٹ کی بات چھوڑو“ مودی آپا ہمدردی سے بولیں: ”اے میری بازو تو اس گنگار کے لئے لو۔ اللہ مدد کرے گا؟“

انہوں نے گنگار کے لئے کیا لینے تھے۔ وہ تو اللہ نے ایسا سامان کر دیا۔

بقیاریاں کا قویہ حال تھا کہ گھر کے بھیدی تھے اس ڈر سے کہ کہیں لنگاؤ نہ ڈھاریاں خان باپ نے وہ ایک بابڑا کراندر ہی اندر معاملہ طے کرنا چاہا مگر پارے کی طرح چھلکا دل تھا۔ کہ ہر لمحے اپنی بے عزتی کا انتقام لینے کو سوچا کرتا۔ یوں بھی دل کو پر دین اتنا بھائی تھی کہ اب سوائے اس کے کچھ اور سوچتا بھی نہ تھا۔

وہ مسکرم سی صورت، غم اور دکھ تلے زرد و زردیسی، نوخیزی کی چمک اور بجتی ہوئی لاکھ
تلے انگاروں ایسی آنکھیں۔ لمبی لمبی مگر اجڑی ہوئی پلکیں اور سوکھے سوکھے سے ہونٹ
جن کی بناوٹ اپنی مثال آپ ہے۔ بیقرار میاں کے زمین میں اس کا ہر انداز جھلک
رکھنا اور چھپ جانا ان کی بیقراری بڑھنے لگی۔

یوں بھی جب تصور ہی تصور میں وہ پردہ کے سر پہ دوپٹے کی جگہ پوری مثال
اڑھسی دیکھتے تو بے اختیار دل سے ہر ک نکل جاتی۔ جس کچھ اور بھی نکھر جاتا۔ !
گھر کا بھیدی لڑکا ڈھانے پر کمر بستہ ہو گیا بے قرار میاں نے باقاعدہ خان بابا
کی حرکتوں کی ٹوا یعنی شروع کر دی اور پھر دہاں کے واقعات کا جب اپنے خاص انداز
میں ذکر شروع کیا تو جو شناسا بس سنتا ہی رہ جاتا خان بابا کے ڈھول کے پول کھلنے کی
دیر خنی کہ دھاگوں کے گولے کی طرح وہ کھلتے چلے گئے۔

شال کے جھگڑے میں بیقرار میاں نے جو کردار انجام دیا تھا وہ سب کی نظروں
میں تھا۔ سوائے اس ایک بی بی کے جو دیوار پر سے والوں کے ہاں آجا کر جھگڑا پٹاتے
پٹاتے جھگڑے کی شدت میں اپنی سٹی گم کر چکی تھیں۔ سب ہی سڑکھنوں پر بیٹھانے
لگے تھے۔

بیقرار میاں کی گوششیں رگ لائیں۔ خان بابا کے خلاف ایک طوفان تیزی سے
اٹھا اور پھر جیسے چاروں طرف سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

ادھر بے قرار میاں کی پاٹ دار آواز تھی کہ غرے پر غرہ لگ رہا تھا۔

ادھر ناظمہ آپا کے جانشین موری آپا کے ساتھ آئے۔ عالیہ بی آئیں درتے

بی بی لک لک کر مشورے دینے کو موجود ہو گئیں نصیراں بی بی تو اپنے سمیت

بیقرار میاں کی مدد کو آئیں۔ اور تواد اصغری خانم جو کسی زمانے میں خان بابا کی معتقدوں میں تھیں، کیا چٹھا جان کر اپنے میاں سمیت بیقرار میاں کی مدد کو آئیں۔

بڑی بوا، بڑی بی، بڑی پودھلین اور سب ہی دوسرے سردوں نے اٹھا اٹھا کر چلانا شروع کر دیا، بقول بیقرار میاں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جنگل میں شیر کے مرنے پر ہڈیاں سے کثیرے کھوڑوں نے طیفار کر دی ہو۔

اسی طیفار میں خان بابا کا دم گھٹ گھٹ گیا۔

اک صبح سب کو پیغام آیا، میزوں کے گرد بیٹھ کر دعوت اڑانے کی درخواست بہنوں کے منتقنوں میں قسم قسم کے کھانوں کی جھاک اٹھی، سو دی آپا سمیت کئی ایک مگر بیسیوں نے جلدی جلدی تھے سوٹ سلوائے، رنگ برنگ دوپٹے اوڑھے اور بے سوچے سمجھے دعوت میں شریک ہونے کو بھاگے۔

نہ گئے تو ایک بیقرار میاں اور ان کے رفیق لاثانی۔

دعوت سے بھی کوئی بھرم نہ رہ سکا تو ایک صبح سو دی آپا یہ جان کر دم بخود گئیں کہ خان بابا ہتھیار ڈال گئے۔!

”خان بابا بھاگ گیا؟ ایک ساتھ کئی آوازیں اٹھیں۔“

جانے کہاں گیا، کوئی گستا اپنے شرمیلے واپس بھاگ گیا۔ جہاں سے غیور تھا وہیں پر خاک سمانے کو چل دیا۔ کہاں گیا کہھر گیا کب گیا کے شور میں عالیہ بوا کو فک ہوا کہ وہ گیا تو خیر اسے جانا ہی تھا مگر اب پردہ میں کہاں ہے؟

سارے کے سارے برقعوں میں لپٹے لپٹائے شالیں اوڑھے، رنگیں دھڑوں کو لہراتے پردہ میں کے سر پہ اپنے اٹھ دھرنے دوڑے۔

مگر گھر کے باہر ہی روک دیئے گئے۔

خان بابا جاتے جاتے اپنے ایک بھائی زکریا کو پردوں کے پہرے پہنچا دیا تھا!!
گھر کی دلیز پر قدم دھرنے کا سامنا پورا بھی نہ ہوا تھا کہ بیٹے میں گھٹ کر رہ گیا۔
کونوں پر ہاتھ دھرے منہ ٹٹا کر کھڑے ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ جو بوڑھی بھاتی تانے
انہیں روکے ہوئے کہہ رہا تھا: "فکرت کرو۔ پردوں خیریت سے ہے۔ ہم اس کی مدد کرے گا!"
غالبہ بڑانے وہیں پر ہاتھ اتھا تمام لیا اور صاف کہہ دیا: "اے سودی آپا! مجھ میں تو
اب بالکل بہت نہیں۔ میں تو گھر چلی۔ اللہ اللہ کرنے کے دن آگئے۔"

صغریٰ خانم نے فوراً ہی ساتھ دینے کا ارادہ ظاہر کیا مگر سودی آپا کی سرخ شوش
آنکھیں دیکھ کر فوراً ہی توبہ توبہ کر کے دوبارہ ہاتھ تمام کر کھڑی ہو گئیں۔

یوں بھی ابھی انہیں اس خاندان میں قدم دھرنے کا دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ کہ
توبہ توبہ کر لیتیں؟

باہر تو یہ حال۔ اور اندر صحن میں پردوں مٹی کے چولہے کے پاس مٹی تھی۔

صبح سویرے کا وقت تھا۔ سورج ابھی نکلے کو تھا۔ جب پہلی کرن پھوٹنے لگی تو
سامنے اس دیوار پر پڑے گی اور پھر سارا گھر جگمگا جانے لگا۔

پہلے تو ایک ہی گھر تھا۔ مگر جب جھگڑا احد سے بڑھا تو بیچ میں ایک دیوار کھڑی
کر دی گئی اور پھر جوں جوں وقت گزرنے لگا بیت نے جھگڑے بڑھتے چلے گئے۔ ابھی
ابھی زینت بوا اس کے پاس سے اٹھ کر باہر گئی تھیں۔

انہوں نے اسے سب کچھ بتایا تھا۔ سودی آپا کے ہاں سارے جمع تھے۔ سب
ہی اس کے بارے میں پریشان ہو رہے تھے مگر اس کے دل میں کیا ہے کوئی بھی تو

پرچنے نہیں آتا تھا۔

بچے فرضِ برائگشتِ شادیت سے اٹھی سیدھی لکیریں کھینچتے اسے سب کے چہرے یاد آ رہے تھے۔ ان سب کے جو اس کے ہمدرد تھے اور ان سب کے جو ہمدرد کسونا چاہتے تھے، مگر یہ کیسی ہمدرد تھی کہ ان کے چڑھتے سورج کی روشنی کو نہیں بھی گلا روپ دھا کر آتی تھیں۔

ابھی ابھی زینت ہوا سے بنا کر گئی تھیں کہ نوکیلا خان نے فریاد کیا: بڑائی تھی اور وہ اس کی قسمت کا فیصلہ کرے گی۔

فیصلے کے لئے بڑے زور خود سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ بیخبر آدمیاں سے لے کر مودی آپانک اپنا حق جانے کے لئے بھاگ دوڑ میں ہیں۔

جولے کے قریب اُلجھے بالوں کو سنوارتے ہوئے بھڑیوں نے سامنے دیوار پر دیکھا۔ ابھی تک سورج کی پہلی کرن نہ جھلکائی تھی۔

اسے اس کرن کا انتظار تھا جو واقعی سنہری اور روشن ہوتی ہے!

”آدبِ لطیف“ لاہور

ما تم یک شہر آرزو

ہال میں دبی دبی سرگوشیاں مکتیوں کی جھنجھناہٹ کی مانند ڈوبتی ابھرتی ہیں۔ کبھی کبھی کسی میز پر سے کوئی تہقہ گرجتا اور پھر اپنے اچانک پن پر شرمسار جلد ہی دھوئیں پاؤ کافی کی ملی جلی خوشبو میں غائب ہو جاتا ہے۔ ابھی پردہ اٹھنے میں کچھ دیر باقی ہے۔ میرے سامنے کی کرسی پر بیٹھایہ شخص جو انتہائی انہماک کے ساتھ پائپ پیئے میں مصروف ہے۔ جیسے دنیا میں اس کے لئے اس سے زیادہ دلچسپ اور اہم کام کوئی نہیں۔ یہ میری بہن کا دلور ہے۔ میں اس کے پائپ میں انہماک اور اپنے وجود سے عدم توجہی پر چپکے سے دل میں مسکراتی ہوں۔ تو یہ طے ہے کہ تم عورتوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ تمہارا خیال ہے میں تمہاری آنکھوں کی زبان نہیں پڑھ سکی۔ خوب! قاسم میاں آؤ تمہیں ایک زان کی بات بتاؤں بہنو کی تم نے کبھی شکاری کتوں کو دیکھا ہے جب وہ اپنے نیتھے ٹھچلا کر ہوا میں اپنے شکار کی خوشبو سونگھتے ہیں اور کس قدر جلد اپنے شکار کو جالیتے ہیں۔ عورتیں! اپنے شکار کو ان سے بھی جلد پہچان لیتی ہیں ایک

پہلی نظر میں وہ مرد کی آنکھوں میں اُتر کر اپنا مقام تلاش کر لیتی ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے میں میز پر آگے کوچھک کر اُسے یہ بات بتاؤں اور اس کے منہ پر ہنسوں مگر سیاں میں اکیلی نہیں۔ میرے دائیں ہاتھ کی کوس پر بیٹھی عورت جو آگے کی طرف جھک کر بے وجہ لہجے میں کوئی گفتا کہہ رہی ہے، میری بہن ہے۔ میں اس کے چہرے کو پل کی پل غور سے دیکھتی ہوں وہاں دن بھر کے واقعات کا ہلکا سا سایہ بھی نہیں۔ یہ اس کا "پبلک فیس" PUBLIC FACE ہے، ابھی کلب آنے سے گھنٹہ بھر پیشتر یہی عورت ایک چھوٹی سی بات پر اپنے خاوند سے جھگڑی تھی اور دونوں نے اتنا لڑائی تلخ لہجے میں ایک دوسرے کو کھری کھری کہہ سنا لی تھیں۔ مگر اب وہ چہرے پر مسکراہٹ طاری کئے اپنے خاوند سے یوں باتیں کر رہی ہے جیسے مدتوں سے ان میں لڑائی جھگڑے کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اور بائیں طرف بیٹھا مرد جو سنجیدگی سے اور دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہا ہے، میرا بہنوئی ہے میرا جی چاہتا ہے میں اس کے کان میں سرگوشی کروں۔ کیا آپ نے میری بد مزاج بہن کو معاف کر دیا نا صبر بھائی، مگر اس کے چہرے سے ایسا لگتا ہے جیسے سامنے بیٹھی عورت ہی اس دنیا میں اس کی واحد دلچسپی ہے۔ اسپرنگ دار دروازہ بغیر کسی شور کے کھٹنا بند ہوتا ہے۔ میز پر تقریباً ساری بھر چکی ہیں، غیر ملکبوں نے اب سارے آداب پس پشت ڈال کر اُنچے اُنچے قہقہے لگانا اور تیز تیز باتیں کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہال کے وسط کی ایک میز ابھی تک خالی ہے اور پردہ اٹھنے میں چند منٹ باقی ہیں۔ اچانک میری بہن کسانا اُدھوری چھوڑ کر دروازے کی طرف دیکھتی ہے۔ اس کے چہرے کے تاثرات ایک لمحے کے لئے بدلتے ہیں مگر پھر وہ خوش باشی اور بے فکری کے ساتھ اپنے خاوند کی طرف نظر رہا

کر لیتا ہے۔ میں اپنی دونوں کہنیاں مینہ نہ ٹکا کر گئے کی طرف جھک جاتی ہیں میں مریح
میں پہلی بار بیٹے ڈانس دیکھ رہی ہوں اور اُسے پوری طرح دیکھنا اور اس سے پورا
لطف اندوز ہونا چاہتی ہوں۔ مگر میرے سامنے کی مینہ آفریدی کا بڑا سا سر ہے جو مریح
رقاصہ کی بجائے سلسلہ کے چہرے کا طواف کر رہا ہے۔ میں منظر کی آستین کو ہلکا سا جھٹکا
دے کر اسے مخاطب کرتی ہوں۔ "آفریدی کی عمر کتنی ہوگی۔ منظرہ باجی۔" وہ ناگواری سے
مجھے گھورتی ہیں۔ "یہ تم ڈانس دیکھنے کی بجائے لوگوں کے زائچے کیوں بنا رہی ہو؟
خفت مٹانے کو ہنس دیتی ہوں اور پھر ایک دوسرے شخص کے گانوں سے اپنے تھمتے
کو ہال میں اُبھرتا، گونجتا اور پھر دوبارہ تباہی مچاتی ہوں، قاسم گردن موڑ کر مجھے دیکھتا ہے۔
پریشان سی نظر کہ آخر ہنسنے کی کیا بات تھی؟"

مصری رقصہ کا نیم عریاں جسم دو دو حیارہ شینوں میں جھگکا رہا ہے۔ اس کے بیاہ
بال اس کے شاندر پر بکھرے ہوئے ہیں اس کے جسم میں بلا کی پھرتی ہے مرد اپنے
ہاتھوں میں چلتے سگرٹ ٹنگ ٹھلا بیٹھے ہیں میرا جی چاہتا ہے میں اس وقت تمام
کے برابر کی نشست پر ہوتی اور اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتی۔ ایک نیم عریاں جسم
رقص میں۔ ہے مجھے مصری رقصہ کا رقص بالکل بھی پسند نہیں آیا۔ میں کوئی موسم نہیں
لیکن شبانہ زندگی کی عریاںیاں دیکھ کر مجھے انتہائی صدمہ پہنچا ہے، آج سے پہلے کبھی کسی
انسان میں بھی عورت کو اتنا ذلیل نہیں کیا گیا۔ عورت پہلے حرم میں ناچی، پھر غلاموں
کی منڈی میں ناچی، لیکن اب۔۔۔ اب عورت ہر جگہ عریاں ہے۔ ہر شے پر، ہر شہر
میں عورت ہے اور عریاں ہے۔ یہ عورت کا سرا سر تجارتی وحش استعمال ہے میرے منہ
کا ذائقہ انتہائی گڑوا ہوا جاتا ہے۔ میں اپنی توجہ ہٹانے کو سلسلہ کے چہرے کی طرف دیکھتی

ہوں پچیس پچیس کے لگ بھگ ایک خوب صورت چہرہ اس کے چہرے کا حسن پرکار
 پرکار کر اس کے ایرانی نسل ہونے کا یقین دلاتا ہے میں نے اسے کل سہ پہر میں روڈ پر
 دیکھا تھا۔ وہ سفید وصال ایک بازو پر ڈالے دوسرے میں پرس شکاٹے بڑے مزے
 میں اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے اپنا سر خاصہ چونکا دینے کی جھنجک اُپر
 اٹھایا ہوا تھا۔ جیسے اسے اپنے ارد گرد چلتے لوگوں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ جیسے اس
 کا مقام وہاں آسمان کی وسعتوں میں تھا تب غلطی نے مجھے بتایا تھا کہ یہ ڈاکٹر سلمیٰ ہے
 آفریدی کے پاس ایک VACCINATOR تھی اس پر آئی ہے۔ اور آفریدی نے
 اس پر ایک نظر ڈالتے ہی اپنی بیوی کی طرف دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا آج کا یہ اس
 بات کی پوری گواہی دے رہا تھا۔ مصری رقاصہ اپنا رقص ختم کر کے جا چکی ہے۔
 آفریدی سلمیٰ کی طرف دیکھ کر کچھ کہہ رہا ہے اور وہ شرمیلی سی ہنسی ہنس رہی ہے جیسے
 میں اس کی گالوں میں نمٹے نمٹے سے گرے چڑھاتے ہیں۔ قاسم نے اپنی نشست کا رخ
 ٹھیک کر لیا ہے اور میز پر پائپ رکھ کر جیب سے تمباکو کی ڈبیا نکال رہا ہے۔ ناصر مصری
 رقاصہ کے رقص کے بارے میں منظر کو کچھ بتانے کی کوشش کر رہا ہے غیر ملکی جن میں
 زیادہ تعداد امریکیوں کی ہے مل کر غاضب اور کمر کر رہے ہیں۔ فساد صوبہ میں اور کافی کی خوشبو
 سے بوجھل ہو رہی ہے۔

دزانی پر دو گرام بسٹ نکال کر پھر اسٹیج کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے اب مصری
 حسینہ عربی کا ایک گیت سنائے گی۔ قاسم نے گون گون کر اپنا رخ پھر اسٹیج کی طرف
 کر لیا ہے۔ میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اطمینان سے بیٹھی ہوں۔ مصری حسینہ
 کا گیت بھی مجھے اپنی طرف میں کھینچ سکا۔ میں بے بسی کے احساس کے ساتھ لکھیں

بند کر لیتی ہوں۔ اور اچانک وہ کوچہ جسے میں کوسوں پیچھے چھوڑ آئی ہوں میری آنکھوں میں روشن ہو جاتا ہے۔ میں یہاں سب کے درمیان اپنی گنہگارنا چاہتی ہوں مگر میرا اندر کا جی دور و کرہ لگان ہوا جاتا ہے میں کیا بات کروں۔ میں تم کو کیا سناؤں آدمی کبھی کبھی اس کیفیت سے بھی گزرتا ہے کہ جہاں دل میں صرف ایک بے نام سادرد ہی رہ جاتا ہے۔ نہ اُمید نہ دایوسی۔ نہ کسی چیز کی اُس۔ نہ کسی شے کی لگی نہ محبت نہ نفرت۔ انتظار بھی نہیں۔ سفید آنکھیں۔ سرد اور بے جان جسم بس لوتھو کی دھجی رہ جاتی ہے۔ یہ میں ہوں۔ یہ میں ہوں۔ میری رپڑھ کی ہڈی میں سردی کی تیز کپکپا دینے والی لہر دوڑ جاتی ہے۔ میں گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی ہوں۔ میری پیشانی پر پسینے کی نمی ہے۔ میں چاہتی ہوں معطلہ کو آواز دوں مگر آواز میرے گلے میں گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ میں چاہتی ہوں معطلہ کی آستین پکڑوں مگر میرا ہاتھ کانپ کے رہ جاتا ہے۔ میں اپنے بے جان جسم کو کرسی کی پشت سے ہٹا کر آنکھیں پُندی کھول دیتی ہوں۔ اور مصری حسینہ کی طرف دیکھنے لگتی ہوں۔ شاید اس کا حسین چہرہ مجھے شانتی دے سکے۔ مگر نہیں۔ مصری حسینہ کے ہتے لبوں میں بھی شانتی نہیں۔ آفریدی کے جذبات سے بھرے چہرے اور سلطانی کی شرمیلی ہنسی میں بھی تو شانتی نہیں۔ کبھی تو میری توقع کے خلاف بھی کچھ کرو۔ کبھی کچھ لئے بغیر بھی کچھ دینا سیکھو۔ میں ازل سے انتظار میں ہوں۔ عیث انتظار۔

معطلہ کے چہرے پر سکون ہے اور وہ طمانیت سے چہرہ موڑے گا نا من ہی ہے کیا یہ سکون یہ اطمینان میرے مقدور میں نہیں مگر یہ معطلہ کا ٹپک نہیں ہے کیا تم نے کبھی گھر میں اس کے چہرے پر سکون یہ شانتی دیکھی ہے؟ — بی بی میری بہن

ہم سب تنہا ہیں۔ ازل سے تنہا۔ تنہائی ہمارا مقصد بن چکی ہے۔ کوئی اس تنہائی کو توڑنے کی خاطر کسی کی دُورِ سراہت قبول کر لیتا ہے۔ (کیا سلسلی آفریدی سے شادی کرے گی؟) مگر یہ دُورِ سراہت اس کے اندر کی تنہائی کو توڑ نہیں کر سکتی۔ میں آگے جھجک کر مزید کہنیاں ٹینگا کر آفریدی کے چہرے کی طرف دیکھتی ہوں ہال کی دو دھیار و خشی میں اس کا سُرخ و سفید چہرہ چمک رہا ہے گھنی مونچھوں کے تلے موٹے موٹے ہونٹ سامنے بیٹھی لڑکی کے دل میں یقین و اعتماد کے جذبے جگمگا رہے ہیں۔ کیا اس سامنے بیٹھی لڑکی کو یقین ہے کہ یہ شخص اور صرف یہی شخص اسے خوشیاں دے سکتا ہے۔ ہوشیاری میزاجی چاہتا ہے زور سے تھقہ لگاؤں خوشی۔ یہ لفظ کس نے ہمیں گلو کرنے کو پد کیا۔ کس نے؟ کوئی مجھے بناؤ کریں اس سے اس لفظ کا مفہوم مانگوں۔ سلسلی بی بی کیا ختم آفریدی کی دُورِ سراہت اپنا کر خوشی پالوگی۔ تم نے دیکھا ہم تبرنیا کام کرنے سے شیر کس درجہ پُرا اعتماد ہوتے ہیں کہ ایسا کرنے سے ہم ضرور خوشی پالیں گے۔ مگر خوشی کس نہیں۔ ساری عمر اس کی تلاش میں گزر جاتی ہے اور خوشی پھر بھی دوسرے کنارے پر کھڑی ٹسکرا ٹسکرا کر ہاتھ پھیرتی ہے۔ میں اب اس کے پیچھے ہرگز نہیں بھاگوں گی۔ میں اب تنہا چلی ہوں۔

مصری حسینہ گانا ختم کر کے سا چلی ہے قاسم ابھی تک اسٹیج کی طرف رخ کئے بیٹھا ہے۔ مجھے ہر دو گرام سے ذرا بھر بھی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی۔ میں پھر اٹھ کھینچ کر لیتی ہوں۔ اور بند آنکھوں میں اپنے وجود کو ہنستے گاتے ہال میں افسردگی سے بیتاد دیکھتی ہوں۔ میں ہوں کہ پاس کو ہاتھ لگاؤں، کوئلہ بنے۔ خوشی کے قریب سے گزرا وہ دھاروں روئے۔ ہوا مجھے دیکھ کر پنا رخ پھیرے۔ بادل اپنا سایہ چھوڑ دے۔

تو یہی جب اگر لوگ تنہائی میں اکیلے ہیں کہیں۔۔۔ تم ہو۔۔۔ گم جوہم میں میرے ثبات کو فحش میں بدل دیں۔ آج مجھے ہزاروں بار اس کا تجربہ ہوتا ہے اور میں سچ کہتی ہوں نہ اُداس ہوں نہ دل گرفتہ۔ صرف حلق سے لے کر معدے تک شدید بد مزگی کا احساس ہے ایک اینٹیشن۔ کیا نام دوں اس کو؟؟؟۔۔۔ اپنے اندر کے سناٹے اور باہر کی تنہائی کو (تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوقی نظر ہے) کا باہم کرتے برس بیت گئے۔ کوئی چارہ نہیں بخلا میں کوئی کب تک تجھے۔ بس اپنے ہی بال دپر نوچتے ہیں۔

قاسم اچانک پائپ رکھنے یا لینے کے واسطے میز کی طرف مڑتا ہے۔ اور اس کی نظر دانستہ یا نادانستہ میرے چہرے پر پڑتی ہے۔ میں اپنی نظریں ہٹالینا چاہتی ہوں مگر اس کی نظریں لچھ بھر کے لئے میری نظروں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں ان نظروں میں حیرت بھی ہے اور پریشانی بھی۔۔۔ وہ سوالیہ بھی ہیں اور کسی حد تک CONSOLING بھی۔ پھر وہ ہلکے سے مسکرا کر چہرہ ایلیج کی طرف مڑ لیتا ہے۔ میں پھر آنکھیں بند کر کے کمر کو کسی کی پخت سے ٹکا دیتی ہوں۔ یہ محض تنہائی کا زہر نہیں ہے جو میری رگ رگ میں سرایت کر رہا ہے۔ یہ محض بے مقصدیت تو نہیں۔ عائنہ بی بی۔ یہ تو لا حاصل کاڑکھ ہے۔ یہ تو نارسائی کا کرب ہے۔ میں جب غم کو دیکھتی ہوں تو میرے اندر کا جی روتا ہے۔ میرے آنسو اندر گرتے ہیں گلے میں قطرہ قطرہ۔ دل پر متواتر گرتی بارش۔ اور وہ کہتا تھا اگر بولنے کو جی نہیں چاہتا تو مت بولو اگر کہنے کو جی نہیں چاہتا تو مت کہو۔ مت ہونٹوں کو پھیلاؤ، غم کو کبھی کبھی دھوکا نہ دو، جہاں جس وقت تمہارا جی جس بات کے لئے کام کرنے بھی کرتا ہے وہ کرو۔ اگر کچھ نہیں تو چپ چاپ ہنس پر لیٹ جاؤ اور آنسوؤں کو خاموشی سے بہتے دو۔ اور سنو۔ اگر تمہیں کوئی میسر ہے تو اس سے

کہو۔ آؤ اپنا ہاتھ ہمارے سپرد کھو، آؤ ہیں پیار کرد۔ مگر ایسا بھی ہوتا ہے میں نہیں
کھول کر مار دگر وہ دیکھتی ہوں۔ ہر کوئی مصری حسینہ کے گانے میں مجھ ہے۔ گانے میں بھی
اس کے صرف ہونٹ ہی جنبش نہیں کرتے بلکہ اس کے ابرو اس کے ہاتھ حتیٰ کہ
اس کے جسم کی چمک بھی بسا اوقات اس کے گانے کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔
ایک سناٹا ہے جو سارے ہال پر طاری ہے۔ سوائے مصری حسینہ کی آواز اور پس منظر
ساز کے۔ میں پھر آنکھیں بند کر لیتی ہوں مگر ایسا بھی ہوتا ہے عاشقہ بیگم کہ وہ نہیں
سمجھتا، وہ سمجھنا نہیں چاہتا اتم شکست خوردہ، تب سر جاؤ مگر خود پر ترس مت کھاد۔
اور وہ جو یہ سب باتیں مجھے سکھاتا تھا مجھے سمجھ نہ سکا مگر کیا یہ سچی ہے؟ کیا حقیقت
یہ نہیں کہ وہ مجھے سمجھنا نہ چاہتا تھا۔ سلمیٰ بی بی، میں اچانک آنکھیں کھول کر بالی کے
وسط میں اُسے تلاش کرتی ہوں۔ تمہیں کفریدی کی بانوں میں سامنے کے لئے اس
کی پہلی بیوی کی قبر سے گزرنا ہو گا، کیا تم ایسا کر سکو گی؟ کیا ایک لمحے، ایک لمحے کے
ہزاروں حصے میں بھی تمہیں یہ خیال نہ آئے گا کہ وہ عورت جس کے سینے پہ پاؤں رکھ
کر تم اس کے خاندان اور اپنے محبوب کے پاس جاؤ گی وہ بھی تمہاری طرح گوشت
پرست کی ہے۔ اس کی نسوں میں بھی تمہاری مانند گرم گرم شرف خون دھتا ہے۔
اس کے سینے میں بھی زندگی کی اُن گنت مسرتیں خیمہ زن ہیں۔ نہیں تم ایسا
نہیں سوچو گی۔ تم بہادر ہو، تم کو صرف اپنی خوشیوں کے حصول کی چاہ ہے۔ اپنا وجود
تم کو عزیز تو ہے۔ اور میں۔ میں چپکے سے ہنستی ہوں۔ بے آواز ہنسی۔ بے بسی
کی ہنسی۔ معظہ اگر جان لے کہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔ معظہ اگر میرے پاس بھی
نیرے جیسا ایک پہلک نہیں ہوتا، میں اس کے خلعتہ چہرے کو دیکھ کر رنج سے

سوچتی ہوں اور دفعتاً چونک اٹھتی ہوں۔ ناصر میری کرسی پر ٹھیک کرکھپ کر رہے ہیں جی۔ میں گھبرا کر ان کی طرف دیکھتی ہوں۔ اپنی۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ ان کے لیے میں اپنا نیت ہے میں شکرانے کی کوشش کرتے ہوئے سر ہلا دیتی ہوں۔ میں مزے میں ہوں آپ فکر مت کیجئے۔ میں اپنی آواز حتی الامکان خوشگوار بنا کر کہتی ہوں اور نظروں اسٹیج پر گاڑ دیتی ہوں۔

میں نے آنکھیں اسٹیج پر گاڑ رکھی ہیں مگر مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا سا مارا ساول دھندلا رہا ہے میں گوش بر آواز میں مگر میرے کانوں میں کوئی آواز نہیں آ رہی میرے اندر باہر سناٹے کی حکمرانی ہے۔ آفریدی اور سلمیٰ کے چہرے بھی اسی دھند میں گم ہو چکے ہیں۔ میں اپنی آنکھوں کی نمی چھپانے کی خاطر آنکھیں موند لیتی ہوں اور وہ کوچہ اپنی تمام تر دوشینوں سمیت میری آنکھوں میں اتر آتا ہے۔ میں اس سے بھاگ کر کہاں پناہ پاؤں گی؟ مغلطہ بہنا تو مجھے یہاں لے کر آئی ہے کہ میں اس رنگ بھرے ساول میں اپنی تلخ اور ناکام زندگی خوشگوار بنا سکوں۔ اپنے زخم ٹھلا سکوں۔ ناصر کہتے ہیں وقت ہرزخم کو مندمل کر دیتا ہے۔ وقت۔ میں اپنے جسم میں تناؤ کا محسوس کرتی ہوں مگر۔ بھائی میرے یہ وقت ہے کیا۔ کیا ہے وقت؟؟؟ وقت اندھے کی لاشی ہے جس سے وہ راستہ پاتا ہے۔ راستہ پانا بھی ہے راستہ کھوتا بھی ہے مگر وقت ٹھنڈا اندر ہے یا تم وقت کے اندر ہو؟۔ وقت ایک جال ہے اور تم صید ہو۔ کون کون جال ہو اور وقت صید؟ وقت تمہارا غلام ہے یا تم وقت کے غلام ہو؟۔ مگر تم کون ہو اور وقت کیا ہے؟ اور وقت کیا ہے اور تم کون ہو؟ اور تم مر جاؤ گے اور وقت یونہی رواں دواں رہے گا۔ پھر تم میں کون فاتح ہے اور کون مغلوب؟ اور کون

حاکم ہے اور کون محکوم؟ اور جو مر جائے گا وہ مفتوح ہو اور جو زندہ رہے وہ غلغ— پس وقت قحح ہے!! امیراجی چاہتا ہے میں ناصر کا کندھا پکڑ کر ان سے کہوں میں نے وقت کو پایا— میں نے وقت کو پایا— خود اپنی بے آواز سوچ میرے کانوں میں گونجی پیدا کرتی ہے 'وہ خوبصورت کشادہ گھر' وہ بھاگتے کیھتے بچے۔ وہ دن 'وہ لوگ— کہاں گئے۔ ۹۹۹

(وہ پریشانی سے کمرہ کمرہ گھومتی ہے سارے میں ایک چپ ہے ایک سناٹا، ویرانی 'یہ بھرا پڑا آگنیں اب کیسا سناٹا ہو رہا ہے کمرے کیسے خاموش کوئی دیوار نہیں کھٹکا کسی کمرے سے کوئی آواز نہیں اُبھرتی۔ یہ گھر ہے یہ گھر ہے یا قریب۔ وہ ماں کے کانوں کے پاس جا کر ڈھاکڑتی ہے۔ بڑھی عورت سفیر پلو سے سٹوٹا ہے تخت پر بیٹھی ہے، سپاٹ بے رنگ آنکھیں لئے۔ 'اورانی میرے پاس بیٹھو' سناٹا سے بھاری آواز 'رائی۔ ہنہ۔ وہ طنز سے ہنستی ہے اور ہنسنے چلی جاتی ہے۔ پھر نڈھال ہو کر تخت پر گر جاتی ہے۔ ایک دم وہی سکوت 'وہی خاموشی' وہی سناٹا۔ آنکھیں بند کئے کیا سکون ملتا ہے، سکون۔ ہنہ سکون کیا ہے، آنکھیں کھول کر وہ بڑھی عورت کو دیکھتی ہے۔ ماں۔ کیا ہے میرے سینے میں معدوم جہاں فقہہ وقت سے بھی خاموشی قبر نہیں ڈھتی۔ اور آگے بڑھ کر ماں کی گود میں سر رکھ کر بچکیوں میں رہنے لگتی ہے۔)

منظفہ مجھے پھر کہہ رہی ہے میں نے آنکھیں کھول دی ہیں میری آنکھوں میں میرے کوچے کی گرد آڑ رہی ہے منظفہ اسے دیکھ لے گی۔ میں نے جلدی سے ردیا نکال کر اپنی آنکھیں صاف کی ہیں۔ "منظفہ باجی۔ آپ کے کلب کی روغنیاں میری

انکھوں کو خیرہ کئے دے رہی ہیں۔ میں اپنی آواز میں بشارت سیدھا کہتے ہوئے کہتی ہوں۔ وہ ہاتھ بڑھا کر میرا شانہ تھپتھپاتی ہے۔ ہوئے ہوئے قسم ان روشنیوں کی عادی ہو جاؤ گی بانو۔ اس کے لمحے میں ہامنا ہے میرا گورنر دھجاتا ہے (کیا ہے میرے سینے میں معدوم۔ کیا ہے) میں اقرار میں سرگرم ہوں۔ محکمہ پھر اسٹیج کی طرف چہرہ مڑاتی ہے عربی حسینہ DAGGER DANCE پیش کر رہی ہے اس کے دونوں ہاتھوں میں چمکتے ہوئے شجر ہیں اس کی حرکات میں بلا کی پھرتی ہے اور وہ اس تیزی سے اپنے ہاتھوں کو دائیں بائیں اوپر نیچے گھماتی ہے کہ خطر نظر تک نہیں آتا اور صرف بجلی سی کو نڈتی نظر آتی ہے۔ میری توجہ لمحاتی طور پر حسینہ کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ تمام انگلیوں سے میری جانب دیکھتا ہے۔ میرے چہرے پر دلچسپی پا کر خود بھی خوش ہوا ٹھنکا ہے لیکن آفریدی کا سراپا یک بار پھر میری توجہ اچک لیتا ہے آفریدی اسے یہاں لے کر کیوں آیا ہے؟ کل رات ڈنر پر خواجہ وہ وہ کہہ رہا تھا کہ آفریدی پہلی بیوی کو طلاق دے کر سہیلی سے شادی کرے گا اور دونوں مل کر ہسپتال کھولیں گے میری خواہش ہے میں ان کے قریب بیٹھ دوں اور ان کی باتیں سنوں۔ آخر آفریدی سہیلی سے کیا کہہ سکتا ہے؟ سہیلی نے کیونکر اس کی باتوں کا حقین کر لیا ہو گا۔ سہیلی لی بی تو کس قدر معمولی ہے سہیلیں میچے اس شخص پر اعتبار کر رہی ہے جس نے تیری خاطر پانچ سالہ رفاقت کو ختم کر دیا۔ کیا وہ تیری رفاقت سے کسی بھی وقت ایسے ہی منہ نہیں موڑ سکتا؟ میں چاہتی ہوں سہیلی کو یہ سب باتیں بتاؤں اسے اس فعل سے باز رکھوں وہ ابھی معصوم ہے اس کی سحر نے عیادی سے اسے اپنے جنگل میں پھانس لیا ہے۔ مگر ابھی وقت ہے وہ اس جاں کو توڑ سکتی ہے۔ اگر میں اس کی مدد کروں۔

قاسم اسپانک پائپ رکھنے کے بہانے میز پر جھک کر میری طرف دیکھتا ہے۔ اگر میں غلطی پر نہیں، یہ پروگرام آپ کی معمولی سی توجہ بھی نہیں کھینچ سکا۔ میں مختصاً نے کوہکے سے سکرا دیتی ہوں یہ حقیقت ہے قاسم میاں، ختم کچھ کچھ سجدہ وار قسم کے آدمی ہو مگر میں اسے اپنی رائے سے باخبر نہیں کرتی، بس ہلکے سے سکرا کر بات ختم کر دیتی ہوں۔ اسٹیج پر پردہ پڑا ہے، قاعدہ جابجی ہے، ودانی بار کی طرف سے نکل کر پروگرام کے ختم ہونے کا اعلان کر رہا ہے۔ کرسیوں کا شور، باتوں مقصود کا غل، امریکی سرواپنے پائپ سنبھالے بار میں گھس جاتے ہیں۔ عورتیں، پروگرام پر اپنی باریک آوازوں میں تجرہ کرتی باہر نکل جاتی ہیں۔ آفریدی اور سلمیٰ، بھی اسی جھگڑ میں گم ہو چکے ہیں، مسئلہ مجھے گھر چلنے کو کہنی ہے گھر۔ میرا گھر کونسا ہے ۹۹؟

(اور وہ بالکنی میں کھڑی، اکیلی، تنہا اور اداس، اپنے غیر محفوظ ہونے کا احساس میرے سینے میں وہی ایک عزم، ایک خلا — اے گراں بار سکوت۔ ٹوٹ جا۔ بالکنی سے نیچے جھانکتے جھٹے، اس نے سوچا، نیچے کوڑ جاؤں۔ تب کیا ہو گا۔ اگر میں یہاں سے کوڑ کر نیچے جا کر دوں اور سرخ سرخ بھری پریٹ کوڑ جاؤں تب کیا ہو گا؟ اس کے بعد میں کہاں جاؤں گی؟ کیا پھر یہی تنہائی یہی اداسی، یہی اکیلا ہیں۔ اور جو اس بالکنی سے نیچے کوڑ جاؤں تو نیچے مجھے وہی خدا ملے گا جو میری ماں کا خدا ہے۔ نہیں نہیں مجھے تیری ضرورت نہیں۔ میں زندہ رہوں گی۔ میں زندہ رہوں گی)

مسئلہ نے میرا ہاتھ حجام لیا ہے، نامرودہری طرف ہاتھ پشت پر باندھے سر جھکا کر پل رہے ہیں۔ میری سوچیں آپس میں گٹھ جوڑ رہی ہیں، میں پروگرام کے بارے میں سوچنا چاہتی ہوں کہ اس کی تعریف، نامر کے رو پروگوں اور دشکرہ ادا کردوں کہ آج

کی شام بڑی دلچسپ گزری مگر مجھے آفریدی کا جذبات سے سرخ چہرہ اور سلی کی جھینپی جھینپی سی ہنسی یاد آ جاتی ہے۔ اور جب میں آفریدی کے بارے میں کچھ کہنے کو بٹھولتی ہوں تو قاسم کے بوٹوں کی چاپ بھٹوٹے بن کر میرے ذہن میں گونجنے لگتی ہے۔ قاسم ہم سب سے چار قدم پیچھے اکیلا چلا آ رہا ہے۔ اچانک میں آسنائی بھونڈے پن سے معطلہ سے کہتی ہوں: ”معطلہ باجی۔ قاسم کی جیوی کب آئے گی؟“ ناہر کا ٹھکانا سرد بھی ٹھکانا جاتا ہے قاسم کے بوٹوں کی چاپ کہیں ڈور گرم ہونے لگتی ہے اور معطلہ مرگوشی کے لہجے میں کہتی ہے: ”ان کی تو SEPERATION ہو چکی ہے بانو! پھر تو بے اُمیجی آوازیں مجھے بتاتی ہے کہ وہ بے اشتیاب مزاج اور میوٹر قسم کی عورت تھی میرا جی چاہتا ہے فقہہ لگاؤں۔ ایسا فقہہ جو ساری کائنات کو اپنے گیسروں میں لے لے لے جے ہر کوئی سر اٹھا کر ٹٹے۔ یہ سارے دھوکے ہیں معطلہ کسی کو کسی کی ضرورت نہیں۔ کوئی دوسرا بہت ابدی نہیں۔ سارے رشتے ٹوٹ جانے والے ہیں کسی کو ثبات نہیں۔ کسی کو ثبات نہیں۔“

آیا نے بچوں کو سٹلا دیا ہے۔ ہم چاروں خاموشی کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔ ناہر کبھی کبھار ایک آدھ بات پھیڑ دیتے ہیں۔ قاسم ہر بار میری طرف دیکھتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے یہیں سب کے درمیان اس سے پوچھوں۔ تم جویوں نظروں نظروں میں مجھے اُن گنت پیغام دے رہے ہو۔ کیا تمہارا خیال ہے میں تمہاری دوسرا جھگڑا اور قسم کی جیوی سے بہتر ثابت ہوں گی۔ تم غلطی پر ہو قاسم۔ یہاں کوئی کسی سے بہتر نہیں۔ اور پھر میں نور شنوں ناطوں پر ایمان بھی نہیں رکھتی۔ نہ مجھے کسی کی دوسرا بہت کی ضرورت ہے۔ تنہائی میرا مقصود بن چکی ہے مگر میں اس سے کچھ نہیں

کہتی ہیں اس کی نظروں کی زبان سمجھنے سے انکار کرتی ہوں اور مجھ کو کرسنا کساتی ہوں۔
مجھے کمانے سے بھی نفرت ہے مجھے ہر اس شے سے نفرت ہے جو مجھے زندہ رہنے پر
اکساتی ہے لیکن میں مرنا بھی نہیں چاہتی۔ کیونکہ مرنے کے بعد مجھے وہی خدا ہے جو اس
نے زندگی بھر مجھے کچھ نہیں دیا۔ اور وہ مرنے کے بعد مجھے کیا دے گا؟

میں پرانی پڑھی ہوئی ایک نظم کو دل میں دہرائے گئی ہوں؟

زیست اور موت کا چکر! جینا

موت اور نگ کی خواہشیں ڈھلنا۔ مرنے

اور پھر زیست کی تکلیف اٹھانا۔ خود کو

ان سوالات کی غورگاہ بنانا۔ کیا ہے؟

تاسم نے کافی کی پیالی میز پر رکھ کر مجھے ہلکی ہلکی سیر کے لئے کہا۔ یقیناً تھوڑی
سی سیر کے آپ کو قطعاً نقصان نہیں پہنچے گا۔ مگر میں اس کے ساتھ باہر نہیں جانا چاہتا
میں اس کا پیغام نہیں سمجھتا چاہتی۔ مجھے تمہاری قطعی ضرورت نہیں تاسم۔ وہ میرے انکار
پر دل برداشتہ ہو جاتا ہے اور کافی کی ایک اور پیالی باوجود مصلحت کی مخالفت کے پی کر جانے
کے لئے اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ جھلکے میں رہتا ہے اور رات کا کھانا اگر مصلحت
کے ہاں کہتا ہے۔ ناصر اور مصلحت مجھے میرے چھوٹے سے بیڈ روم میں چھوڑ کر اچھی سی
میٹھی نیند لینے کی ہدایت کر کے اپنی خوابگاہ میں چلے جاتے ہیں۔ سیاہی بھلتی ہے
تو شام بڑھتی ہے اور روشنی بھلتی ہے تو دن۔ اور دن گزرتے ہیں تو سال گزرتے ہیں
تو۔ مجھے موت کیوں نہیں آتی۔ مگر میں مرنا نہیں چاہتی۔ مجھے زندہ رہنا ہے اور مجھے
زندگی سے نفرت ہے۔

”ماں، رات کیوں ہوتی ہے؟“ بڑھی عورت چہرہ لحاف سے نکال کر اسے دیکھتی ہے
 ”سو جاؤ بیٹی۔“ وہ آنکھیں چھپت پر گاڑے لیٹی ہے۔ ”ماں اگر ہم دن کو سو جائیں اللہ تعالیٰ
 کو کام کریں تو پھر رات کو دن اور دن کو رات کہیں گے نا؟“ بڑھی عورت عاجزی سے
 کروٹ بدل کر اسے دیکھتی ہے۔ ”بیٹی، سورۃ الرحمن پڑھ کر اپنے سینے پر چھونک ملو اور
 سو جاؤ۔“ تب وہ یکدم لحاف پر سے بھینک کر اٹھ بیٹھتی ہے اور چلا کر کہتی ہے۔ ”ماں
 اپنے خدا کا نام میرے سامنے مت لیا کرو۔ مت لیا کرو۔“ چلاتے چلاتے اسے کھانسی
 آجاتی ہے اور وہ بے دم سی ہو کر بستر پر گر جاتی ہے۔ خاموش، دیران گھر سناٹا بند کمرے
 بند دروازے۔ کس کمرے سے کوئی آواز نہیں ابھرتی، اسکت و جامد چیزیں۔ کوئی بولے
 کوئی کروٹ بدلے، کوئی سسکی، کوئی آہ، کراہ!!! پھر کوئی ہوتا یہ ہو۔“

سب کچھ ٹھہر گیا ہے۔ سب کچھ سو گیا ہے۔ میں شاید مرد ہی ہوں!
 ”سیپ۔ کراچی“

رشتہ

گوالی بین کے ایک طرف آگے کوچل کر جہاں بائیں ہاتھ کو مڑتا ہوا راستہ نکلتا ہی بنایا کرتا تھا 'دباں' اور میٹھا ہوا لوگوں کی بیٹی پُرانی جوتیوں میں تکیاں، ایڑیاں اور سفنج کے چپلوں کے ٹوٹے ہوئے تسموں کو لوگوں کی طرح کے نازک اور نرم گورے گورے ہاتھوں سے ٹانگے لگایا کرتا۔ یاد دو آئے، چار چار آنے میں بھری اور گرو کے کھائے ہوئے جوتوں کے چمڑے کی پیلہ کو از سر نو لال یا کالا کرتا رہتا، گویا لوگوں کے پیٹھے پرانے جوتوں میں ٹانگے نہ لگا رہا ہو، خستہ جوتوں کی پیلہ کو لال کالی پالش سے چمکانہ رہا ہو بلکہ اپنی اُدھڑی ہوئی زندگی میں ٹانگے لگا رہا ہو اور اس کی کمر بہ اور مسخ شدہ جلد کو بے سفارہ رہا ہو۔

دو پہر ہوتے ہوتے جب وہ جوتوں میں ٹانگے لگاتے لگاتے غٹک جاتا اور سوچ سامنے کی تین منزلہ بلڈنگ کو مچلا ٹنگ کر اس کے سامنے پڑے ہوئے پیٹے پرانے سوکھے ہوئے چمڑے کے جوتوں کے ڈھیر پھیل جاتا اور وہ پتلے پتلے ہاتھوں

کے سہارے اٹکا کر کھڑی ہوئی کپڑے کی چادر سورج کی تپش میں سزاگم نہ رہتی تو وہ روٹی دکھانے یا پانی کا ٹھنڈا گلاس پینے، ساری گلی کو عبور کر کے آخری کونے کے بھٹیاد خانے میں چلا جاتا جہاں کا مالک چربی میں پکائے ہوئے سالن کو صحن میں جمادینے کی غرض سے برف کے پانی کے پہلوانی گلاس مفت لٹا یا کرتا تھا۔ پلٹے ہوئے وہ راستے میں بڑتی ڈکانوں سے کسی کا بوتا پالش کرنے، ایڑی لگانے یا دھو کر مہوئی جگہ ٹانگے لگانے کے لئے لیتا آتا۔

گلی کے سچوں بیچ محمد حنیف پنزاری کی دکان بڑتی تھی۔ محمد حنیف پنزاری نے زندگی میں کبھی بیری میں گھرے گھرے نشان ڈالنے والی نری کی لال لال جوتی کے علاوہ کوئی چیز نہ پہنی تھی۔ اور اس کا جوتا گیسے کا نام نہ لیا کرتا کیونکہ جوتا تو جب گیتا ہے جب آدمی کی ٹانگیں چلتے چلتے تھک جاتی ہیں اور اگر ٹانگیں نہ تھکیں تو جوتا بھی نہیں تھکتا۔ اور محمد حنیف تھا کہ صبح کو جوتا گرد کان کی گندی پڑا لیتی پالتی مارے میٹھتا تھا تو رات گئے ہی اٹھتا۔ لہذا جوتی سدا کی بہار دکھائی دیتی گویا ابھی ابھی دکان سے اٹھا کر لائی گئی ہو۔ ہفتہ کے ہفتہ اس کی بیوی باجرو بڑے چاؤ کے ساتھ محمد حنیف کی دکان بند کر کے رات کو گھر آنے پر گھائی کے خالص سرسوں کے نیل سے اجڑا س کا چھٹا بھائی برانے جانے والے کے ہاتھ گاؤں بھیجتا رہتا تھا۔ گودڑ جھگو جھگو کر جوتی کو چمکاتی رہتی تھی۔ مگر وہ اب یہ کہ محمد حنیف کا بڑا سالہ ایک دفعہ اپنی بہن سے ملنے آیا تو سہوئی کے لئے چمک دیمک دکھائی ایک گرگابی لیتا آیا۔ جب گوجرہ کی بہن ہوئی تب بند کڑاؤں کے گرد پیٹے اور پاؤں میں چرم چرم کرنی گرگابی کو پہن کر محمد حنیف دکان جائے کو نکلا تو زندگی میں پہلی بار اسے یوں محسوس ہوا گویا پیر کے نیچے کوئی دبیز قالین بچھا ہوا ہے اور

چاروں طرف سے اس کے پیروں کو نرم و نازک گرفت میں لے رہا ہے۔

گارسے منی سے بچانا اس گرگابی کو حقیقت دکان کے پتھر سے پر سیر رکھتے ہی تلمارتا اور اسے بڑی احتیاط سے جیسے ڈبیر ساری تعداد میں چاندی کے ذوق لگے پائوں کا پیکٹ تیار کر رہا ہوا تھا کراپنے بیٹھنے کی گڈی کے قریب ہی رکھ دیتا۔

جب گرگابی کی کالی جلد روز بروز کے استعمال سے اپنی چمک دمک کھونے لگی تو اسے پالش کی ایک ڈبیہ اور برش خریدنے کا خیال آیا۔ مگر وہ خود تو پالش کرنے سے رہا! پالش کون کرے گا؟ اسے ہاجرہ کا خیال آیا جو ابھی تک نری کی پرانی جوتی کو ہر روز اگرچہ وہ پہنا تو نہیں کرتا تھا لیکن صاف ضرور کیا کرتی تھی مگر ہاجرہ....

ہاجرہ انگریزی جوتے کے ساتھ بہتاؤ کرنا کیا جانے۔ وہ تو گاؤں کی رہنے والی سیگا سادھی، صبح اٹھ کر پانچ سیر گندم چکی میں پیسے اور باجوس کی موٹی موٹی روٹیاں پکانے والی عورت، ایک دوسرے میں آٹے سیدھے کر کے اڑا کر رکس ہوئی گرگاب کی طرف دیکھتے اور ہاتھ میں پکڑے ہوئے سانچی پان پر کھٹے کی تہہ جھانے ہوئے اس نے سوچا۔ اس سالی کو کیا قسح (تمیز) باپ دادا سدا نری کی جوتی پہنتے ہوں۔ مرسوں کے تیل میں ڈبوئے آتے؟ دل میں ایسا سوچتے ہوئے اس نے نری کی جوتی پہننے کے الزام کو ہاجرہ کے باپ دلو پر لگاتے ہوئے خود کو صاف صاف بچالیا۔ جیسے رہ ہمیشہ سے یہی گرگابی پہنتا چلا آ رہا ہو۔

استاد دلز کا ایک پیکٹ دینا۔ ساتھ موہنی تبا کو دالا ڈبل کتے چونے کا پان؟ ایک مہجاری اور کرخت آواز نے اُسے جوتوں کے چکر سے نکال دیا۔ اور پھر لوگوں کے آنے جانے میں طرح طرح کے پان لگاتے، سگریٹوں کے پیکٹ دیتے،

وہ اپنے جوتے کو بھولے رہا۔

سہ پہر کا وقت تھا جب اوٹنگھٹے اوٹنگھٹے جوتا چھو کر اس کی نگاہوں کے سامنے ٹپک گیا۔ وہ جلدی سے اپنی گتھی سے اس کو زیرِ اُبادی کھٹے کو تالا لگایا۔ جوتوں کو آہستہ آہستہ جیسے کا پتھر کے جوں مرگ پر چاکر رکھا اور پین کر موچی کی دکان پر چلا گیا۔

انور مر جھکاٹے، ہاتھ میں بھی پکڑے ایک بوت میں اٹھری لگا رہا تھا کہ محمد صنیف ایسی لنگڑا تھی ہوئی چال سے کہ جب آدمی دیر تک آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کے بعد چلتا ہے، اس تک پہنچا۔

اسفلج کی ایک نیلی اور ایک لال چل کو پاؤں میں ڈال کر اس نے جب اپنی لنگڑا کو داہنے ہاتھ کی دو انگلیوں سے پکڑ کر اس کے پاس رکھا تو محمد صنیف کی فطرس انور کی میٹھی کی بھیڑی ہوئی شلوار کے اندر سے چمک دھمک دھمکاتی سنہرے سنہرے ریشے سے بُردان پر جا پڑیں۔ لگا بک کی موجودگی سے باخبر ہو کر جب وہ اپنے خوب صورت چہرے پر ہمیشہ درانہ مسکراہٹ لایا تو اس کے پتلے پتلے اور لال لال ہڈیوں کے درمیان موتی کی طرح چمکتے ہوئے سفید دانت ایک لمے کو یوں لگے جیسے گلابی میٹھی پریمکھن کی سفید سفید تہہ جی ہوئی ہو۔ اور پھر خدا جانے بیڑا صلتی دو سپر انور کے چمکتے ہوئے جسم کی چاندنی تھی یا محمد صنیف کی اوٹنگھٹے آنکھوں کا تصور کہ اس کے منہ میں پانی بھر آیا اور اس پانی کو جلدی جلدی غررت کے شیریں گھونٹ کی طرح حلق سے نیچے آتے ہوئے اس نے کہا: ارے جو قلد پر ایک لمبر بلس کر دے مجھے دے جائیو! بگھے آن؟

پھر ایک مسکراہٹ اس نے انور پر ڈالی۔ دوبارہ وہی مسکراہٹ جواب میں چمکی، اور اس نے ماتھے پر پڑی ہوئی مہوڑے بانوں کی لٹ کو جھٹکا دیتے ہوئے نمبروں پالش

کامیاب دلا یا۔ اس دھلتی دودھ پر میں محمد حنیف جب واپس آکر اپنی گدی پر بیٹھا تو اُسے یوں لگا جیسے وہ بہت تیز دھوپ میں چل کر آ رہا ہو اور اسے زور کی پیاس لگ رہی ہو۔

اور ایک صبح جب اس گلی کا یہ چھوٹا سا بازار کھلا تو عبدالرسول بساطیہ، بمشیاد خانے کا مالک، آغا گوند خٹہ والے فقیر، اندھے لہجے بازوؤں کو اکڑا کر چلنے والے چھوٹے اور اسٹیشنری بیچنے والے کے سامنے، سوچی اند کو محمد حنیف کی دکان میں اس کی گدی کے مقابل ایک نئی بنی ہوئی گدی پر بیٹھا ہوا دیکھ کر جیسے ہم کارڈ چھٹ گیا اور گردن اکڑا کر گھٹکریا لے بال بابر، ایسی تھیں کے کھٹے ہوئے گریبان میں لگے کارڈ کو گردن کے پیچھے ڈھکا کر چلنے والے چھوٹے کا زونا تھ کی سپاٹ سٹ سے آگے کو جا کر گول گول طاقتور گھاتی کے چوں پر جھبی کے لگے ہوئے منڈل زخم میں جیسے پھرے کھدبہ ہونے لگی۔ اند کی رسی سے لگے ہوئے زخم کے نشان والے ہاتھ کو کونے کی جیب میں ڈال کر بگے کی سکرٹ نکالتے ہوئے اس نے بمشیاد خانے کے آغا گوند خٹہ والے فقیر سے جس کے بدن کا میل پسینہ ہو چکا آٹے میں شامل ہوتا جا رہا تھا کہا۔

”اُسے فقیر، محمد حنیف سالہ کوئی بہت ہی جوان ہے جو یہ.....“

فقیر نے چھوٹن کی بات کو درمیان ہی سے کاٹتے اور ماتھے پر اُسے ہوئے پسینے کو اٹے ہاتھ کی دوا انگلیوں سے پونچھ کر اٹے میں جھٹکے ہوئے ہنس کر جواب دیا۔

”اُستاد اس میں کوئی بات نا ہے۔ تیرے سے جیادہ (زیادہ) جوان تو میں نے اپنی جندگی (زندگی) میں نا دیکھا ہے۔.....“ اور وہ پھر پھٹوں کو یوں ٹھہر ٹھہرا کر اور کرتے ہوئے گویا وہ چھوٹن کے دل پر لگے زخم کی پٹی آتا رہا ہو بولا۔ ”پسند اپنی اپنی سکرٹ

اکش کھینچ کر دو حواں چھوڑتے ہوئے اپنے بدن کے کڑیل پن پر نظر پھیلانے ہوئے اس نے غریب سے گردن اٹھا کر کہا۔ ”پر میں بھی اپنی ماں کا ناہوں جو.....“ اور یہ کہہ کر گھیر وار شہزادہ کے پھیر درست کرتا وہ صنف ہنواڑی کی دکان کی طرف ہولیا۔ سامنے افروز بوسکی کی کریم کلر تیسڑی اور سفید شہزادہ بیٹے، ہونٹوں پر پاپن کا لاکھا جمائے اناڑی کی طرح چوٹے اور کتے کی نگلیوں میں لکڑی کا گول گول چھید چلا رہا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ اس نے کچے لوگوں کی طرح شرما کر نظریں جھکا لیں۔ شاید ابھی تک اس کی نظروں میں وہ بے حیائی نہیں آ پائی تھی۔ چھوٹن زور سے پنجابی کے بول۔

تیرا پچھا نہیں ادہ چھڈنا اے

پاویں پہ جہان ہنھکریاں

(تیرا پچھا نہیں چھوڑنا۔ چاہے ہنھکریاں پڑ جائیں)

اپنے اوری لہے میں گاتا ہوا دکان کے سامنے سے گزرتا ہوا پنجابی وہ اکثر اوری لہے میں بولا کرتا اور یوں اپنے ساتھ لائے ہوئے کچر کو اس زمین کے کچر سے ملانے کی کوشش کیا کرتا۔

ہنھکریوں کا چھنا کا چھوٹن کی آواز بن کر محمد صنف کے کانوں تک پہنچ گیا۔ کیدپشن کے بیکٹ کو کھولتے ہوئے اس کی انگلیاں جہاں تھیں وہیں رہ گئیں۔ ایک تھرا کوڈ نظر کے ساتھ اس نے چھوٹن کی طرف دیکھا جو آگے نکل چکا تھا۔ اور جس کی چوڑی چوکی پیٹھ نظر آرہی تھی۔ پھر وہی تھرا کوڈ نظر پیار میں بدلی اور وہ اپنے سامنے پیٹھ ہوئے اور کو دیکھنے لگا۔ اور نے جس کی گوری گوری انگلیاں چوٹے کتے میں رنگار ہو گئی تھیں، نظریں جھکا لیں، گویا کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ پہلے یہ ہاتھ پالش کی

سیاہی میں کالے ہوا کرتے تھے امداد بکتھر پونے میں لال۔

گلی کی ساری دکانوں میں انور اومجد حنیف کی نئی دوستی کے بارے میں طرح طرح کی خبریں فضا میں چھوڑے جانے والے گیس کے غباروں کی طرح چھوڑی جاتی تھیں۔ اب انور کے پاس دو گھوڑا بوسکی کی قمیص اور چلتے میں کھڑکھڑاتے ہوئے سفید لٹھے کی شلوار کے علاوہ کلائی میں کہیں گھڑی بھی چمکنے لگی تھی۔ اور دائیں ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلی میں لال نگ لگی سونے کی انگوٹھی بھی اپنی مہار دھلائی رہتی۔

چھوٹن ایک دن ڈبل پتی کا پان امداد کی ایک سگریٹ لینے آیا۔ پیسے دیتے وقت اس نے دس کے کراڑے نوٹ کو انور کی تہہ کی ہوئی ران پر دکھا امداد دسے ہاتھ سے پان سنبھالا تو مجد حنیف کی مونچھوں کے بال غصے کے مارے تھرکنے لگے اور اس کی پان بھی جوئی باجھوں میں غصے کے مارے سفید سفید جھاگ نکل کر لال رنگ میں تبدیل ہونے لگی لڑتی آواز میں اُس نے کہا۔

”دیکھ بے چھوٹن اب کی تو تو نے بدتمیجی (بدتمیزی) کر لی پر آگے کو کان رکھو۔ اپنی سگریٹ بٹری کو لے جا اور کعبدار (خجدار) جو آئندہ اس دکان سے سودا کھریڈے (خریدے) آیا، تیرے نہ آنے سے میری دکان چوٹ نہ ہو جائے گی۔ سمجھا۔ اور چھوٹن نے پیسوں کو گرتے کی جیب میں ڈالتے ہوئے بے حیائی سے کہا۔

”اُستاد نے نئے سکاری (شکاری) ہو چل بانٹ کر کھاؤ۔ سمجھے“

”پل بے تیرے چل بانٹ کے کھانے والے کی....“ مجد حنیف نے چھوٹن کو ایسے رنگ دار گالی دی کہ پاس سے گزرتا ہوا خیرات مانگنے والا بوڑھا بھکاری تیز تیز قدموں کے ساتھ بغیر سوال کتے ہی آگے کو نکل گیا۔ چھوٹن نے ڈھٹائی سے مجد حنیف

کو دیکھا اور پھر زیر لب بڑبڑاتا ہوا کالہ رنگوں کے پیچھے دھلکا تا، اکڑتا چلا گیا۔

نہ جانے اس میں چھوٹن کی بوالہوسی کو دخل تھا یا لگی کے کسی دوسرے دکان دار کی رقابت اور حسد کو کہ محمد حنیف کے اس نئے شوق کا پتہ ہاجرہ کو بھی چل گیا پہلے تو ہاجرہ کے کانوں کو یقین نہ آیا مگر جب بتانے والے نے ہراسر ار پر سے پردہ سر کا یا اور وہ خود جوہری چھپے جا کر دکان پر بیٹھے ہوئے انور کو دیکھ آئی تو اس کا بدن سن سے رہ گیا۔ وہ تو محمد حنیف کے راتوں کو باہر رہنے کو کسی کوٹھے سے وابستہ کئے پہلی آرہی تھی اور اس بات کو صبر و شکر کر کے یوں تسلیم بھی کر چکی تھی گویا مرد کا اور کوٹھے کا رشتہ انہی دو ابدی ہے جس کی راہ میں کوئی بیوی سزاخم نہیں ہو سکتی مگر..... مگر اس بات کا کوئی جواز نہیں تھا۔ جب وہ یہ سارا اثر مناک منظر دیکھ کر گھبرائی، لجائی، شرم میں ڈوبی ہوئی گرمی میں نہائی گھر واپس لوٹی اور برقعہ اتار کر عین کاٹو گرمی کے سبب بالوں کی لٹیں ادھیڑ عمر کے چہرے پر چپک رہی تھیں۔ سامنے کا رخس پر دھڑے آئینے میں اس نے اپنی صورت دیکھی اور دل ہی دل میں اپنا اور رقیب کا موازنہ کرنے لگی۔ اپنا ادھیڑ ہونا اور جلدی تناؤ کھوتا ہوا جسم اُسے میاں کے سامنے بیٹھنے والے لڑکے کے مقابلے میں بالکل بے معنی سا لگا اور جب اس نے اپنے ڈھلے ہوئے سینے چھو سات بچے جننے کے بعد جن میں زندہ ایک ہی لڑکی بچی تھی، اپنے پیٹ کی ملائیت کے ختم ہو جانے کے بعد اس پر پڑی ہوئی سفید سفید چھکتیوں اور آڑی تر چھی لکیروں کی طرف دیکھا، اور اپنی رانوں کا جائزہ لیا جو کبھی درخت کے تنے کی طرح سیدھی اوڈ سخت تھیں مگر اب..... ڈھلے ہوئے بغیر اتھری والے کپڑے کی طرح شکن دار ہو گئی تھیں تو اسے ہوں محسوس ہوا جیسے ساری زندگی اکارت پہلی گئی ہو، اور وہ

مقصود پورا نہ ہوا جو جس کے لئے اسے اتنے سارے لوگوں کے درمیان محمد حنیف ڈھولک اور باجوں کی تیز تر آوازوں کے درمیان گھنٹری کی طرح اٹھا کر لایا تھا۔ ہر س کی کوئی حد نہیں ہوتی شاید..... اور پھر اُس نے زندگی کی بہت سی دوسری مکروہ اور ناگوار باتوں کی طرح اس بات کو بھی تسلیم کر لیا کہ اُس کا ایک اور قریب بھی ہے جو اب اس کے نسبت مخاوند سے زیادہ قریب ہے۔

گلی یوں ہی رہی جھوٹن اب اس گلی کو چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا محمد انور کی چھاتی اب بھڑی قد لبا اور چہرے پر سبزہ آگ آیا تھا۔ محمد حنیف نے اب اتنی لمبی دائرہ رکھ لی تھی گویا زندگی بھر اسے منڈوانے کا کٹھا ادا کر رہا ہو۔ گلی کی اسی ٹکون والی جگہ پر جہاں کہیں وہ بیٹھ کر جوتیاں گانتا کرتا تھا۔ اس کا پان بیڑی کا نیا کیبن، لگ چکا تھا۔ کیبن کے اندر مگر بیٹوں کی ڈبیوں کے بیچوں بیچ گئے شیشے کے عین اور آیتہ، لکڑی سے تراشہ شیشہ لگے فریم میں اوپر کوٹنگی ہوئی تھی۔ اور اس کے نیچے محمد حنیف اور اس کا ایک فوٹو ایک دوسرے کے کاڈھوں پہ ہتھ رکھے آویڑے تھا۔ ایک رات ہجرہ کے پٹنگ کے برابر والے پٹنگ پر لیٹے ہوئے محمد حنیف نے کہا: میں نے اپنی سیم (شیم) کے واسطے چھوکر ڈھونڈ لیا ہے۔ ری۔ اپنی ہی سیے (پیشے) کا ہے میری دکان سے جبرا (درا) ہٹ کر اس نے نئی نئی دکان کھولی ہے۔ لڑکا سریف (شریف) ہے اور فرما نبردار۔

محمد حنیف کے منہ سے یہ بات سن کر ہجرہ کے دل میں نہ جانے کوئی سی دہی ہوئی، دھیمے دھیمے سگتی ہوئی چنگاری نے سزا ٹھایا مگر پھر صبر کا ہتھیار استعمال کرتے ہوئے اُس نے اُسے آگ میں تبدیل کرنے میں دیا۔ اور ہاں ناں میں کوئی جواب

دیئے بغیر اپنی گوشت چڑھی پوڑی چکی کمر کو محمد حنیف کی طرف سے پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

اگلے دن صبح ہوتے ہی محمد حنیف کے دکان پر جانے کے بعد وہ اس لڑکے کو دیکھنے اور اپنے شے کی تردید کرنے گئی۔ لیکن وہاں جاکر اس کا دل دھک سے رو گیا۔ انور بے ترہید حقیقت بنا پھرتی سے انگلیاں چلا چلا کر گاہکوں کو گلوڑیاں دے رہا تھا۔ اس کے دل میں کئی جذبوں نے سر اٹھایا مگر مدتوں پہلے کی طرح اس نے اس فیصلے کو بھی بے یون و چرا تسلیم کر لیا۔

ہاجرہ کو نے میں بنی ہوئی گیارہ کے قریب پلنگ ڈالے بے سندھ پڑی سو رہی تھی۔ چاند نے اب اتنا سفر طے کر لیا تھا کہ وہ اس کے مکان سے آگے کے دو منزلہ مکان کے پیچھے جا کر پچھلے گھر کے صحن سے اپنی چاندنی سمیٹ کر لے جا چکا تھا۔ شمیم کے کمرے سے ایک لمبا ٹوٹکا سیاہ دے پاؤں نکلا۔ ہاجرہ اس نے سانس روک کر ایک نظر بوڑھی ہاجرہ کی طرف دیکھا اور پھر دے قدموں سے چلتا ہوا ہاجرہ کے کمرے میں چلا گیا۔

محمد حنیف اور ہاجرہ اب برابر برابر پلنگ بچھا کر نہیں سوتے تھے۔ کیونکہ گھر میں ایک تو داماد تھا اور دوسرے اب وہ دونوں عمر کے اس مرحلے میں تھے جہاں کوئی کہیں پڑ رہے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔

آگے سے ہوتے ہوئے محمد حنیف نے ہونک کر پوچھا۔

”کون؟“

لپٹے ٹرنکے سانس نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

تیز تیز سانسوں کے آنے جانے کے دوران جیسے اندر سے کچھ ٹوٹ پھوٹ رہا ہو، اس نے منہ کا خنوک نکلتے ہوئے بہت ہی دھیمی آواز میں کہا: میں ہوں انور۔

”انور جا کر سو جاؤ اب تم میرے دانا ہو؟“ نمیند کے خماری سے بھری ہوئی آواز نے کہا۔

”نیا دور“ کراچی

فنکار

میں نے اس کو بارہا کئی بس اسٹاپوں پر دیکھا کہ منہ تعمیر کیا تھا۔ حد سے زیادہ پہلی گڈ ٹری میں بیٹھے ہوئے گندی دارمھی والے ایک پیر گھٹنے سے غائب اور ستر ہوا۔ ایسے بیک سٹگوں پر قوس آنے کے بجائے مجھے گھن آ یا کرتی تھی۔ مگر آج جیکب لائن کے بس اسٹاپ پر میں اس کے پاس سے گزرا تو اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا جو گندی دارمھی میں قریب قریب چھپا ہوا تھا اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ چہرہ ایک جوان کا تھا اور میرا لا شعور اس سے مانوس معلوم ہوتا تھا۔

”ادھر آئیے“ اس نے کہا اور بس اسٹاپ سے وہ اپنی بیباکیوں پر اچکناکوں کے کنارے چلا۔ میں اس کی طرف دیکھنے سے گھینیا جاتا تھا مگر اس وقت وہ کچھ ایسی طرح سے دلچسپ ہو گیا تھا کہ میں اس کے پاس پہنچ ہی گیا۔

”میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ“ اس نے ایسے لمبے میں کہا جو مجھے مانوس معلوم

ہوا۔ اور پھر اس نے آیت کے بجائے آؤ کہا جس سے مجھے محسوس ہوا کہ یہ مجھے
برابری بتانا چاہتا تھا

وہ آگے آگے اور میں اس سے کچھ دُور پیچھے پیچھے بڑھنے رہے۔ وہ پھر پھر
مجھے دیکھتا رہا اور پچھلے آؤ کہتا رہا۔ اس کا وہانا وار بھی مونچھوں میں چبایا ہوا تھا
مگر آنکھیں برابر سُکرا رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کون ہے اور کچھ کچھ یاد کر رہا
تھا کہ اسے یا اس کے سے کسی کو کہاں دیکھا تھا۔

کوئی چالیس قدم جا کر وہ ایک گلی میں مڑا اور پھر میری طرف مڑ کر بولا۔ زیادہ
دُور نہیں جانا ہے پچھلے آؤ۔

اس گلی کو پار کر کے وہ ایک اور گلی میں مڑا جو بہت تنگ تھی ایسی تنگ جیسی کوئی
میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس گلی میں وہ ایک دروازے کے پاس پہنچا
اور اپنی ٹکڑی میں سے ہاتھ نکال کر دروازے میں لگے ہوئے قفل کو کھولا۔ اور پھر
دروازہ کھولا۔ میں نے دیکھا کہ دروازے سے ایک زمین اُپر کو جا رہا تھا۔ اس پر وہ
میساکھیاں ٹکاتا ہوا چڑھا اور میں اس کے پیچھے پیچھے چڑھا گیا۔ اس نے دابے
کو ایک دروازہ کھولا اور بولا: ”تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ آؤ یہاں کمرے میں بیٹھو
میں ابھی آتا ہوں۔“

میں اس کمرے میں داخل ہوا جس کو اس نے کھولا تھا۔ یہ کمرہ نہایت عمدہ
سجا ہوا ڈانگ دوم تھا۔ وہ اس میں سے ہوتا ہوا برابر کے کمرے میں چلا گیا اور
صوفے پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ دروازوں پر بہت
اچھے پردے تھے۔ زمین پر نہایت عمدہ قالین تھا جس کنارے دو صوفے سٹ

لگے تھے۔ بیچ میں دو چھوٹی میزیں تھیں جن پر سگریٹ اور سگار کیس اور رائیٹ ٹرسے تھیں۔ میں ان چیزوں کو بے خیالی میں ہی دیکھ رہا تھا کہ برابر والے کمرے کے دروازے سے ایک جوان صاف محل کا کرتہ اور ساٹن کا پاجامہ پہنے ہوئے ہنستا ہوا آیا۔

میرے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا: ”اب تم نے مجھے پہچانا کہ نہیں؟“ میں نے غور سے دیکھ کر کہا: ”تم وہی بھکاری ہو جو مجھے یہاں تک لا س؟“ ”بس اتنا ہی پہچانا اور کچھ یاد نہیں آتا۔“ اور یہ کہہ کر وہ تھمد مار کر ہنسا میں نے اسے پھاتے ہوئے کہا: ”ارے تو جتنی ہے، دھتی؟“

”ہاں۔“

”مگر تو نے یہ سب کیا لگا رکھا ہے۔ تو تو امپیریل سکریٹریٹ میں آگیا تھا پھر تجھ سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ یہاں کب آیا؟“ میں نے پاکستان آپٹ کر لیا تھا۔ یہاں آ کر دو ہی برس میں میزینڈنٹ ہو گیا تھا مگر...

”علازمت چھٹ گئی۔“

”ہاں مجھے بھی اسکیں یاد آگیا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک سال گزر ایکوشادی نہیں کی تھی بچے نہیں تھے ورنہ فاقوں پر فوٹ آجاتی؟“

”مگر اب تم یہ کیا کر رہے ہو۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ اس گندے ٹاگ کٹے بیس کیوں پر چلتے ہوئے بھکاری کے بھیس میں تم ہی تھے؟“

”بھکاری کریمل بیگرا“ کہہ کر وہ تھمد مار کر ہنسا اور بولا: ”یہ میرا فنی سمجھو میری بزنس۔ میری شاپ۔ ہم تم کوئی چودہ برس کے بعد ملے ہیں۔ میں نے بارہا تمہیں دیکھا

مگر تم نے میری طرف رخ ہی نہیں کیا۔ آج جا کر متوجہ ہوئے۔ آئی ڈونٹ ٹاک فزبیل
اس کو چھوڑو۔ اب میں وہی ہوں جو تمہارا ہم جماعت تھا۔ کتنے برس ہو گئے۔
۱۹۴۶ء سے ۱۹۶۶ء چودہ برس ہو گئے۔“

”تم ۱۹۴۶ء ہی میں امیریل سکریٹریٹ میں آ گئے تھے اور دہائی چلے گئے تھے۔
”اور ۱۹۴۶ء میں میں نے پاکستان آپٹ کیا اور ۱۹۴۸ء میں اسکرین ہو گیا۔“
”اور پھر یہ بھکاری بن گیا۔ کیا تو ہی بھکاری ہے یا کوئی اور؟ یقین نہیں آتا۔
اتنی گندگی لاوتا ہے۔ تجھے گھسن بھی نہیں آتی۔“

”میں کہتا ہوں دماغ پر گندگی لاد لینے سے جسم پر گندگی لاد لینا بہتر ہے۔ کیا
بتاؤں تجھے؟ پہلے پہلے یہاں محسوس ہوا کہ بہت اچھا ہوں مگر پھر لیاقت علی خاں
کے قتل کے بعد ہر مذہر ہر ایسے ایسے احمق سوار مجھ نے لگے۔ ایسی ایسی حماقت زندہ
باتیں کرنے کہ دماغ ہل ہل جاتا۔ اور ان۔ ان۔ سب سے بڑا عذاب یہ ہے کہ کوئی
احمق کے ماتحت آجائے۔ سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ گدھوں کے ہاتھ میں آتھا
چلا جائے۔ کیا بتاؤں میں کیسا کھول کھول کر دبا۔ مگر برداشت کرتا رہا۔ اور پھر گدھوں
نے مجھے اسکرین کرا کے ہی چھوڑا۔“

”ہاں یہ تو میں بھی محسوس کر رہا ہوں کہ احمق کی ماتحتی میں کام کرنا کیسا جہنم ہے
مگر میں نے احمقوں کو چلانا بھی سیکھ لیا ہے۔“

”میں بھی سیکھ جاتا شاید۔ مگر اسکرین ہی ہو گیا۔ اس فلیٹ پر میں نے پہلے
ہی قبضہ کر لیا تھا۔ بس یہ میرے پاس تھا اور میں سڑکوں پر پھرنے لگا، کئی فرموں میں
لوگری کی مگر وہی احمق راج، حجازت کے لئے پیسہ پاس نہ تھا۔ ایک دو رات گئے

اس گلی میں آیا تو دو آدمی باتیں کرتے سُنائی دیئے۔ ایک آواز آئی۔ ”میری تو پتیلیس کی رہی آج۔“ دوسری آواز آئی۔ ”مجھے پورے باون ملے۔“ میں ان کے قریب آیا تو دیکھا کہ دونوں بھکاری تھے۔ میں نے دل میں کہا، ”آئیں۔ ان بھکاریوں کو اوسطاً پچاس روز مل جاتے ہیں۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ مہینہ اد میں ہوں کہ پانچ چھ سو کی نوکریوں کی تلاش میں پھرتا ہوں۔ جوتے کھاتا ہوں، کھوتا ہوں۔“

”تو تو بھی بھکاری بن گیا۔“

”میرے دل میں بھی آئی کہ بھکاری بن جاؤں، تمہیں یاد ہے کہ ایک وہ محمود خٹا نہیں اپنے ساتھ جونی۔ اسے کے بعد ساٹھ روپیہ کی نوکری پر گیا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر سو روپیہ ماہوار پر سڑکوں پر جھاڑو دینے کی نوکری مل جائے تو اسے کروں مگر سڑکوں پر جھاڑو دینے والے کو اس وقت کوئی دس بارہ روپیہ ہی ملتا تھا۔ میں نے وہ ساٹھ روپیہ کا ٹکڑا ہی رہا۔ ہمارے یہاں قیروں کو بھی زیادہ سے زیادہ آٹھ دس آنے روز مل جایا کرتے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ یہاں بڑا شہر ہے دو چار روز مل جاتے ہوں گے حد سے حد پانچ۔ مگر یہ سن کر کہ ان دو بھکاریوں کو چالیس سے پچاس کے درمیان ملے تھے میں سوچنے لگا کہ مارا مارا پھرنے کے بجائے اگر یہی کرنے لگوں تو کیا ہو۔ مگر اس کام کے لئے مجھے اپنے کو اچھی طرح چھپانا ضروری تھا ورنہ پہچاننے والے بہت تھے۔ بڑی ذلت ہوتی۔“

”تو تو نے یہ سب گندہ سامان اُڑھ لیا اور اس میں چھپ گیا۔“

”نہیں یاد! یہ کام بھی اکدم سے نہیں ہو جاتا ہے اس کے لئے بھی تعلیم سیکھنا، استاد، ٹیلنٹ سب ہی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اور کافی دیر میں یہ بن آتا ہے۔“

میں کہتا ہوں کہ شاعری کے فن کی طرح یہ بھی ایک فن ہے۔“
مگر شاعر بھبک منگا تو نہیں ہوتا۔“

”بڑے شاعر اپنی خودداری پر قائم رہے مگر اصل میں وہ بھی دستِ نگرہی تھے۔ میر صاحب آصف الدولہ سے اکڑے۔ گمراہ آصف الدولہ بڑے نیک بادشاہ تھے نہیں تو بھوکوں مر جاتے۔ مگر اشتادہ غیرو کو دیکھو۔ دل چٹے بھبک منگے نہیں تھے تو کیا۔ خیر ان سب کو جانے دو جن کے نام تاریخ میں آگئے ہیں۔ میں اپنی طرف ہر تعلقہ دار کے میاں ایک شاعر بھی دیکھتا تھا جو کسی طرح بھبک منگوں سے حتمی نہیں ہوا کرتا تھا۔ بہر حال میں نے پہلے خود کرنا شروع کیا کہ اس پیشے کی ذات سے دل کو جو بھبک محسوس ہوتی تھی اس پر قابو کر لوں۔ سوچتے سوچتے یہ سمجھ میں آیا کہ دنیا بھر میں اسی فی صد لوگ بھبک منگوں کی ذہنیت رکھتے ہیں۔ ہر دفتر ہر ادارے۔ ہر کام میں بھبک دینے والے اور بھبک لینے والے ہی نظر آئے۔ ہر ایک اپنے اوپر والے سے یہاں بھبک ہی مانگتا ہے اور اپنے سے نیچے کو بھبک دیتا ہے۔ اگر میری ذہنیت بھبک منگے کی ہوتی تو کبھی اسکرین نہ ہوتا۔“

”بات تو کو پسج ہی کہہ رہا ہے۔ مگر اس میں مبالغہ بھی شامل ہے۔“

”مبالغہ بالکل نہیں۔ یہاں قانونِ قاعدے اور انصاف کا خیال نہ ہو دہاں سب یا تو ڈاکر ہو جاتے ہیں یا فقیر۔“

”تو تو بجائے فقیر کے ڈاکو بنتا۔ اس میں لاکھوں کے دارے نیارے ہوتے۔“

”اس میں بڑی جلدی پکڑا جاتا۔ سب کمائی لگن جاتی۔ ڈکیتی جرم ہے۔“

بھبک۔ لگن جرم نہیں ہے۔ ڈکیت سے ہر شخص غت ہوتا ہے۔ فقیر پر شخص نرم

کھاتا ہے۔ غرض ایک ہفتہ کے اندر ہی میں نے اپنے دل کو بھیک منگانی پیرامنی کر لیا۔ اب سوال آیا عمل کیا تو میں اب بوس اسٹاپ پر جا کر کھڑا ہوا اور وہاں سے گزرتے ہوئے ہر فقیر کو بھوکہ دیکھا۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ اسی فی صدی بنے ہوئے ہیں۔ اپنے کو گندہ بنا رکھا ہے تاکہ کوئی غور سے نہ دیکھے۔ مجھے بھی ان کی گند کی پر پہلے پہلے بڑی گھن آئی مگر بعد میں محسوس ہوا کہ خوشامدی اپنے دھن اور دھن دروہوں کو پست یا گندہ بنائے رہتے ہیں تاکہ ان کو دینے والا ان سے خوش رہے۔ ہر قسم کی جسمی کمزوری اور جتنے ہیں تاکہ ان کے اندر چھپی ہوئی روح دکھائی نہ دے۔ پھر دوسری چیز یہ نظر آئی کہ جنہی ترس ناک صورت بنائی جائے گی اتنا ہی زیادہ بھیک ملنے کے امکان میں۔ میں نے اس سلسلے میں بھی خوشامدی لوگوں کا فقروں سے مقابلہ کیا۔ وہ بھی بوس کو خوش کر کے اپنا رونا روئے گئے ہیں اور اپنے کو ترس کے قابل ثابت کر دیتے ہیں۔ یہ سب ٹھیک ہے مگر تجھے یہ ظاہری سامان کہاں سے بلا؟

”خیر جب میں نے طے کر لیا کہ بھیک منگا ہی بنوں گا تو پھر ایک اُستاد کی ضرورت ہوئی اور وہ بھی مل گیا۔“

”کسی بھیک منگنے سے تجھے یہ سب سیکھا پڑا۔ خود نہیں کر سکتا تھا۔“

”کہہ رہا ہوں تجھ سے کہ یہ فن ہے ’فائن آرٹ‘ ہے۔ ایسے ویسے ہی آجاتا؟“

خیر میں تو تجھے استاد بھی کیا ملا۔ تجھے بڑا تعجب ہو گا۔“

”تعجب کی کیا بات؟“

”وہ اُستاد نہیں اُستاد فی حق۔ مرد نہیں عورت تھی۔“

”عورت؟ عورت جب صاف ہو تو اس سے زیادہ صاف چیز ممکن نہیں۔ اور

جب گندی ہو تو اس سے زیادہ گندی تو کوئی گندی گر جیابھی نہیں ہوتی۔ کوئی بڑی گندی بڑی ہی گندی عورت ہوگی، اس کا ذکر نہ کر مجھے سوچ کر ہی گھسی اڑ ہی ہے۔
 "مسن تو سہی۔ میری فن کاری تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ میری مستانی کے فن کو نہ جانے۔ یہ لکھیہ تو ہم نے سانف پڑھا تھا نا کہ فنکار کی روایت کا مطالعہ ضروری ہے؟"

"اچھا خیر تیار۔ وہ کون تھی اور کیسی تھی؟"
 "تجھے دکھا بھی دوں گا کہ کون ہے اور کیسی ہے؟"
 "میں دیکھنے سے باز آیا۔ اپنا قصہ سنا؟"

"جس دمچ کا تو نے مجھے دیکھا بالکل اسی طرح کا ایک فقیر تھا اور اس کے ساتھ ایک عورت پھرتی تھی۔ سا نولا رنگ، منہ پر قسم کے میلے دمچے۔ تاک پر ایسا نشان جیسے کسی نے ناک کاٹنے کی کوشش کی ہو، ہاتھیں چڑائی ہوئی اور پانی بہتا ہوا، بال بکھرے ہوئے اور بٹلیں پڑی ہوئی جو منہ پر لٹکتی تھیں۔ کپڑے حد سے زیادہ میلے۔ ناک بھی ہتی ہوئی تھی۔ اور بار بار اپنی حد سے زیادہ سیلی چادر سے پونچھ لیتی تھی فقیر بہت بڈھا تھا۔ اور بس اسٹینڈ پر آ کر گر جاتا تھا۔ فقیروں کا مطالعہ کرنے میں میں نے ان کو بار بار غور سے دیکھا۔ شاید اس لئے اور بھی ان کو ضرور دیکھا کہ ان سے زیادہ گندے ممکن ہی نہیں تھے۔ عورت کی حد سے زیادہ گندگی کے پیچھے مجھے کوئی پر اسرار بات نظر آئی۔ میں ان کو ہر پھر کر دیکھنے آتا۔ اور ایک دن جب وہ جانے لگے تو ان کے پیچھے ہولیا۔ بڈھا بڑی شکل سے چل پاتا تھا۔ عورت اسے سہارا دیتی تھی۔ آخر کو انہوں نے رکشہ کی۔ میں نے بھی ایک رکشہ کی

اور کہا کہ ان کے پیچھے پیچھے چلو۔ دونوں رکشے آگے پیچھے چلتے رہے اور ڈی سلواٹوں پہنچے۔ میری جیب میں کل پانچ روپیہ کا نوٹ تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر رکشہ کا کرایہ زیادہ ہو گیا تو کہاں سے دوں گا اور پھر واپسی کیسے ہو گی۔ مگر میں نے دیکھا کہ آگے کا رکشہ ایک ادھ بنے بغیر پلاسٹر کے بنگلے پر جو سب سے الگ تھا ڈکاوڑ دونوں اتر ہی رہے تھے کہ میں نے اپنا رکشہ بھی رکوا دیا۔ کرایہ کوئی چار کے قریب ہوا تھا۔ وہ میں نے ادا کیا اور لپکتا ہوا ان دونوں کی طرف بڑھا۔ وہ بنگلے میں چلے گئے۔ میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ وہاں اس وقت تک بہت ہی کم آبادی تھی۔ اور میں لینے کے لئے کافی دور جانا پڑتا تھا۔ کچھ دیر میں سوچتا رہا کہ اگر ان لوگوں سے ملاقات نہ ہوئی تو پھر کوئی بات نہ ہوئی۔ مکان سے کچھ دور پر میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا پھر خیال آیا کہ بھیک مانگنے کا عمل شروع کرنے کے لئے اچھا موقع ہے۔ میں اٹھا کر اس ادھ بنے بغیر پلاسٹر کے گھر کی طرف بڑھا اور جدھر سے وہ دونوں گئے تھے وہاں پہنچ کر آواز لگانے کی کوشش کی مگر وہ سے آواز نہیں نکلی۔ کئی دفعہ کوشش کر کے میں نے کہا: ”اٹھ کے نام پر...“ اور پھر آگے سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔ خیر اتنی ہی آواز کا گر ہو گئی۔ سامنے کی طرف ایک گھر کی تھی اس میں سے ایک جوان لڑکی سانولی رنگت کی جھانکی۔

”یہ وہی گسنولی عورت تھی؟“

”اس وقت بالکل یقین نہیں ہوا کہ وہی تھی۔ اس کی سانولی رنگت میں عجیب کیف تھا۔ چہرہ پر کہیں کوئی دھبہ یا نشان نہ تھا۔ ناک پر کتے کا نشان بھی غائب تھا۔ آنکھیں کٹورا ایسی کھلی تھیں اور وہ ایک ہی جھلک میں مجھے صفائی اور

نفاست کا محترمہ نظر آئی۔ میں پھر آواز لگانا بھول ہی گیا۔ وہ کھڑکی سے غائب ہو گئی۔
 پھر اس جگہ سے آواز آئی جو مکان کا خاص دروازہ ہونے والا تھا اور جس میں ابھی
 دروازہ نہیں لگا تھا۔ ادھر آجائے تھیں ادھر گیا وہ دیوار کی آڑ میں رہی اور کہتی رہی۔
 ”میں اس وقت بڑی مشکل میں ہوں۔ میرے والد کو دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔ دوا کی
 سخت ضرورت ہے۔ آپ پر میں اعتبار کر کے روپے اور نسخہ دیتی ہوں۔ جلد سے
 جلد جا کر دوا لائیجئے مجھے آپ کی صورت دیکھتے ہی آپ پر اعتبار ہو گیا اور آپ
 یہ کام ضرور کر دیں گے جلد ہی“ اور یہ کہہ کر اس نے نسخہ اور پچاس روپیہ کے نوٹ
 آڑ سے ہاتھ بڑھا کر مجھے دیئے۔

”تو وہ روپیہ لے بیٹھ رہتا تو وہ کیا کر لیتی؟“

”کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ مگر یا رکھ باتیں بڑی پر اسرار ہوتی ہیں اور انسان کو بڑی

طرح باندھ لیتی ہیں اس کے اعتبار نے میرے دل سے ہر خیال نکال دیا۔“

”اور یہ بھی نو کہہ کہ اس کے حسن نے باندھ لیا۔“

”ایک حد تک یہ بھی ہو سکتا ہے مگر اس وقت میرے اندر وہ انسان جاگ

گیا جو اعتبار کرنے والے کو دھوکہ دینے سے گریز کرتا ہے اور پھر میرے اندر ایک

عزم بھی پیدا ہو گیا جس کے ماتحت میں لپکتا ہوا بس اسٹینڈ کی طرف چلا۔ اتفاق

سے ایک رکشہ بھی جاتی دکھائی دی اور اس پر بیٹھ کر ناظم آباد تک پہنچا جہاں اتر کر دروازہ

کی دکانوں پر میں نے نسخہ دکھایا چھنیس روپیہ کی دوا ملی اور میں اسے لے کر پھر

رکشہ پر روانہ ہوا اور اس گھر پہنچ گیا۔ جب میری رکشہ اس گھر پہنچی تو وہ کھڑکی

پر آئی۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی مگر مجھے دیکھتے ہی وہ کھل کر بولی۔ ”پہلے آئیے“

میں دو دانہ پیر پہنچا اور رنگ گیا۔ پھر آواز آئی: ”اندرا آجائے نا“ میں اندر گیا۔ ایک اوجھلے کمرے سے ہو کر دوسرے کمرے میں پہنچا جو ہر طرح مکمل تھا۔ یہاں مسری پر جس پر نہایت صاف بستر تھا ایک بڈھا پڑا بڑی لمبی لمبی سانس لے رہا تھا۔ دو اینے اس لڑکی کو دے دی تھی۔ اس نے مجھے مسری کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور خود دو انا پنے لگی۔

”آپ انہیں سنبھال کر آٹھا لیجئے“ اس نے کہا

میں نے بڈھے کو بیٹھ کے نیچے ہاتھ لگا کر آٹھا یا اور اس نے اس کے منہ میں دو انا دی۔ بڈھے نے کچھ منہ بنا یا۔ اس کے سانس میں کچھ فرق آیا۔ میں نے اسے لٹا دیا اور وہ سونے سا لگ گیا۔ ہم دونوں بستر کے پاس کھڑے ہوئے کافی دیر تک اس کی حالت کو دیکھتے رہے پھر وہ غافل ہو گیا۔ اس نے پھر مجھے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ بڈھا خراٹے لینے لگا۔

”اب ٹھیک ہو گئے“ وہ اطمینان کی سانس لیتے ہوئے بولی: ”میں نے تیرے آٹھا کر دیا لینے کے لئے جانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ آپ کی آواز آئی۔ آپ کیا چاہتے تھے۔ اب بتائیے“

”میں بھک مٹکا بنا چاہتا ہوں اور اس کی پہلی کوشش میں نے آپ کے دروازے پر کی“

”مگر نا کام رہے۔ میں بڑی مشکل سے آتا ہے“ وہ مسکرا کر بولی اور اپنے سفید دہچکے کو جو اس کے رنگ پر کھیل رہا تھا سر پر سنبھالا۔ اور اور کہتی رہی: ”آپ کئی دن سے ہم لوگوں کے پاس آ کر جاتے رہے اور آج آپ نے ہمارا صاف بھیجا کیا۔

میں نے آپ سے کہا کہ یہ مرد ہم لوگوں کے پیچھے لگا ہے۔ انہوں نے اپنے تجربے سے کہا شاید وہ بھی ہمارے پیشے میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ اچھا اگر اور قریب آیا تو اسے راہ سے لگائیں گے۔ یوں باتیں کرتے کرتے ان پر دورہ پڑا میں نے دوا کی پیشی دیکھی سب دوا ختم ہو چکی تھی میں نے برقعہ اٹھایا یہ تھا کہ آپ کی آواز آئی۔

”آپ کو یہ خیال نہیں ہو اگر میں بچا پس رو پیہ لے کر بھاگ جاؤں گا؟“

”ہرگز نہیں۔ آٹھ برس سے چہرے دیکھتے دیکھتے مجھے آدمی کی پہچان ہو گئی ہے اور آپ کا پریشان چہرہ کھویا کھویا کسی تلاش میں۔ روز ہی دیکھا کرتی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ آپ ہم لوگوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ کیوں ہے نہیں؟“

”میں نے کہا بات یہی ہے؟“

”اچھا تو بھڑاپ میرے ان والد کی جگہ لے لیں۔ یہ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔“

میں آپ کو ان کی طرح سجادوں کی، کل صبح نزل کے ہی آجائیے؟

”میں نے سوچا کہ میری حیب میں قریب بارہ آنے ہی ہیں۔ اس وقت جانا کل

پھر نا چھیسوں کی ضرورت ہوگی۔ خیر گھر پر معنی یہاں میرے پاس پیسے تھے اس نے میں نے اس سے کچھ مانگنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس نے خود کہا: پیسے نہ ہوں تو میں دسے دوں؟ مگر میں نے کہا: ابھی اس حد کو نہیں پہنچا ہوں۔ اور اس کے بعد میں اس کے یہاں سے چلا آیا۔“

”واہ میں تو سمجھا تھا کہ رات کو تو وہیں رہ گیا اور اس ترکی سے احتلاط ہو گیا۔“

”اور کوئی ترکی ہوتی تو یہ ممکن تھا۔ مگر وہ ترکی عجیب چیز تھی اور اب بھی عجیب ہے

میں تجھے دکھاتا ہوں گا۔ وہ بالکل آسانی ہے بالکل۔ آٹھ برس بھیک مانگنے نے

اسے بڑا پگا کر دیا تھا۔ اور تو اس سے باتیں کر کے دیکھے گا کہ اس کا ذہن کس قدر بخت ہے۔ خیر دوسرے دن میں آگیا۔ بڈھا ٹھیک تھا۔ ٹرکی گھناؤنی میں چکی تھی۔ اور مجھے دیکھ کر ہنسی، اس نے اپنے باپ کے فقیروں والے سب کپڑے مجھے پہنائے میری ٹانگ ٹیڑھی کر کے اس پر قیسا اور جھلی باندھی۔ بیساکھیاں دیں۔ غرض میں نے قیادام آئینے میں جو اس لڑکی کے کمرے میں رکھا تھا دیکھا تو میں بالکل فقیر معلوم ہوتا تھا اپنے کو چچاں نہیں سکتا تھا۔“

”گھراس بڈھے کے چہرے پر جھڑپاں ہوں گی اور تیرا چہرہ تو صاف ہے۔“
 ”وارھی مونچھوں، گندے دھبوں، ناک، گال، ماتھا سب ہی پر میل لگا لینے سے میرا خیال بھی اس طرف نہیں گیا کہ میرے چہرے پر جھڑپاں ہیں بھی کہ نہیں۔ اور بھیک دینے والوں میں چہرے کو کون غور سے دیکھتا ہے۔ اور میری دلیج دیکھ کر لوگ منہ میچ لیتے ہیں اور زیادہ تر منہ میچ کر ہی پیسے پھینکتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ پہلے ہی دن مجھے چشٹرن کا وہ قول یاد آیا جو میں نے اور تو نے ایک ساتھ پڑھا تھا کہ لوگ ایک دوسرے کو غور سے دیکھتے ہی نہیں اور خاص پیشوں کے آدمیوں کی تو محض دردی ہی دیکھتے ہیں۔ یاد ہے نا تجھے وہ فادر براؤن والا قصہ اور اس شخص کا کیا نام ہے اس کا جو ڈاکٹری دردی بہن کو صاف نکل جاتا ہے اور کوئی اس پر شبہ بھی نہیں کرتا کہ یہ جرم ہے۔“
 ”ٹھیک ہے میں تجھ سے بار بار جلا کر کہی تجھے غور سے نہیں دیکھا۔“

”تو خیر کئی دن تک میں اور وہ لڑکی ساتھ ساتھ بھیک مانگتے رہے میں اسے یہاں بھی لایا۔ مجھے اس سے محبت ہو گئی اور میں نے اس کے باپ کی اجازت سے اس سے نکاح کر لیا۔ اس کے بعد وہ میرے ساتھ نہیں آئی۔ میں خود رواں ہو گیا

ہوں ہر صبح اُٹھ بچے سے کام پر آتا ہوں۔ دو بجے تک کم سے کم پچاس کما لیتا ہوں کبھی اس سے پہلے ہی پچاس ہو جاتے ہیں تو یہاں آکر وہ کپڑے اُتار دیتا ہوں اور گھر چلا جاتا ہوں۔ یہ فلیٹ میرا اسٹوڈیو سمجھو گھر وہی ہے چل میں تجھے دکھاؤں؟

وہ فلیٹ کے اندر والے کمرے میں گیا۔ اور وہاں سے پورا آپ ٹوٹین جھٹکین بن کر آیا۔ ہم دونوں فلیٹ میں قفل ڈال کر باہر شکر پر آئے۔ وہ ایک گراں پر پچا اور وہاں گراں والوں کو پیسے دے کر ایک نہایت نفیس فوکس داگن کار میں بیٹھا۔ اور مجھے ساتھ لے کر روانہ ہو گیا۔ وہ بولا: "کار میں یہاں چھوڑ دیتا ہوں۔ ان سے حساب ہے کچھ پیسے اور دے دیتا ہوں فلیٹ پر پہنچ کر درجہ بدلتا ہوں اور کام ختم کر کے پھر یہاں آجاتا ہوں۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں کسی بڑے دفتر میں ملازم ہوں۔ غرض ہم دونوں ٹوی سلوا ٹون پہنچے اور ایک مکمل بنگلے پر اتارے اُس نے گراں پر گاڑی کھڑی کی اور باہر آکر کہا: "یہ وہی بنگلہ ہے جس سے میرا قصہ شروع ہوتا ہے۔ اب ہم نے اسے مکمل کر لیا ہے۔ چار برس میں۔"

دسی نے مجھے ڈرائنگ روم میں بیٹھایا اور خود اندر چلا گیا ٹھوڑی دیر کے بعد وہ میرے پاس آکر بیٹھا اور آواز لگائی: "آج آنا سمینہ شرم کا ہے کی؟"

سمینہ داخل ہوئی اُسے دیکھ کر مجھے اپنے دیہات کی وہ ٹوکیاں یاد آئیں جن کا ناک نقشہ بس راجہ راجہ اچھا ہوتا تھا۔ مگر سائلی رنگت کا ٹنک خاص طرح جاذبِ نظر ہوا کرتا تھا۔ مگر سمینہ ان سب سے ان معنوں میں بہتر تھی کہ اس کے چہرے پر ایک خاص ذہانت معلوم ہوتی تھی کہ زندگی کے جھربے نے اس میں ایک بردباری اور ایک توازن پیدا کر دیا تھا جو دیہاتی پن کا بالکل متضاد تھا۔ نہ کھانے کی میز پر

کھانے کو سامان ٹھیک کرنے لگی اور میں نے دسی سے کہا یہ تو برا خوش قسمت ہے
ایسی بیوی کہیں ڈھونڈنے نہ ملتی اور تجھے آسمان سے ٹپک کر مل گئی؟

”بیوی نہیں“ ہر بات میں میری آسانی ہے؟

سمینہ کے ساتھ ہم مینو پر بیٹھے وہ مسکراتی اور بولی۔ ”جلد سے جلد میں ان سے
یہ کام چھڑانے والی ہوں۔ ایک زمین اور لے لی ہے۔ اس پر مکان بن جائے پس
اسکے کرایہ سے اس مکان میں رہا کریں گے۔ وہ فلیٹ بھی جو ان کا ہے کام ختم کرنے
پر یک جائے گا اس کے رویہ سے بھی کوئی آمدنی کر لیں گے۔ انہوں نے موٹر
لے لی تھی‘ ورنہ اب تک سب ٹھیک ہو جاتا۔ خیر اچھا ہوا موٹر بھی ضروری چیز
ہو گئی ہے۔ آج کل؟“

”مگر فن کار اپنا فن کبھی چھوڑتا ہے۔ اس پر چلنے کی عادت پڑ جاتی ہے؟“
میں نے کہا۔

دسی نے کہا ”مگر یہ فن ایسا نہیں ہے۔ ان کے والد نے یہاں آکر اختیار کیا۔
بور ہو گئے تھے۔ میں ان کا نمائندہ بنا۔ وہ ایک دن چل بسے سمینہ بھی بور ہو گئی
تھی کیوں سمینہ؟“

”ہاں جن کاموں کی عادت ہو جاتی ہے انہیں کرتے اچھا لگتا ہے مگر یہ کام
ایسا ہے کہ عادت نہیں پڑتی اور طبیعت اس سے الگ ہو جانے کو چاہتی ہے
ابا مرحوم نے موقع سننے ہی چھوڑ دیا میں نے بھی موقع ملنے ہی چھوڑ دیا اور یہ بھی
دل پر جبر کر کے ہی کر رہے ہیں۔ جتنا ہم لوگ خرچہ کرتے ہیں اتنی آمدنی کا جس
دن مستقل سلسلہ ہوا۔ بس یہ کام چھوڑا۔ اور شریفوں کی طرح زندگی بسر کرنے لگیں گے۔“

”تو یہ فن نہیں پیشہ ہے۔ ہر پیشے کے لوگ اپنا کام نبھاتے ہیں اور حجب موقع ملتا ہے کام سے شُبکدوش ہو جاتے ہیں۔“

”نہیں، میں تو اسے فن ہی کہوں گا اور پھر ہر پیشے کو ٹھیک طور سے کرنے کے لئے فن درکار ہے۔ گو فن کے معنی پیدائشی فن کے لئے رہا ہے ان فنون میں یہ نہیں ہے مگر بغیر فن کے یہ چل نہیں سکتا۔ سمیٹہ کے والد نے اسے فن کی طرح بُرتا۔ اس نے بھی یہی کیا اور مجھے بھی فن کی طرح سکھایا اور میں فن ہی کی طرح برتا رہا ہوں۔“

• سیپ کراچی

مواد

پھٹی اس وقت مویشیوں کو چارہ ڈال رہی تھی۔

میں دبے پاؤں اُس کے قریب پہنچا اور اُسے اپنے بازوؤں میں بچھنے لیا۔
 مویشیوں کی بڑیوں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک خوب صورت گائے عورت جن کو
 میرے سینے سے لگی ہے۔ میں نے پیاری سی گائے کے ہونٹ چوم لئے۔ شاید اس
 کے ہونٹ پہلی بار کسی کے ہونٹوں سے مس ہوئے تھے اور وہ نہیں جانتی تھی کہ
 چومنا کیا ہوتا ہے کیونکہ جب میں اُسے چوم رہا تھا تو اُس کی آنکھیں کھلی تھیں۔
 میری آنکھوں کے سامنے بدین آگئی، جسے زندگی میں پہلی بار میں نے چُجا
 تو اُس نے بیزاری سے منہ پھیرتے ہوئے کہا: ”تو برا جھگی۔ چومنا بھی نہیں آتا۔“
 — اور پھر دوسرے ہی دن اُس نے مجھے ایک کتاب دی ”ہنڈ بک ویزن کنگڈم“
 — مگر اُس وقت خوب صورت گائے کو سینے سے لگائے سو طرفتوں کے
 ایک ہی سیدھے سے طریقے نے ہونٹوں میں زندگی کی وہ بیٹھی سی حرارت پیدا کر لی

جو سارے جسم میں پھیلنے لگی۔

یہ ایک جسم میں ایک تھر تھری سی ہوئی۔ آہٹ نہ جو لگا دیا۔ پلٹ کر دیکھا کوئی نہیں تھا مگر دوسروں کی چاب قرب تر آتی گئی۔ یہاں تک کہ ماسی دودھ اور اس کے آگے سے پہلے ہی میں سنبھل چکا تھا۔ پھر بھی جانے کیوں میں اپنے آپ کو اپنے ہی آپ میں چھپانے کی کوشش کرتا رہا۔ میں نے بے ساختہ بے ہنگم لہجے میں کہا: دیکھا ماسی یہ بچتی مجھے کلاڑی بنا کر نہیں دیتی؟

ماسی نے اپنی سہن پر اتراتے ہوئے کہا: تمہاری ماں ٹھیک ہی کہتی تھی کہ تم نہیں بدلے۔۔۔ لو میں اپنے بیٹے کو ابھی کلاڑی کھلاتی ہوں؟

یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھی ماسی کی مشکل اٹھائی۔ ہمیں ساتھ چلنے کو کہا۔ آگے میں پہنچے تو میں چار پانی پر بیٹھ گیا اور پستی سمٹی سمٹی موشیوں کو چارہ کھلانے کے بہانے وہاں سے کھسک گئی اور اس کے ساتھ ہی میرا دل بھی۔ خود ہی کھسکنا چاہتا تھا مگر ماسی آنکھوں کے سامنے تھی۔ اس نے کسی دیکھی میں ہٹیلی اور دیکھی جو ٹھیک پر چڑھا دی۔ یہ چو لہا ہمیشہ گرم ہی رہتا۔ چو لہے میں آگ نہ ہو تو خیال کیا جاتا کہ گھر میں غرست ہے۔ جھڑی ہی دیر میں ماسی نے کسی میں دودھ ملا دیا۔ دودھ کے پھٹ جانے پر پانی اگ ہوا تو اسے ایک پوٹلی میں چھان لیا پوٹلی میں جو بچ رہا اس کی مدد سی بنا دی یہی کلاڑی تھی، پیز سے ملتی جلتی۔

”لو بیٹے کھالو“ ماسی نے تام چینی کی پلیٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ پلیٹ سامنے رکھ لی اور کلاڑی کھاتے ہوئے میں سوچنے لگا کہ کلاڑی کھانے سے ماسی یہ سمجھتی ہے کہ میں نہیں بدلا۔ اسے کیا معلوم کہ میں اور ڈیڈی کہتے بدل چکے ہیں۔ بالکل اسی طرح

جیسے دیکھتے ہی دیکھتے زمانہ بدل چکا ہے۔ ہاں ایک اسی ذرا ابھی تک وہی ہیں تو کیا ہوا، ہم تو بدل چکے ہیں۔ ٹیڈی می کہنے والے یہاں سے گئے تو میں اپنے بابا اور امی کو امریکی لیے میں ٹیڈی اور مٹی کہنے لگا۔ یہی لہجہ اختیار کرنے پر ٹیڈی کی شان بڑھی۔ شان پیسے سے بڑھتی ہے اور اس کے ساتھ ہی آن بھی۔ اسی آن بان سے اپنے ٹیڈی لیڈ بھی ہو گئے۔ آزادی کشمیر کی تحریک کے سرگرم کارکن شہدائے کشمیر کا یوم آئے یا آزاد کشمیر کا، ٹیڈی بھرے جلسے میں دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں۔ غاصبوں کے خلاف زہرا اٹھتے ہیں اور آخر میں ہمیشہ یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ دن قریب آ رہا ہے جب فرزند ان نو حید تقریر کا رکی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔۔۔۔۔ ٹیڈی کی یہ تقریریں سنتے سنتے میں جوان ہو گیا۔ اس دوران میں نے یہ دیکھا کہ ایک ایک اینٹ جمع کر کے میرے ٹیڈی نے پہلے آزاد کشمیر میں پھر راولپنڈی اور اب لاجپور میں کئی کوٹھیاں کھڑی کر لی ہیں۔

میرے خالو کا کاکیر جوا کٹر کھا کرتے ہیں کہ تمہاری ہر کوٹھی تقریر کا رہے تم کبھی نہیں چاہتے کہ کشمیر کو آزادی نصیب ہو تمہیں خطرہ ہے کہ کہیں تمہارے نصیب کا نہ بدل جائیں۔ یہ کاکیر جو نہیں بدلے۔ ٹیڈی ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ وہ نرس جذباتی آدمی ہیں کشمیر کی سرحد پر وہ کشمیر لینا چاہتے ہیں۔ اقوام متحدہ کا تقوُّلم نہیں مسئلہ کشمیر وہیں ملے جو کاکیر وہ کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ اٹا نہیں طعنہ دیتے ہیں کہ مسئلہ کشمیر کی بدولت ہی تمہاری شان و شوکت ہے۔

ٹیڈی ٹھیک ہی کہتے ہیں مگر جانے کیوں پچھتی کو دیکھ کر یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ کاکیر جو سچے اور خلص مزود ہیں۔ اسی نے انھوں نے آزاد کشمیر کے

کچے کوٹھے ہی میں اپنے کردار کو چھنہ بنانے رکھا۔ آزاد کی کشمیر کے لئے جنگ ہوئی تو وہ اپنے جوان بیٹے نور الدین کے ساتھ محاذ پر لڑتے رہے۔ محاذ پر نور الدین شہید ہوا۔ وہ آج بھی بڑے فخر سے اُس کی شہادت کا واقعہ بیان کرتے ہیں تو دل ہی دل میں شرمندہ ہوتا ہوں کہ میرے ڈیڈی نے جنگ کے دوران مجھے امیٹ آباد بھجوا دیا تھا اور خود فائر بندی کے بعد بڑے شہرروں میں تقریریں کرتے ہوئے سرحد پار سے آئے ہوئے مہاجرین کے لئے کپڑاٹا اور چندہ جمع کرتے رہے۔ اس وقت ایک امیٹھیں ہوا بھی تک کچھ ویسی ہی ہیں۔ مجھے سے کہا کرتیں کاش تو بھی سُندا ہوتا؟

نور الدین کو پار سے سُندا کہتے تھے۔

میں بھلا مُندا کیسے ہو سکتا تھا۔ کانوٹ میں تعلیم پائی یسوع مسیح کلیسہ کا رنڈنا تو مسلمان بھی نہ رہا۔ سکول سے کالج تک ایسے ماحول میں رہا کہ اپنے ہی گھر میں اجنبی ہو گیا۔ نور الدین میری طرح نہیں بدلائوٹھا۔ اُسے کا کایسٹو ہمیشہ یہ کہتے کہ دیکھو بیٹے زندگی یہی ہے کہ اپنی سرزمین کو آزاد کرائیں! — اور میرے ڈیڈی مجھے قائل کر لیتے کہ دیکھو بیٹے جذباتی ہونے سے زندگی کسی کام کی نہیں رہتی۔ دیکھو تمہیں میری طرح اپنا اثر دوسروں پر بھانا ہے۔ قوم کی راہنمائی کرنی ہے۔ بڑے لیڈروں کی تقریریں پڑھو — اور پھر ملکی اور غیر ملکی لیڈروں کی تقریروں پر مبنی کتابوں کا پھاٹا میرے سامنے کھڑا ہو جاتا اسی پھاٹا کی اوٹ سے میں وادی کشمیر کے پہاڑوں پر نظر رکھتا لیکن مُندے کے سامنے کتابوں کا ایسا کوئی پہاڑ نہ تھا۔ سرحد اُس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ وادی کشمیر اور اس کے پہاڑ اُس کی آنکھوں میں سمائے ہوئے تھے۔ وہ غاصبوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھتا اور دل کی استغاثی گہرائیوں میں

اپنے بابا کی یہ آواز سننا رہتا یہ بیٹے زندگی یہی ہے کہ اپنی سرزمین کو آزاد کروائیں!“
 بن بھلا اُٹھا کیسے بن سکتا تھا؟ اس کا باپ سپاہی بن کر یہاں آباد ہوا۔ اُس
 نے تقریریں نہیں کیں۔ آلات منٹیش نہیں کرائیں۔ تجارت نہیں کی۔ وزارت نہیں کی
 صدارت نہیں کی۔ دولت جمع نہیں کی۔ کوٹھیاں تعمیر نہیں کیں۔ ایک ہی کچے کوٹھے
 میں رہ کر وہ اپنی بات کو پکا نکالا۔

اسی دُروانہ نے بات کہی کرنے کے لئے کا کا کبیر پو سے کہا: ”بہن پیغام لے کر
 آئی تھی تو کیوں نہ بھر.....“
 کا کا نے بات کاٹتے ہوئے کہا: ”بھتی کی شادی کی بجائے؟“
 ”ہاں تو اند کیا۔ آخر یہ بھی ایک فرض ہے!“
 کا کا نے ٹھنڈی سانس بھری: ”ہمارا فرض تو یہی ہے کہ ہم آزادی کے لئے
 قربان ہو جائیں!“

اسی دُروانہ نے بے اختیار دردنا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ساتھ ایسی
 باتیں کر دیں کہ کا کا کبیر پو نے اس فرض کو بھی محسوس کر لیا اور شاید اسی احساس پر
 وہ کہنے لگے ”جہانے کیوں مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ اپنے ہو کر بھی اپنے نہیں رہے۔ وہ
 تو اپنے ہی سے میگنا ہو چکے ہیں۔“ مگر تم کہتی ہو۔“

کا کا کبیر پو رگ گئے اور اس کے ساتھ ہی دروازے کی اوٹ میں کھڑے
 کھڑے مجھے یوں محسوس ہوا کہ اپنے دل کی دھڑکن بھی قلم لگی ہے مگر پھر آواز آئی: ”تم
 کتنی ہو کہ بھتی خوش رہے گی۔“ اچھا تو یوں ہی سہی۔ پر سوچ لو تمہارے بہنوئی

بڑے لیڈروں میں شمار ہوتے ہیں۔ بڑے نام والے ہیں۔ دولت، عزت سبھی کچھ سمیٹ کر بیٹھ گئے۔ اور ہمارے پاس کیا ہے؟“
 کا کاکیر جو گری خاموشی میں کھو گئے۔ اسی خاموشی میں جیسے کسی نے مجھ سے یوں کہا کہ اصول پرستوں کے پاس پیسہ نہ ہو تو وہ ایمان کی بدولت سمیٹ کر دکھتے ہیں۔

دکھتے سنتے ہی پھمتی جوان ہو گئی تھی کسی چٹان میں سے ترشی جوتی یوں لگتا تھا کہ بنانے والے سنگ مرمر کو ٹھکانی پھولوں میں گوندھ کر اُس کا توانا جسم تیار کیا۔ صحت مند، سرخ و سپید اور مکتا ہوا میرادل چاہتا تھا کہ وہ بادلوں میں تحلیل ہو کر شہر شہر برس پڑے اور وہاں کی فوجوان بردہیں اس بارش میں نہا کر صحت مند، حسین، بھفکش اور سادہ ہو جائیں۔

پھمتی اور میں کوئی بارہ ہزار فٹ کی بلندی سے ٹیڑھ گھلی کی چوٹی پر سرحد پار وادی کشمیر کو دیکھ رہے تھے کہ اُن کی آن میں کالے بادل اُٹھ کر اُگے اور چھا چھم برسے لگے پھمتی نے میرا ہتھ پکڑا اور بارش سے بچانے کے لئے قریب ہی ایک غار میں لے گئی پہلی بار ہم دونوں کو مکمل تنہائی نصیب ہوئی تھی۔ دونوں ایک پتھر پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔ ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں جذب کرنے لگے۔ یکایک بھلی کڑکی تو میں بے اختیار اُس سے پٹ گیا۔ وہ مسکرائی تو میں آپ ہی آپ شرمایا۔

پروین کے سامنے بھی غمزدہ ہوا تھا اپنے جھگی پن کے احساس پر اور میں بھٹکا کبھی نہیں مجھول سکتا جب سینہ دیکھ کر کانٹنی نیشل گئے۔ کچھ پیا، کچھ کھایا۔ گھر لوٹے ڈیڈی اور مٹی آنا د کشمیر میں تھے۔ گھر میں فقط میز راج تھا۔ پروین نے گھر میں قدم رکھا تو ایک خاص ادا سے انگڑائی لیتے ہوئے کہا: "ہائے سچی میں خفا گئی ہوں۔ یہ تمہارا میٹروم کہاں ہے؟"

— اور ہم دونوں آخر اُس منزل پر آ گئے جس تک پہنچنے کے لئے میں نے کئی موٹر گاڑے تھے۔ کسی نہ کسی موٹر پر تنہائی میں موقع پاتے ہی بوس و کنار سے دونوں کے جسم غائبانہ طور پر ایک دوسرے سے متعارف ہو چکے تھے مگر یہ مکمل تعارف تو نہیں تھا۔ میٹروم میں داخل ہوتے ہی پروین نے خود ہی وہ کوٹ اُتار پھینکا جو اُس نے فرمائش پر سال روڈ کے اُس درزی سے سلوایا تھا جس نے کوٹ پہناتے ہوئے اُس کے کان میں آہستہ سے چھونکا تھا: "ماشا اللہ کوٹ کیسافٹ آیا ہے۔ کتنی سہاٹ لگتی ہیں آپ!"

یہ کہتے ہوئے وہ کوٹ پروین پر بوس پھیرنے لگا کہ اُس کا اپنا سارا جسم بُرش کے ہر مال میں سمٹ آیا اور اس طرح وہ بُرش بن کر کوٹ کو صاف کرتے دسے لٹکیں حاصل کرنے لگا۔

کوٹ ایک طرف پھینکتے ہوئے پروین نے اپنے آپ کو میڈ پر گرایا اور پھر پھل کر بیٹھ گئی۔ اُس کی چُست قمیص نے اُسے بھیجنے رکھا تھا۔ اس سے فارغ ہو کر اُس نے انگڑائی لی اور شادی اور مہنی مون کی باتیں کرنے لگی بھائی ہو نو لو، نیا گرا مال اور ڈنڈنی بیڈ میں کھو کر وہ میرے بازوؤں میں یوں پھیل گئی جیسے وہ عورت کی بجائے مرد کا

”میں سر سے پاؤں تک سب ہو گیا۔ مجھے بت کی طرح بے حس پاکر وہ بولی تو بنگلا

”تم بارش میں بھیگ گئے ہو تمہارے ہاتھ ٹھنڈے ہیں باپمیتھی نے مجھے چوکھوایا۔
وہ بہت پیاری لگ رہی تھی میں نے اس کے سر سے کسبے کی ٹوپی اتار دی تو
اُس کی بینڈھیاں اُس کے شانوں پر بکھر گئیں میں نے اس سے کہا: ”یہ سانپ اُس نے
ٹوپی میں اُچھا رکھے تھے“

اُس نے ساوگی سے کہا: ”یہ تو بینڈھیاں ہیں۔ سانپ تیرے دل میں ہے!“
یہ کہتے ہوئے وہ مسکرا دی تو میں نے اُس کے چمکیلے سفید دانت دیکھ کر پوچھا
”کون سی ہیٹ استعمال کرتی ہو؟“

اُس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی تو کہنے لگی ”کیا کہا؟“

”جی کہ تمہارے دانت پیچھے مڑتی ہیں!“

یہ سننے ہی اُس کے گلابی رخسار سُرخ ہو گئے۔ اُس کے گلابی رخسار اور ہاتھ
ہونٹ دیکھ کر اگر میں یہ پوچھ لیتا کہ تم کون سی رومج ادھ کون سی لپ رشک استعمال کرتی
ہو تو وہ شاید گونگی ادھ بھری لڑکی کی طرح میرا منہ نکلتی رہ جاتی۔

میں گونگی ادھ بھری لڑکی میری بیوی ہے۔

اور میں —؟

— میں اپنی دوسری بیوی پر توہین کے ساتھ سوسائٹی میں مو دکتا ہوں۔

ڈیڈی نے مجھے قائل کر لیا تھا کہ کچھتی سے تمہاری شادی تمہاری ماں کی مرضی اور قومی

خدمت کے جذبے سے ہوئی مگر تم سوسائٹی کے ایک محرز فرد ہو۔ اپنا اثر و رسوخ بڑھانے اور سوسائٹی میں مودہ کرنے کے لئے تمہیں سو فی صد بولتی پڑھتی کی ضرورت ہے اور جب میں دو لہا بن کر پڑھتی کو بیٹے آگیا تو برائیوں کی محفل میں ایک بھانڈے دوسرے بھانڈے کے نیچے شائع ہرچہڑا اس مارتے ہوئے پوچھا "تو کیا فیصلہ ہوا؟"

"بس ہو گیا؟"

"او میری — آخر ہوا کیا؟"

"بس ہو گیا کشمیر کا فیصلہ؟"

"کس نے کیا؟ — ہندوستان نے؟"

"نہیں — ہندوستان کہتا ہے کہ کشمیر بھارت کا نہیں بھارت کشمیر کا ملک ہے؟"

"تو پھر فیصلہ پاکستان نے کیا؟"

"نہیں — پاکستان کہتا ہے کہ کشمیر کا فیصلہ کشمیری عوام کریں گے؟"

"تو یہ فیصلہ کشمیری عوام نے کیا؟"

"انھیں موقع نہیں دیا گیا؟"

"او میری — تو پھر یہ فیصلہ کس نے کیا؟"

"امریکہ اور روس — دونوں نے مل کر کیا ہے؟"

"کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"فیصلہ یہ کیا ہے کہ کشمیر ہندوستان کو اور کشمیری پاکستان کو ملیں

گئے؟"

— محفل کا ہر فرد مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گیا۔

میرے ڈیڈی کے چہرے پر بھی شکراہٹ کھیلنے لگی۔
 قصہ گوکار کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے لئے اُن کو نئی تقریر کا مولو
 مل گیا تھا۔

”فنون“ لاہور

واپسی

جیل کی نضا بالکل خاموش تھی۔

یہ سکوت اور بھی گہرا ہو گیا۔ جب اُس نے سنا کہ اُس کی اپیل نامنظور ہو گئی ہے اور پچاسی کی سزا کی توثیق ہو گئی ہے مگر یہ سکوت اس کے دل کے اندر بخار بابر زندگی حسب معمول تھی سامنے والے درخت کے پتے اب بھی ہوا سے ہلکا شہر کر رہے تھے۔ دُور سے بلکل کی آواز آج بھی سُنائی دے رہی تھی، مسلاخوں والے دروازے پر چڑیا آج بھی کسی وقت بیٹھ کر چوں چوں کر دیتی تھی مگر یہ سب آوازیں آج عجیب رنگ لئے ہوئے تھیں۔ ان کا شل ہوتا ہوا دماغ ان آوازوں میں عجیب سی اجنبیت محسوس کر رہا تھا جیسے نئے بدلے موسم کی سر پہرہ، دھوپ کا انداز بھی بدلا ہوا اور سائے بھی اپنی جگہ سے کھسکے ہوئے۔

دس مربع فٹ کی اس کوٹھڑی میں وہ اس روز آیا تھا جب سیشن جج نے پچاسی کی سزا سُنائی تھی۔ اب وہ پچھلے تین ماہ سے اپیل کے فیصلے کے انتظار میں یہاں

گھڑیاں گن رہی تھیں۔

موت کی سزا پانے والوں کی کوٹھڑیاں جیل میں علیحدہ تھیں جہاں کڑی نگرانی اور زیادہ دیرانہ تھا۔ دوسرا فرق یہ تھا کہ یہاں قیدیوں کو ایک قرآن مجید دیا جاتا۔ جو وہ سارا دن پڑھنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ کئی دفعہ پڑھتے پڑھتے اس نے سوچا کہ اسی کمرے میں اس سے پہلے کئی لوگ بھی قرآن پاک پڑھ چکے ہیں، جواب اس دُنیا میں نہیں تھے۔ کئی صفحوں پر اُسے آنسوؤں کے نشان نظر آئے۔ کون جانتا ہے کہ یہ آخری وقت کے آنسو تھے یا چند روز پہلے کے۔ کیا پتہ یہ جرم پر پھٹا دے کے آنسو تھے یا کسی بے قصور کی بے کسی کے۔

قرآن کریم اس کے سامنے ہوتا اور وہ ایسے خیالات میں کھو جاتا۔ کبھی یہ سوچتا کہ یہ مقدمہ کس کتاب تو دُنیا میں زندگی گزارنے کے ڈھنگ بتاتی ہے تو اب ایسے وقت اسے کیوں دی جا رہی ہے جب دُنیا کے دروازے اس پر بند ہو رہے ہیں۔ پڑھتے پڑھتے اس کے دل میں کوئی خیال سر اٹھاتا، تو وہ سوچنے لگتا کہ کیا ان لوگوں کے احساسات بھی ایسے ہی تھے، جو اس سے پہلے اس کوٹھڑی میں رہے اور چند روز بعد پھانسی پا گئے۔

خود اسے اپنے جرم پر کبھی افسوس نہیں ہوا تھا۔

اُس نے اپنے باپ کو قتل کیا تھا۔ دن دہاڑے اور جمع نام میں۔ اور وہ اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔ بہت سلجھا ہوا اور نیک جس کی زندگی میں کبھی کوئی جذباتی طوفان نہیں آیا تھا۔ اس لئے کہ اس نے اخلاق اور اقدار کی تیبو نوڑنے کی کبھی کوشش نہ کی تھی بلکہ بچپن میں اچھا بچہ بننے کے جو اصول اُسے سکھائے گئے

تھے وہ زندگی بھر ان پر قائم رہا۔ اور بائیس سالہ جوانی میں اچھا بچہ بنا رہا۔
گادوں سے دسویں پاس کر کے وہ شہر میں ملازمت کرتا تھا کئی دفعہ شہر کی
رہنمائیوں نے اُسے اگسا با تھا لیکن اُس کی تربیت اُسے روک لیتی۔ اور یہ خیال سنا
کہ ماں کو پتہ چل گیا تو وہ کیا کہے گی۔ ماں جو اُسے دنیا میں ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی۔
اور جس کا دل دکھانے کی اس میں بہت نہ تھی۔

وہ تین ماہ سے موت کے دینگ روم میں پڑا ہوا زندگی کے متعلق سوچتا رہا
گندی ہوئی زندگی کے متعلق اس کو ٹھہری کے دیران دور و دیوار ادا تھے جو
دماغ کو سکون دینے کی بجائے گھٹن دیتے تھے اس کی فضا میں دھیرے دھیرے اس نے
والی موت کی سرسراہٹ تھی اور اس کے سلائخ دار دروازے سے نظر آنے والے
بھنگی، جیل اسٹاف، نگہری، پڑیا اور چوڑے گندی ہوئی زندگی کی یادوں کے پت کھولتے
جاتے۔ اس وقت اس کی سابقہ محرومیاں کھل کر ڈھنسنے لگیں پسینے پانی مٹی جواہر
تندیر میں جاتیں، دفن شدہ دلہرانے لگتے۔ مزید زندگی کی خواہش ترپنے لگتی اور
قسمت کے خلاف لگے شکوے قطار اندر قطار اُٹھنے لگتے۔

اس کو ٹھہری میں قرآن کے صفحات پر خالی خالی نظر میں جاتے اس دن میں کئی
کئی دفعہ سارے واقعات ذہن میں دہرائے تھے جو قتل سے متعلق تھے۔
سب سے پہلے اُسے ماں کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ اب اس کا باپ جھگڑتا
رہتا ہے۔ خط میں نہ کوئی خاص وجہ لکھی تھی اور نہ جھگڑے کی نوعیت بتائی تھی۔ اس
نے یہی سوچا کہ ماں کے پاس خط لکھنے کو اور کچھ نہ تھا۔ اس لئے اس نے اس غیر
چیز کا ذکر کر دیا ہے ورنہ ماں باپ میں جھگڑے کہاں نہیں ہوتے۔

اگلے ایک دو خطوں میں خاموشی تھی۔ اس نے جب باپ اسے ملنے آیا تو اس نے یہ مومنوع نہ چھیڑا۔

چند روز بعد وہ گھر گیا تو ماں باپ کے چڑچڑے پن کا سرسری سا ذکر کیا اور بس۔ اس کے اپنے مشاہدے میں کوئی پریشان کن چیز نہ آئی۔

پھر ایک دن اُسے ماں کا مفصل خط ملا۔ جس میں اُس نے لکھا تھا کہ اس کا والد پچھلے کئی دنوں سے اُسے نزد کوکب کر رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ نئے قانون کے تحت میں اسے دوسری شادی کی اجازت دے دوں۔ اور دوسری شادی میں بددلی کر دوں پھر ماں نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ دوسری شادی سکینہ سے کرنا چاہتا ہے جو ماں کی خالہ زاد بہن تھی اور اپنے باپ کے مرنے کے بعد بہت سی زمین کی اکھوتی وارث تھی۔ ماں نے لکھا تھا "تمہارا باپ جائیداد کی حرص میں اتنا دیوانہ ہو گیا ہے کہ اپنے سے آدھی عمر کی لڑکی سے شادی رچانے پر تیار ہو ہے۔ وہ مجھ سے تحریری اجازت بھی چاہتا ہے اور یہ بھی کہ میں ان لوگوں پر زور ڈالوں کہ وہ یہ دشتہ دے دیں۔"

وہ یہ خط پڑھ کر بھونچکا رہ گیا۔ میرا باپ اور شادی؟ اس کا سر جھک گیا۔ باپ کی عمر پچاس کے قریب تھی اور ماں کوئی پالیس کی تھی ابے میں بیس اکیس سالہ لڑکی سے شادی؟ اسے ایسے لگا جیسے وہ خواب یا نشے کی حالت میں ہو اور حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو لیکن جب بار بار خط دیکھتا تھا تو اس کا دل ڈوبتا ہی جاتا۔

اسے اپنی ماں سے بے پناہ محبت تھی اور ماں کا دکھ پہنچل ہوئی آگ بھی گرا

کے رگ و پے میں گھٹنے لگا اس نے حالات کا تجزیہ کرنے کی کوشش نہ کی اور ماں نے ساری بات کو جس انداز سے لکھا تھا اس نے من و عن قبول کر لیا۔ ماں کی ذات اس کی نظر میں اتنی بلند تھی کہ اس کا سارا غصہ باپ کی طرف منتقل ہو گیا۔

یہ کیسا باپ ہے؟ جو گھرتا، کرتا، پڑتا ہوا ہے ہمارے اپنے گھر میں کس چیز کی کمی تھی جو وہ مال و دولت کی حرص میں اندھا ہو رہا تھا۔ اکلوتے بیٹے کے لئے کیا یہ ساری زمینیں کافی نہ تھیں؟ جو وہ گھر کا ٹھہرا ہوا پیکوں کا حوالہ دے کر اڑا نا چاہتا تھا اور وہ باپ ہی کیا جو یہ نہ دیکھ سکے کہ نیلے پیلے آنچل تو اس کے بائیس سالہ جوان بیٹے کے خیالوں میں لہرا رہے ہیں اس کا فرض تو بیٹے کے خیالوں میں بھاگنا تھا لیکن وہ خود ہی ان آنچلوں کے پیچھے بھاگنے لگ گیا۔ اُنٹھے بیٹھے وہ جتنا ہی سوچتا اس کے دل میں باپ کے خلاف نفرت بڑھتی جاتی۔ اس باپ کے خلاف جسے اس نے ساری عمر بیاہ کر لیا تھا اور غالباً اسی وجہ سے اسے باپ کے طرز عمل سے صد پرہیز تھا۔ چنانچہ وہ ساری محبت اب ممکن طور پر مظلوم ماں کی طرف منتقل ہو گئی اور باپ کے لئے سوائے نفرت کے اور کوئی جذبہ باقی نہ رہا۔

جب وہ گھر کی طرف روانہ ہوا تو غم اور غصے سے نیم پاگل ہو رہا تھا۔ وہ خوب اندازہ کر سکتا تھا کہ معاملہ یونین کو نسل تک جانے سے ان کی کتنی جگ ہنسائی ہوگی ہوگی خصوصاً جب کہ یونین کو نسل کا چیرمین ان کی مخالف پارٹی کا تھا اس سے انصاف کی توقع تو بالکل نہ تھی۔ البتہ یہ یقین تھا کہ وہ اس معاملے کو بلاوجہ اچھالے گا ٹھہر کا ذریعہ بنائے گا اور ان کو وہ کہہ پہنچا کر مزہ لے گا۔

جیسے جیسے گائڈ قریب آتا گیا وہ سوچنے لگا کہ میں گاؤں میں کیسے داخل

ہوں گا؟ میں لوگوں کا سامنا کیسے کر سکتی ہوں۔ پہلے تو چونگی رہی وہ چار خیر صلابہ پھنے والے ہوں گے۔ آگے اڑے پر بھی دکھنا اور خواہجے والے جاتے ہیں اس سے آگے مسجد کے مولوی صاحب بچے پڑھانے کے ساتھ ساتھ باہر جھانکتے رہتے ہیں جن سے بات کئے بغیر آگے جا بھٹکنا ممکن نہیں اور پھر اس کے بعد تو بازار بے بہا مٹھنے والے ہوں گے۔ وہ ابن سب کی طنزیہ نظروں کا مقابلہ کیسے کر سکے گا۔ اور نہ معلوم گھر کا کیا حال ہوگا۔ ماں کس حال میں ہوگی ابباپ کا مڑ کیا ہوگا؟

باپ کا خیال آتے ہی اس کے خون میں نفرت کے اُبال اُٹھنے لگے۔ آخر بابا کو کیا پٹری تھی بیٹھے بھٹائے بھٹس میں تیلی پھینکنے کی۔

اور پھر گاؤں آگیا۔ بھڑوں کی طرح نیچے دیکھتے ہوئے وہ چلتا رہا۔ کسی سے غریب بچائے کسی سے جسم چرائے۔ بازار سے گزرنے کی بجائے اس نے پچھلے قبرستان سے لمبا راستہ اختیار کیا۔

گھر کا دروازہ نظر آیا تو نہ خوشی سے اس کا دل مچلا نہ یہ خواہش ہوئی کہ گھر والے باہر ہی بل جائیں۔ بلکہ اس کا دل بھاری بوجھ سے بیٹھنے لگا۔ نہ معلوم گھر میں کیا نظر آئے گا۔

دلیز پر وہ لمحو بھر کو ٹھٹکا۔۔۔ اور پھر اندر داخل ہو گیا۔

صحن خالی تھا۔ ماں ہمیشہ کی طرح شہتوت کے نیچے بیٹھ کر سبزی نہیں کاٹ رہی تھی۔

وہ بڑے کمرے میں گیا۔ وہ بھی خالی تھا۔ صند قوں کو تالے لگے تھے جو باں کے باہر جانے کی نشانی تھی۔

وہ باورچی خانے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اندر سے میرا شن بجلی۔ اُسے دیکھا اور ٹھٹھک گئی۔ پھر گڑ بڑا کر سلام داغ دیا۔

گھر خالی دیکھ کر اس کا ذہنی تناؤ اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ سلام کا جواب دینا اور خالی احوال پوچھنا بالکل بھول گیا۔ قریباً صبح کر لولا۔

”ماں کدھر ہے؟“

میرا شن نے اسے غور سے دیکھا۔ اور بولی ”یونین کونسل کے دفتر میں سو رہا۔ طلاق کے مقدمے کی تاریخ ہے۔“

اس نے جست لگائی۔ زن سے باہر نکلا اور تقریباً بھاگتا ہوا دفتر کو چلا۔ اسے
میں کسی نے آواز بھی دی مگر وہ رکا نہیں اور پلکتا چلا گیا۔

دفتر کے باہر میدان میں مقدمہ پیش تھا۔ بہت سے لوگ جمع تھے۔ جب وہ ان کے قریب آ رہا تھا تو اسے بالکل ایسا لگا جیسے مداری کا تماشہ ہو رہا ہے اور اوگروگ جمع ہوں۔ شرم اور خفت نے ایک دفعہ پھر پاؤں پکڑ لئے اور وہ مجمع کو چیر کر آگے بڑھنے کی بجائے دم سادھ کر پیچھے سے جھانکنے لگا۔

چیمبرین اور مصالحتی کمیٹی کے دو ممبران کرسیوں پر بیٹھے تھے، سامنے اس کی باہار پائی پر بیٹھی تھی اور چہرے پر پتہ رکھے زار و قطار رو رہی تھی ماں کو بوسہ دیا مہلڑوں کی طرح روتا دیکھ کر وہ غصے سے نیم پاگل ہو گیا۔ اس کا باپ بلند آواز سے بول رہا تھا۔
”میں اسے اتنے عرصہ سے سمجھا رہا ہوں مگر یہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئی نہ ہی
بھی سمجھا یا، جھگڑا ابھی کیا۔ مارا بھی، مگر اس کی حرکتیں بڑھتی ہی گئیں۔ میں بہت پریشان
کر سکتا ہوں مگر چلنی بدداشت نہیں کر سکتا میں نے اپنی آنکھوں سے اسے فصل کیا

کے ساتھ بد فعل کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اگر یہ بھاگ نہ جاتے تو میں وہیں قید...
 ”بابا! وہ لوگوں کو چیر کر آگے بڑھا اور اس کی چیخِ صریر اسرائیل کی طرح سب
 کے کانوں میں گھنٹی گئی۔

اسے دیکھ کر جمع میں بھنبٹا ہٹ سس ہوئی۔ ایک آدھ طنز پر آواز آئی۔ ”لو تو بچی
 آگیا۔ اور پھر ہر شخص سکت ہو گیا۔ اس کی ماں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر چیخ
 مار کر اس کی طرف جھپٹی۔ اسے اپنے ساتھ لٹایا۔ اور پلک پلک کر رونے لگی۔ ماں کو
 بانوؤں میں تھا تا تو اس کے داغ سے سب خیالات محو ہو گئے۔ سوائے اس کے کہ
 وہ ہر قیمت پر اپنی ماں کی حفاظت کرے۔

ماں جھپکیوں کے ریلے میں بولی۔ ”یہ سب بہتان ہے... جھوٹ ہے... اپنے
 مقصد کے لئے یہ بچے ذلیل کر رہا ہے۔

اس نے غصے سے باپ کی طرف دیکھا تو وہ صلیبے سن کر ہو کر بیٹے کو دیکھ رہا تھا۔
 نظریں ملتے ہی اس نے بیٹے کی طرف ہاتھ پھیلائے۔ ”یہ سچ ہے بیٹا۔“

باپ کے پھرے سے اپنی پھٹی پھٹی نظریں مٹا کر اس نے مجمع پر نگاہ دوڑائی۔
 حیرانی... دلچسپی... تسخیر... طنز... احساس برتری... یہ سب اس کا
 محاصرہ کئے ہوئے تھے۔... مخالفت بھرے چیرہ بین کے چہرے پر شیطانی وارنگی تھی۔
 جیسے جی ادھ موئے ہوئے کو اچھال اچھال کر مزہ لیتی ہے۔

اسے پتہ بھی نہ چلا کہ کب اس نے ماں کو چھوڑا اور کب لپک کر جمع میں سے
 ایک آدمی کے کندھے سے کھنٹری جھپٹی اسے تو تب ہوش آیا جب کھنٹری کے پے
 درپے دار کھانے کے بعد اس کا باپ اپنے خون میں لت پت اس کے قدموں میں

گر پڑا۔ ماں کی چھینٹیں سن کر اس نے کھانسی پھینک دی۔ اور کئی بازوؤں نے اُسے جھٹک لیا۔ اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی بالکل کوشش نہ کی۔ جب ذرا شور مچھا تو اُس نے چیمبرین کی طرف دیکھ کر تھوکا اور تحارت سے بولا۔

”جی صاحب! میاں فیصلہ تمہارے فیصلے سے زیادہ باعزت ہے!“

اس لمحے سے لے کر آج تک اسے اپنے جرم پر ذمہ بھر بھی ندامت نہ ہوئی تھی، متحدر مچلا پھانسی کی سزا ہوئی، پہل کی گئی وہ نامنظور بھی ہو گئی اس میں کافی وقت لگا لیکن اس دوران وہ لمحہ بھر بھی نہیں پھپھایا۔ آج اسے بتا دیا گیا تھا کہ دو دن کے بعد اسے پھانسی دی جائے گی اور پچھلے دو گفتگوں سے وہ ان سارے واقعات کو یاد کر رہا تھا۔ جن سے گزر کر وہ یہاں پہنچا تھا۔ مگر اس ساری یاد میں باپ کے لئے کوئی ہمدردی نہ تھی جس نے اس کی ماں پر محض اس لئے بہتان لگا دیا کہ وہ اپنے مقاصد کو چھپا سکے۔ وہ اس کی نظر میں بدترین ریاکار تھا۔ اس کے منہ سے دو ایک کالیاں ابھر رہی تھیں اور وہ سنبھلا اور ہل کر قرآن مجید پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ سو یا نہیں تھا۔ ویسے ہی آنکھیں بند کر کے رات کے اندھیرے میں گم تھا، اور سوچ رہا تھا کہ پھانسی میں کس قسم کی اذیت ہوگی جب اسے کوٹھڑی سے نکال کر لے جائیں گے تو اس کا رد عمل کیا ہوگا۔ کیا وہ ڈرے گا؟ لرزے گا؟ پھر اس کے چہرے پر تو براہ چڑھا دیا جائے گا اور گٹھے میں پھنسا ڈالا جائے گا۔ سب چہرے چھپ جائیں گے۔ اندھیرا چھپا جائے گا۔ کیا دل نہیں گھبرائے گا۔ تب تو ایک ہی انتظار رہ جائے گا کہ کب تختے زور سے آکر گردن پر ٹکراتے ہیں۔ زندگی اور موت کے درمیان

نکلنے والے وہ آخری لمحے کیسے گزریں گے؟ اور جب وہ مر جائے گا۔

”مگر کیا واقعی میں مرجاؤں گا؟؟؟ اس نے ہنرور اگر آنکھیں کھول دیں مگر نظر اندھیرے سے ٹکرا کر کند ہو گئی۔ کوٹھڑی کا دیز اندھیرا بھی اسے موت کا پرہ محسوس ہوا۔ گھبراہٹ سے ایک دم جی متلانے لگا۔ کہیں سے روشنی کی ایک ہی کرن مل جائے۔ اس نے تڑپ کر پہلو بدلا۔ سلاخوں والے دروازے کے پار چاند کی روشنی میں دیواروں اور درختوں کے نقوش دیکھ کر اس کی ہمت بندھی اس کا سانس نور زور سے چل رہا تھا مگر وہ خود بخود تھا اور جس طرح پیاسا جانور پانی پر ٹوٹ پڑتا ہے اسی طرح وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاندنی کو ٹکٹا رہا جیسے یہی اس کی زندگی کا واحد ثبوت تھا اور جوں ہی وہ آنکھ بند کرے گا تو پچانس کے تختے زن سے گردن پڑاؤں گے۔

ہاتھ پر سے سرسراہٹ چلتی ہوئی رخسار تک آئی۔ وہاں سے ذرا نیچے گود سے ہوتی ہوئی کندھے ہیں گھس گھسی اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ اٹھایا۔ آنکھ سے کندھے کو چھوا تو وہ گیلی ہو گئی۔

”پسیلین“ وہ زیر لب بڑبڑایا اور تھکے اعتماد سے چہرے پر ہاتھ ملا

”امہ خدا“ وہ ٹھٹھکے پیسنے میں شراہید تھا۔ بغیر محسوس کئے۔ اس کی تپیں گیلی ہو کر کر کے ساتھ جپک گئی تھی۔ وہ اٹھ بیٹھا اور جسم سے چپکے ہوئے کپڑے دست کرنے لگا تو ایک دھماکے کا ہاتھ گرم نمی میں لگا۔ خون زدہ ہو کر اس نے ٹھولا تو ٹھنڈی آہ بے اختیار اس کے ہون سے نکل گئی۔

اُس کا پاہاں پریشاب سے تر تھا۔

وہ اُمٹھ کھڑا ہوا۔ سلاخوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر دروازے کے قریب ہوا تاکہ وہاں کپڑے سوکھ جائیں۔ تب اس نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ وہ سوکھے پتے کی طرح کھڑکھڑا رہا ہے۔

اس نے چند لمحے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر بے سود جسم کا ہر حصہ علیحدہ انداز میں دھڑک رہا تھا اور وہ بے بس ہو کر دوبارہ لیٹ گیا۔ چاندنی کو کھینے کی خواہش کے باوجود اس کی آنکھیں آپ ہی آپ بند ہونے لگیں۔ غیز سے نہیں بلکہ نفاقت سے۔

ایک دم اُسے کسی نے جھنجھوڑا لگا کر بڑا کرنا اُٹھنے لگا تو جیسے کسی نے سختی دی تھی اور وہ چکر کر سلاخوں والے دروازے سے جا لگا۔ تنکے کھسکا رہا اپنے کے انداز میں اس نے سلاخوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور چیخ مارتے ہوئے بکھنے لگا۔ لیکن ابھی بمشکل کھڑا ہی ہوا تھا کہ ایک دم زور کا جھٹکا آیا اور وہ دروازہ اپنی چوکیدار سے نکل کر باہر کی طرف گرا۔ وہ بھی سلاخوں سے چپکا ہوا مشہور بکھیل گیا اور سنبھلنے سے پہلے ٹانگوں پر دو چار اینٹیں آن پڑیں۔ وہ زور سے کرا رہا۔ اور سر کو سلاخ پر ڈھیلا جھنجھوڑ دیا۔ اس کے نکتوں اور صحتی میں گرو کے بادل گھٹنے لگے۔

”جھنجھوڑ چال“ وہ ٹرٹرا یا۔

اور بے ہوش ہو گیا۔

جب اُسے دوبارہ ہوش آیا تو چاندنی میں سائے پہلے جیسے ہی تھے۔ فضا میں گرد اور دھول بھی بدستور تھی اور جیل کے دوسرے حصے سے شہد کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ اس نے اندازہ کیا کہ وہ زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہا۔

اس نے گردن ہلاتی۔

پھر باری باری بازوؤں کو حرکت دی۔

ڈرتے ڈرتے ٹانگیں ہلاتیں۔

کہیں کوئی درد اٹھا، ستر ٹھوکر دیکھا تو اینٹیں جسم سے لگ کر ٹوٹے گر پڑی تھیں۔
وہ اچھو کر بیٹھ گیا کمر میں ذرا سا درد محسوس ہوا مگر جب جسم کو ابھر اُدھر دھرایا تو وہ معمولی
چوٹ تھی۔

اب اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔

موت کی سزا پانے والوں کی قریشا سبھی کی کوٹھڑیاں گرمی پڑی تھیں۔ ساتھ دالے
کمرے کا قیدی مڑا پڑا تھا۔ بلبلے میں اس کا بھیجا پچک گیا تھا باقی چیزیں واضح اور
صاف نہ تھیں کیونکہ گرد کا بادل پھیل چکا تھا کو چاٹ گیا تھا۔ جیل کے دوسرے حصوں
سے چیخ پکار کو ابھاریں آرہی تھیں۔

اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال کونما۔ اس کی زندگی کے دو دن باقی ہیں۔
اگر وہ اس موقع سے فائدہ اٹھالے تو شاید اسے دوسری زندگی مل جائے۔ دوسری
سوچ کے بغیر وہ وہاں سے چل دیا۔ اس نے اپنے آپ کو چھپانے کی کوئی کوشش نہ کی پکڑا
جاؤں گا تو کیا فرق پڑے گا۔ وہی تو دن ہیں زندگی کے۔ اور وہ بھی قید تھائی ہیں۔
پکڑ کے قید کریں یا گولی ماریں۔ پچاسی سے بڑی سزا تو کوئی نہیں۔ وہ یہی سوچنا
چلا گیا۔

جیل میں انفرادی تھی۔ ایک دو بارکیں گرجھٹی تھیں۔ اور سبھی لوگ زنجیروں کو نکال
رہے تھے۔ کچھ لوگ ادھر ادھر جھاگ رہے تھے کسی کی مدد کے لئے۔ کسی کو بلانے کے

لئے کوئی چیز اٹھانے کے لئے۔ ان میں سے اکثر لٹوڑ کو پکار رہے تھے۔ وہ بھی ان میں غلط طوطا ہو گیا اور کہیں رکتا، کہیں بھاگتا، کہیں دوسروں کو پکارتا، آنکھیں میچولی سی کھینچتا رہا۔ اور ایک دفع موقع پا کر جیل کی بڑی دیوار تک جا پہنچا۔ جسے تھوڑی سی تلاش کے بعد گرہا حصہ نظر آیا۔ اس نے رک کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا، نیز چلنا ہوا وہ باہر نکلا اور گیٹ بجائے لگا۔

شہر کا حال یہ بالکل بدل گیا تھا مگر یہ ہوتی عمارتیں۔ بیڑے میڑے بجلی کے کھمبے ٹوٹی ہوئی تھیں، کہیں درخت سرنگوں کہیں مڑکے ہیں۔ دریا میں گھاس گروہی گروہ لگیاں اور راستے پہچانے ہی نہ جاتے تھے۔ لوگ بدحواسی میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے، کہیں زخمیوں کے کراہنے کی آوازیں تھیں کہیں امدادیوں کو بلانے کا شور تھا۔ بالکل حشر کا سماں تھا اور نفاضی کا عالم تھا چاند کی بھیگی گرد آلود روشنی میں اور بھی برا سرا لگتا تھا۔

وہ اب ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ اس قتل کے علاوہ اس نے کبھی کوئی اور جرم نہ کیا تھا مگر اب مجرموں کی صحبت میں رہتے رہتے اس نے کافی سیکھ لیا تھا اور اب قسمت نے موقع بھی جیسا کیا تھا کیونکہ اس نے جیل میں سنا تھا کہ ہرگز نہ لے کی تواریخ بتاتی ہے کہ اس کے فوڈ بعد جراثیم میں ایک دم اٹھان ہو جاتا ہے اور زلزلہ زدہ لوگ اپنے نقصان کو قبول کر اپنے ہی جیسے مصیبت زدہ لوگوں کو لوٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ بھی اس موقع سے فائدہ اٹھانے پر تل گیا۔

ایک آدمی کی ٹانگ بے میں دب گئی تھی اس کا اوپر والا دھڑکھل میں تھا۔ اور وہ بے ہوش تھا۔ یہ بظاہر اس پر سے طے جاتا رہا لیکن دراصل اس کی قمیض نامزدہم قطع

تھوڑی ہی دیر بعد وہ کامیاب ہو گیا۔ اپنی قیدیوں والی قیض آتا رہتا رہتا کہ وہی اور دوسری بہن لی۔ اپنے لئے دوسری زندگی لینے کی محنت میں وہ زخمی کی زندگی خطرے میں ہی چھوڑ کر چل دیا۔ ایک اور جگہ سے اس نے صندوق اٹھایا جس میں کچھ کپڑے اور نقدی تھی۔ اس کی اسکیم مکمل ہو چکی تھی اور وہ شہر سے باہر دالی سڑک پر چوڑا۔

نئی زندگی واقعی مختلف تھی۔ اس نے اپنا نام تبدیل کر لیا۔ دائرہ حسی بڑھائی چھوے پر خود ہی اُسٹری سے زخم لگا کر پڑا سا نشان بنالیا سڑک کے بال بڑھا کر پٹے بنائے۔ لوگوں سے الگ تھلگ رہتا۔ نہ کوئی دوست تھا نہ ہمارا۔ وہ کہیں ایک جگہ جم کر کام نہ کرتا۔ چند روز ایک جگہ مزدوری کر لی۔ پچھو کہیں اور خواجہ لگانے لگا یا کسی ٹیکسٹ کے پاس ایک جاتا۔

یہ بہت ہی بد اور اکتا دینے والی زندگی تھی تنہائی اور خوف اس کے احساب کو ہر وقت بھاری بوجھ کی طرح دبانے رہتے زندگی کے سیلے اپنی پوری آن بان سے رونق کے خباہٹ اٹھاتے مگر وہ شرمک سے قاصر تھا کیا معلوم کس جگہ قسمت کیا گل کھلا دے اور وہ پچھو جانے وہ کھل کر تھک لگانے کو ترستا تھا۔ اس کا دل کسی ہمارا سے بے تکلفانہ بے حجابانہ باتیں کرنا چاہتا۔ مگر مجبور تھا۔ دوسروں کو ہنستے دیکھ کر وہ ابھی بھرتا اور شاداں و فرحان لوگوں کی آنکھوں میں تارے دیکھ کر اس کی اپنی آنکھیں بجھنے لگتیں۔

تین چار ماہ میں وہ تنگ آ گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خاموشی سے جا کر اپنی ماں کو نکال لائے اور دونوں کسی دور کے علاقے میں جا کر کھل کر زندگی گزاریں۔

سہ پہر کے سائے لمبے ہو رہے تھے جب وہ گھاؤں کے قبرستان پہنچا اس کا راز

تھا کہ اندھیرا ہونے لگا وہیں چھپا رہے اور رات کو جا کر ماں سے ملے۔ ماں کے لئے کے خیال سے ہی اس کی آنکھیں ڈنڈبائیں اور اس نے فر سے سوچا کہ میں نے مشکل وقت میں اپنی جان پر کھیل کر ماں کی حفاظت کی ہے۔

جہاں چھپا ہوا تھا اس سے کچھ دُور باپ کی قبر تھی۔ لیکن وہ ادھر نہیں گیا۔ اس نے فاتحہ بھی نہیں پڑھی۔ وہ ابھی تک اسے معاف نہیں کر سکا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے ان کا پند اگھر از تباہ ہوا۔ اسے پھانسی کی سزا ملی اور اگر خدا یہ غیب سے نہ بھیجتا تو وہ اب تک مر چکا ہوتا۔ اس کی نیکِ دل اور فرشتہ سیرت ماں کو گھبراہٹ میں شرمناک تھمت کی ذلت اٹھانا پڑی اور ان کے اذلی دشمن جیسے ہیں کو ان پر مہنے کا موقع مل گیا۔ وہ سوچنے لگا سال بھر پہلے بھی وہ گھاؤں آیا تھا اور تھوڑی ہی دیر بعد کس ذلت سے گیا تھا۔ ہاتھوں میں منتھکڑی جسم پر خون کے چھینٹے چھپے لوگوں کا جھوم۔ ساتھ ساتھ اس کی ماں روتی چلا تے ہیں کرتی۔ بچے اس کی منتھکڑیوں کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ایک دوسرے پر گرنے ہوئے۔ اور وہ نامہوار تہذیبوں سے چلتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ باپ کی ہوس نے اسے کہاں پہنچا دیا ہے۔ آج وہ پھر اپنے گھاؤں میں آیا ہے لیکن چوروں کی طرح چھپ کر وہ بھیجی کے ساتھیوں سے گئے نڈل سکتا تھا۔ وہ ہر گھر کے سامنے رک کر گھر والی بوڑھی سے دعائیں نہ لے سکتا تھا۔ وہ کسی جہاں کے بچے کے سر پر پیار کے ساتھ ہاتھ نہ پھیر سکتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے ہی گھر کھٹکے بندوں نہ جاسکتا تھا۔

حسروں کا گولہ اس کے سلق میں پھنسنے لگا۔ اس کی آنکھیں ڈنڈبائیں اور غیبی آنکھوں میں نفرت بھر کے اس نے اپنے باپ کی قبر پر بڑی ہی کڑی نگاہ ڈالی

اور پھر اس کے خیالوں میں ماں آگئی۔ نہ معلوم وہ کس حال میں ہوگی۔ بدلتے بدلتے اس کا حلیہ بگڑ گیا ہوگا۔ لوگوں کے طعنوں کے تیروں نے اس کا سینہ چھلنی کر دیا ہوگا۔ وہ پیسے کی وجہ سے بھی تنگ ہو سکتی ہے۔ معلوم نہیں خوشامزاج اسے حصہ دیتا ہے یا نہیں۔ نہ معلوم گاؤں والوں کا سلوک اس کے ساتھ کیسا ہے۔ اس کے ذہن میں ماں کی جو تصویر بھری تھی وہ انتہائی سوگوار اور لاغر تھی۔

شام ہونے لگی۔ ادھر ادھر سے ناخ کی آواز آئی۔ بابا حاکم کے کنویں کی ریل میں سنائی دی۔ جہاں وہ اکثر شام کو نہایا کرتا تھا۔ طوطوں کے غول کے غول نہیں کرتے اس کے اوپر سے گزرنے لگے۔ بیزاری دور کرنے کو وہ ادھر ادھر مٹھنے لگا۔ ایک جگہ وہ دیوار ذرا ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس نے جھانکا تو گاؤں سے آنے والا اجا راستہ صاف نظر آتا تھا۔ اپنے آپ کو اوٹ میں رکھنے کا مناسب انتظام کرنے کے بعد وہ وہیں بیٹھ کر رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

یہ راستہ ہمیشہ کی طرح آج بھی سسنا تھا کیونکہ یہ صرف گاؤں سے قبرستان آتا تھا اور بڑی سڑک دوسری طرف تھی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے اس نے دیکھا کہ کما کی فصلیں تیار ہونے کو تھیں جہاں کسانوں کو گندم کی کاشت کرنا تھی وہ کھیت خالی تھے کہیں کہیں کیا کاشت تھی مگر باقی سب گتا ہی تھا۔ ابھی فصل میں کچھ دیر تھی اس نے لوگوں نے رس نکالنے والے پیلے نہیں لگائے تھے وہ تو شام کو اس رستے پر خوب رونق ہوتی تھی۔ وہ کافی دیر خالی سڑک کو دیکھتا رہا۔ کئی دفعہ کما کے بے جان کھیتوں پر نظر ڈالی اور بالآخر اٹھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پیسہ کدو کو اسے ایک شخص آتا دکھائی دیا۔ پھر نہ جانے کہاں سے ایک اور شخص نمودار ہو گیا۔ تماشے سے نپوہ

خوف زدہ ہو کر وہ انھیں دیکھنے لگا۔ کیونکہ ادھر آنے والا یقیناً قبرستان آئے گا۔ اور اس کی موجودگی مخفی نہ رہ سکے گی۔ جلدی سے ادھر اُدھر چکر لگا کر اس نے چھپنے کی جگہ تلاش کی اور پھر گردن نکال کر دیکھنے لگا۔

چند ہی ثانیوں میں اسے اندازہ ہو گیا کہ ان میں سے ایک مرد اور ایک عورت ہے۔ وہ ٹکٹکی بانٹے دیکھتا رہا۔ عورت نے دیہاتی لوگوں کی مخصوص دھواں پھنی ہوئی متھی جو ٹیل میں بار بار رینگنے سے کالی ہو جاتی ہے۔ مگر اس کا کنارہ سُرخ تھا اور دُسیا ہی کرتا تھا اور سر پر کُٹھتے ہوئے سُرخ رنگ کی چادر تھی۔

وہ کون ہو سکتے ہیں؟ اس نے کتے ہی اندازے لگائے۔

وہ سوچتا کہ یہ فلاں لوگ ہونگے لیکن ان کی کوئی حرکت یا چال دیکھ کر، خیال بدل لیتا۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے مگر تھوڑی دیر میں نزدیک آگے اور آتے گئے۔

وہ ایک دم ہڑچکا کر اٹھ بیٹھا۔ جیسے اُسے بجلی کا جھکا لگا ہو۔ حفاظتی حدود سے اندر ہی اندر وہ جتنا اُگے جھک سکتا تھا جھک کر باہر آگیا اُس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ چال پر غور کیا۔ جسم کے حجم کو دیکھا۔ کپڑوں کا اسٹائل پرکھا۔ اس نے کبھی دیکھا کو اتنے زور سے پکڑا کہ انگلیاں مٹی میں دھنسنے لگیں اور اس کے منہ سے دلی گھٹنہ خنجر نکل گئی۔

ماں اب!

اس کی آنکھیں گریباہر آ رہی تھیں۔

چلتے چلتے دونوں بالکل قریب آ گئے۔ ہوا کے جھونکے ان کی گنگلو کے اُدھے
 الفاظ اٹھا کر اس تک لاتے مگر دُوری کی وجہ سے وہ سمجھ نہ سکتا تھا۔ ایک جھونکا
 ماں کی ہنسی اٹھا لایا۔ مانوس تازہ اپنائیت کا انداز لے۔ وہ تھوڑا متعجب ہوا۔
 کیونکہ اس میں سوگوار کی جھلک تک نہ تھی بلکہ کھلتی ہوئی بھرپور ہنسی تھی۔
 مگر اس کے ساتھ کون تھا؟

اس نے خود سے دیکھا اور اس کے جسم سے جان نکلنے لگی۔ وہ فضل ہاشمی تھا۔
 حیرت اور غصے سے اس کے پیٹ میں مردِ رُٹاٹنے لگا۔
 ”فضل ہاشمی“ وہ بڑبڑایا ”فضل ہاشمی؟“

اس کے دلخ میں بدترین دوسوں نے سنا تھا یا۔ مگر وہ ابھی تک قبل کرنے
 کو تیار نہ تھا اور بالکل پتھر کا بت بنا انہیں دیکھ رہا تھا جو قدم بہ قدم بڑھے آ رہے تھے۔
 وہ جھول چکا تھا کہ اسے اپنے آپ کو چھپانا ہے اسے کوئی ہوش نہ تھا کہ دیوار
 کا سہارا لیا ہے یا نہیں۔ اس کی ساری حسیات آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں اور
 وہ منہ کھولے دیکھے جا رہا تھا۔

اب وہ دونوں اس سے چار کھیت دُور تھے پہلا کماؤ کا تھا۔ دوسرا خالی تھا
 اور ساتھ ہی ایک راستہ اندر کو مڑنا تھا۔ اگلے دو کھیت کساؤ کے تھے۔

وہ آگے چلتے آئے۔ پہلا کھیت ختم ہو گیا۔ دوسرے کے ساتھ چلتے چلتے ان کے
 قدم رکنے لگے انھوں نے دے انداز میں مشورہ کیا اور پھر اسے اپنی آنکھوں پر
 یقین نہ آیا۔ مگر وہ کیا کرتا۔

فضل ہاشمی نے عورت کا ہاتھ پکڑا۔ دونوں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کھیتوں

کے اندر جانے والے کچے راستے پر مڑ گئے۔

اب وہ کساد کی اوٹ میں تھے اور وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔

سب کچھ بھول کر اس نے ایک جست لگائی۔ دیوار پھلانگ کر سڑک پر لگ گئی۔ سڑک دوڑتا ہوا وہ کھیت کی ٹکڑی تک گیا اور رک کر جھانکا۔ دونوں کساد والے کھیت میں گھس رہے تھے۔

بغیر سوچے سمجھے اس نے بے پاؤں چکر کاٹا اور دوسری طرف سے اسی کھیت میں داخل ہو گیا۔ پھر بلی کی سی ہوشیاری سے آگے بڑھا۔ قدم قدم چپ چاپ ایک ایک اپنچ۔

ایک دم ماں کی ہنسی کی آواز آئی اور وہ وہیں دبک گیا۔ کساد ہٹنے سے اس نے اندازہ لگایا کہ وہ ان سے دو ہی تین گز دور ہوں گے۔ وہ دونوں سرگوشی میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ اور کان کھڑے کر کے سننے کی کوشش کرنے لگا۔

.....

فضل کی آواز میں تندہی اور بے صبری تھی۔ فکر نہیں۔ اور لے دوں گا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ اور وہ دم سادھے پڑا تھا۔ اچانک فضل بولا۔

”تو ابھی ادھر ہی رہ۔ میں چلا جاؤں تو تو دوسری طرف سے نکل جانا۔ اور کساد ہٹنے لگا۔

وہ دم سادھے پڑا رہا۔ تیز دھاروں والے ہاتھوں سے اس کے چہرے اوڑھ

بازوؤں پر کئی خراشیں آئیں مگر اندر سے دل جیسے کسی نے تیز چھری سے چھید دیا تھا۔ اس کے ذہن میں حشر برپا تھا۔ یہ سب کچھ کیا تھا؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ لیکن اس اندرونی طوفان کے باوجود اس کے بازو ٹھل گئے اور قوتِ عمل غائب تھی۔ اس نے کسی دفعہ ارادہ کیا کہ ابھی اٹھ کر ان دونوں کو دو بچ لے مگر اس کا جسم داغ کا ساتھ نہ دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے احصا پتا جو میں نہیں ہیں۔ گٹھنوں کی اس کمیں گاہ میں بخوڑی دُور اس کی ماں بیٹھی تھی اور اس تمام سانچے سے بے خبر تھی جو اس کے جوان لڑکے پر گزر چکا تھا بخوڑی ویر بعدہ باہر نکلی ہوئے ہوئے تھے پڑ گئی اور جھک کر نہر کی چھوٹی تالی میں منہ ہاتھ دھوئے لگی۔

”ماں!“

وہ ٹپ کر مڑی۔ اور اس اجنبی کو حیرت سے دیکھنے لگی جو ابھی وہاں تھا اسے ماں کہہ کر پکا رہا تھا اور اب اپنی شعلہ باز آنکھیں کسی جلاؤ کی طرح اس پر جھانکے تھا۔

دارھی۔ چہرے پر زخم کا داغ۔ پگڑی

یہ کون تھا۔ ؟؟؟

گمراہکھوں کی بناوٹ۔

اور ناک کا خم۔

ماں کی آواز۔

وہ پہچان گئی۔

پھر وہ دونوں ان بھاری لمحوں کی گرفت میں آگئے جہاں وقت ٹرک جتا ہے۔

دوسرے پاؤں تک لرز رہا تھا۔ جیسے آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کو باجر ٹھکنے کا راستہ نہ ملے۔

وہ سکتے میں غمی۔ مرا ہوا بیٹا زندہ۔ اور یہاں فضل ناشکی۔ بیٹا؟
لاوا پھٹ پڑا ”ماں!!! میں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔“ دونوں مٹھیاں بھینچ کر اس نے ہوا میں لہرائیں اور زور سے رانوں پر دو ہتھ مارے ہوئے چکر اکر بیٹھ گیا۔ پھر دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک دیئے اور زار و قطار رونے لگا۔

عورت کے چہرے کے رنگ بدلتے رہے۔ نہ معلوم کن کن خیالات کے زیر اثر جہاں جنسی خیالات کا معاملہ ہو وہاں عورت کے دل کا راز پانا قطعی ناممکن ہے۔ ایسے وقت اس کا چہرہ آئینہ منیں۔ بلکہ پردہ بن جاتا ہے۔ گریٹے کو ماں کی طرف دیکھنے کا کوئی ہوش نہ تھا وہ کلینے اپنے جذبات سے مغلوب تھا۔

”بیٹا، دل نہ خواب کرو چند لمحوں بعد وہ بولی ”میں تمہیں سب بات سمجھا دوں گی۔“ بیٹے نے زور سے انکار میں سر ہلایا۔ وہ آنسو روکنے کی شدید کوشش کر رہا تھا۔ جو اسے بولنے نہیں دیتے تھے۔ مگر وہ کچھ کہنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔
عورت اسے گونگو کی حالت میں دیکھتی رہی۔

”بابا.... ٹھیک....“ وہ مزید کچھ نہ کہہ سکا اور سخت مایوسی کے عالم میں دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھک لیا۔

ماں اسے دیکھتی رہی۔ اسے سمجھ نہ آتی تھی کہ کیا کہے۔

ایک دم اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے اور ماں کی طرف ہاتھ پھیلا کر بولا۔
”ماں تم نے بابا کو مجھ سے مروا ڈالا۔ تم نے جھوٹ کیوں بولا تھا؟“

عورت اب سنبھل چکی تھی۔ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔
تو یہ فضل ماشکی.... وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

یہ تمہارے باپ کا خفیہ ہے بیٹے عورت سنبھل چکی تھی جس عورت پر میرا زنا
تمہمت لگائی جائے اور وہ بھی خافہ کی طرف سے اور پھر اس کا کوئی سہارا نہ رہے
نہ لوگ۔ نہ خاوند۔ نہ بیٹا۔ تو وہ پھر اس تمہمت کا ہی سہارا لے سکتی ہے اور
کون اسے منہ لگائے گا۔ میں نے تو فضل کا کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ مگر وہ مڑ گیا۔
تم لاپتہ ہو گئے جیل والوں نے کہا کہ زلزلے میں مر گئے ہو۔ لوگوں نے ہر وقت
فضل کو نام میرے منہ پر مارا تو میں اسی کی پناہ نہ لیتی تو کہاں جاتی؟
اس نے اپنے ہاتھ بیٹے کی طرف پھیلا دیئے۔

بیٹے نے چند لمحے ماں کو غور سے دیکھا۔ پھر وہ تیزی سے آگے بڑھا اپنی
ماں کو زور سے دھکا دیا اور خود بھاگتا ہوا کھیت کا موڑ مڑ گیا۔
اس نے پیچھے سے ماں کی پکار سنی مگر وہ سر پٹ بھاگ گئی۔

بھاگتے بھاگتے اس کے ذہن میں باپ کا وہ چہرہ ابھر اچو بیٹے کی کھڑکی
کا پہلا دار روکنے کے لئے دو ٹنگے بازوؤں میں پناہ لے رہا تھا۔ اس چہرے پر
حیرت تھی۔ استعجاب تھا۔ خوف تھا۔ اور مصیبت تھی۔ وہاں بیاکاری نہ تھی۔
قبرستان کے پاس پہنچ کر دیوار پھلانگی۔ نیر کی طرح باپ کی قبر پر گیا اس
پر اوندھے منہ گر پڑا اور اس کا اندرونی کرب ایک چنچ بن کر نکلا۔

”بابا!!! مجھے بتاؤ۔ کون سچا ہے؟“

پھر نرم مٹی میں ناخن کھینچتا ہوا وہ بلب بلب کر رہا کہ ارد گرد کے درخت

سے بچھی اڑ گئے۔

تین دن اور تین راتیں وہ پاگلوں کی طرح گھومتا رہا۔ اور اس سوال کا جواب
سنانا شروع کیا، اندھیری گندی نالیوں، نیلے آسمان، چاند سورج اور پرندوں سے
پوچھتا رہا۔ مگر کسی انسان سے نہ پوچھا۔ جو قابل اعتبار مخلوق نہ تھی۔

پچھتے روز صبح وہ پولیس اسٹیشن میں تھانے دار کے سامنے کھڑا تھا اور بڑے
ہی غیر جذباتی سپاٹ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”میں جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہوں مجھے پچھانسی کی سزا ہوئی تھی۔“

”اوراق“ لاہور

گشتی

پرو۔ ہٹاؤ۔ بھم سے اندھا گشتی۔ نیک سائیں باہر نیچے میں بیٹھا دیکھتا ہی رہ گیا، ایک ایک شعلہ لپکا اور آنکھوں میں دھول جھونک کر سامنے سے گزر گیا۔ پتی پتی شعلہ ہی تو تھی لیکن اس وقت اُس کے دکتے ہوئے چہرے پر گرد کی مہین سی تھ۔ چڑھی تھی۔ نیم پریشان سنہری بالوں میں راتے کی مچلتی ہوئی دھول نکل رہی تھی اور اب عین میں ابہام کی کیفیت۔ گشتی تھی جس نے خدا پر دے میں ہوا تو اس کا جاؤ اور بڑھا۔

جس گھر کو ٹھکر اگر گشتی اس نے پھر قدم کیا۔ میز پر ریڈیو کے قریب اس کی تصویر پر ہار پڑا تھا۔ غایب کے رنگ اسی طرح چمک رہے تھے۔ اور اس میں نما کا سلوٹ نہ تھا۔ الماری میں کراکری قرینے سے دھری تھی۔ کمرے میں کہیں سالہ تھا نہ مٹی تھی۔ کاٹھ کے چوکھے پر چڑھا ہوا آئینہ بالکل صاف تھا اور جب برقع آباد مقابل کھڑی ہوئی تو وہ اس کے بھر پور بدن کے جاؤ سے جگمگا اٹھا۔ بڑی

بڑی پھیلاں آنکھوں سے افق تا افق اُجھالے پھیل رہے تھے پھر جب اس نے
 ٹھکان دُور کرنے کو ننگی باپیں سر سے اُوپر اٹھائیں اور اٹھکیوں میں انگلیاں
 اکھائیں تو آئینے کی حدیں پھلانگ گئی۔ اسے اپنے بدن کی دھکتی ہوئی مشاں
 دیکھنے کے لئے کچھ پیچھے ہٹا پڑا۔ انگ انگ میں چمکتا ہوا آئینے کی رنگوں میں
 ٹکھرا۔ اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ جان گئی کہ نیک سائیں اس کے لہو
 کی مار سہ نہ سکے گا لیکن غلام ہیں آتے آتے تھوڑا بہت وقت ضرور گئے گا۔
 وہ چپکے سے بستر پر راز ہو گئی۔ اُس نے آنکھیں مسج لیں، کان کھلے رکھے۔

نیک سائیں سُکرایا۔ وہ تکیے کا بادشاہ تھا۔ اس کی رعیت میں چند تمہاراز
 چند نو سر یا ز چند گرہ کٹ چند کو جہان، گاڑ بان، چند گو بیٹے، ایک ستار، ایک لوباز
 ایک پھیرا، ایک بُرھئی اور چند شاگرد پیشہ لوگ شامل تھے۔ ان میں کچھ سلوک
 کی منزلیں ملے کر کے ملنگ بن گئے، کچھ ملنگ کا مقام پانے کی آرزوئے رہے
 اور کچھ کے نزدیک تکیے کو کلب سے زیادہ اہمیت حاصل نہ تھی۔

بادشاہ سُکرایا۔ اپنی نیم جان رعایا کو تکیے کے کشادہ آنگن میں چاندوں طر
 دیکھ کر شوکتِ شہانہ دو بالا ہوئی اور حیات کے احساس نے اُسے زمین سے ہلشت
 بھر اُوپٹا کر دیا۔ حالانکہ نیتی پیرنی کی آمد سے پہلے وہ بھنگ کی ترنگ میں زمیں سے
 ہلشت بھر اُوپٹے چلا گیا تھا۔ ویسے وہ راج سنگھاسن پر برا جہان تھا۔ بھنگ کی
 مستی نے ہلکوار لیا تو وہ اور موتی شاہ دونوں ہنسنے لگے اور جوں جوں ہنسنے مستی
 سوا ہوئی اور کچھ دیر کے بعد بے طور ہو گئے۔ وہ بھول ہی گیا کہ نیتی پیرنی آنگن
 پھر کراس کے سامنے سے گزرے میں گئی ہے شکست کی ندامت نے اُسے بدوہ

لیا ہے۔ یہی ندامت چُچپ کی صرین کراس کی زبان پر لگ گئی۔ ہوا چلی تو اس کی شان سکندری میں کچھ اور تھیکا پن آیا۔ بکھرے ہوئے اس جمع کئے۔ اس نے کھانسن کھٹکار کر گئے کاساز ٹھیک کیا اور بدن کو جھنجھوڑا تاکہ چُست ہو جائے۔ اور فاتحانہ انداز میں مکالمہ ادا کر کے۔ اب اس نے اپنا راج سنگھاسن محسوس کر لیا وہ اُد پنچر جو ترے پر اپنے وزیر باتدیر۔ موتی شاہ کے ہمراہ بیٹھا تھا نیچے رعایا اوندھے موندہ پڑی تھی۔ جو ہوش میں تھے اُن کی آنکھوں میں خوابوں کے حسین جزیرے بیکل تھے، جو بے ہوش تھے۔ تکیے کا کُتا بولی اُن کے نٹیلے سانس کی بو، سونگھتا بھرتا تھا۔ مسہ دَری میں اس کا سکھا یا مسدھایا ہوا قادیغنی مار جوا کھیل رہا تھا۔ دو تین لڑکے جو غنڈوں کا کیرئیر اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے تھے تربیت کی پہلی منزل طے کر رہے یعنی ڈنڈ پیل رہے تھے۔ بادشاہ تکیے کی ایک سمت سے گردن گھاتا گھاتا دوسری سمت لے گیا۔ یوں اعتماد اور توانائی بڑھتا گیا۔ اس نے قہقہہ لگایا اور پھر اپنے وزیر باتدیر سے کہا: ”جستوں دی کوئی اور تھے اُن کھلوتی“

کانوں کے پردوں پر ضرب پڑی اور نیچی پیرنی تملائی۔ گالوں پر خشتاک سُرخ پھیل گئی لیکن سُنی اُن سُنی کر گئی۔ اندر سے جواب نہ آیا تو بادشاہ کا حوصلہ ٹڑھا۔ اُس نے پھر وزیر باتدیر سے کہا: ”موتی شاہ! دیکھا ہے پھر آگئی۔ اُسے شکوہ کی روٹی اچھتی نہیں لگتی۔ یہاں آبرو سے رہنا پسند نہیں۔ کوئی بوجھے میری باوشامہت میں کس شے کی کمی ہے۔ میری قدر نہیں اُسے۔ بارڈر قدموں میں ہے۔ وہاں مجا کے پوجھے کس پاتے کا اسمگلر ہوں۔“

جب نیک سائیں کی بیلی گونی کا سلسلہ طوطائی جوتا نظر آیا تو نیتی کے چہرے کی خشناک سُرخ شعلہ بنی، شعلہ اُچک کر زبان پر آیا۔ جلال میں آئی، کچھ دیر کے لئے دُ عورت بن گئی تھی اور اب جو صورتِ حال پیدا ہوئی تھی۔ اس سے عورت نمٹ سکتی تھی۔ وہ آپے میں آئی۔ عورت چمک کر رنڈی بن گئی اور چلاک کر بولی، بکو اس بند کرے گا کہ یونہی شردت رہے گا۔ خزیذوں کی طرح گھبرا گئی ہوں تو کیسے کا دماغ ہی چل گیا جانے کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو۔“

عورت کو دیکھ کر وہ پچ پچ بادشاہ اور تاج بن گیا اور اس کا دماغ چل گیا تھا۔ لیکن جب رنڈی سامنے آئی تو جھاگ کی طرح بیٹھ گیا، بلبکا تھا، ہوا نکل گئی اور ختم ہوا۔ یہ جمیلہ نہیں تھی جسے ڈانٹ لیتا، مار پیٹ لیتا اور وہ مدد دھو کر ہی احتجاج کی رسم پوری کر لیتی جمیلہ عورت تھی اور عورت کے پاس آفسو سے آگے کوئی ہتھیار نہیں ہوتا۔ نیک سائیں جہتہ چھوٹ تھا لیکن جمیلہ کے بجائے جب چمکتی دکتی رنڈی سے مقابلہ ہوا تو بادشاہ کے سارے کس بل نکل گئے تھے اپنی اٹھا کر بکھرے ہوئے باروں کے سنہری جلال اور پرشکوہ چال سے باہر آئی تو وزیرِ باندہیر روم و باکر ایک طرف چلا گیا۔ نیک سائیں نے سمجھنے کے لئے سرگرمی کا لباس کش لیا اور پھر جب رنڈی نے دودھ سے چلا کر کہا: اٹھ وہاں سے اٹھ چل۔“ تو بادشاہ سلامت کو دھوئی کے ڈھیلے پلو باندھنا مشکل ہوئے۔ بادشاہ تو بلکہ ڈھیر ہی ہو گیا۔

”ابھی لے سو بیٹے تو تو یونہی تھا جوتی ہے۔“

بادشاہ کو روم میں چلا گیا۔ اب وہ ایک پری کے حضور میں تھا جسے شیشے

میں اتارنے کے لئے قد آدم شیشہ سامنے ہی دھرا تھا اور لٹدی کو تل سے کڑھک سنور رہا تھا۔

”پر باہر بیٹھ کر کپکنے کی تجھے کیا عادت ہے؟ تیری زر خرید لٹدی تو نہیں، تیری میا بنتا تو نہیں۔ نخرے دکھا جا کے جمیلہ کو! رو رہی ہے تیری جان کو، میں تیری میا بنتا نہیں؟ پری نے بالوں میں کنگھی بھیرتے ہوئے کہا۔

”ارے اپنے نصیب میں میا بنتا کہاں؟ ٹیکے کی زندگی ہے اور سوسو و بلداریاں ہیں۔ کیسے کوئی میا کرے ہم سے؟“

”میا تو تیری ماں نے بھی نہیں کیا، تو کیا کرے گا؟ جمیلہ نے بیاہکا مزا چکھ لیا۔“

”چل چھوڑ خضے کی باتیں بھاگ بھرے!“

سامنے کی الماری کے پٹ چوٹ تھے اور واٹ ہاؤس کی بوتل کے پیچھے میں شراب چمک رہی تھی نیٹی نیٹ پی گئی، مستی منتی پیرنی کی آنکھوں میں آئی اور دل ٹیک سائیں کا ڈولنے ڈوبنے لگا۔

دو چن اٹھا کر باہر نکلی۔ وزیر باتدیر پھر چوتھے پر آ بیٹھا اور جاہلیاں لینے لگا۔ وزیر باتدیر سے رجوع کرتے ہوئے بولی، ”کتنی دے پترا! بازو سے تیرا باپ سودا لاکر دے گا۔“

”ہی ہی، ہی سرکار! باپ تو میری ماں کو ہی سودا لاکر دے سکتا ہے۔ تیرا سودا تو میں لاکر دوں گا۔“

اور پھر وہ لاکھڑا لاکھڑا بنا کر آتا بیس گز کے فاصلے پر تیس بار گرتا پرتا آتا۔

وہ بڑی نگہبند بھی پینا ہے تو تاجے کی ٹیچہ والی پھر منجھلا بھی نہیں جاتا۔ کچھر ہی ہی کرتا رہا۔ اس نے لات ماری تو وہ اوندھے مونہہ گرا اور پھر گھٹنے سہلاتا سہلاتا اٹھا۔ دس کا نوٹ لایا اور بازار چلا گیا۔

غسل کے بعد وہ صیقل کی موٹی تلوار تھئی۔ اچانک اچانک سے جھکن نکل گئی۔ اب وہ گھر کی ملکہ تھی بلکہ یہ گھر اسی کے لئے بنایا سجا یا گیا تھا۔ نیک سائیں کو اسی کی معرفت اس گھر سے دلچسپی تھی اور نیتی پرانی کو اسی گھر کی معرفت نیک سائیں سے دلچسپی تھی جمید کو ترک کرنے میں اس گھر کا بھی ہاتھ تھا۔ دراصل لندی کو لکھیا اور اس گھر نے بل کر جمید کا گھر اجاڑا۔

نیک سائیں نے میز پر بوتل دھری اور دونوں نے بل کر سرگرت سٹکیا۔ دونوں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھ گئے۔

”کیا حال ہے بھئی کا؟“ نیک سائیں نے بوتل گھاس میں اُٹدیتے ہوئے پوچھا۔
”لڑکیاں اور رنڈیاں ایک ہو گئی ہیں۔ سب ٹیڈی بن گئی ہیں۔“

”آب تو پیہ بھی ٹیڈی ہو گیا ہے۔ جیسی تو قدر نہیں رہی کسی چیز کی؟“

”خاک قدر ہے کسی چیز کی؟“ یہ چودھویں صدی ہے۔ چودھویں صدی۔“

”بھئی اچڑ رہی ہے لیکن ہوٹل کھل رہے ہیں۔ گھر گریستیں نہ چرگنا

سیکھ رہی ہیں۔“

”مطلب یہ کہ شریف اور بد معاش ایک گھاٹ پانی پینے لگے ہیں۔“

”سمجھ میں نہیں آتا کیا ہو گیا ہے زمانے کو، کھاتے پیتے گھروں کی یہ

لڑکیاں! یہ رنڈیوں کی اولاد تھوڑی ہیں لیکن ان کے اندر کسی بائیکاٹ دھند

جاگ اٹھی ہیں؟

نیک سائیں حقیقت حال سے آگاہ تھا اور ٹیڈی اِزم کا حامی۔ جب سے عودت ٹیڈی ہوئی اسمگلنگ کا دھندا بڑھا اور پھر ہر عورت رنڈی تھی، رنڈی عورت۔ کوئی عورت کم ہوتی ہے رنڈی زیادہ، کوئی رنڈی کم ہوتی ہے عورت زیادہ۔ موقعے موقعے کی بات ہے لیکن عورت سے زیادہ ٹیڈی رنڈی کے قریب ہے اور قرب قیامت کی یہ بھی ایک علامت ہے۔

نیتی پرنی نے ایک پیگ چڑھایا اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”سرہنگ نہیں، اُستاد نہیں۔ اب ان ٹیڈیوں کو کون نکیل دے؟“

”جیسے اِزمانہ تو دیکھ کون سا آن لگا ہے۔ اب تو عورتیں مردوں کو نکیل

دیئے پھرتی ہیں۔“

عورت گھر سے باہر نکل آئی ہے۔ ہر طرف تماشا ہونے لگا ہے۔ اب مرد

کیا خالی گھر میں رہے؟

”جہاں عورت وہاں مرد۔“

”گھر خالی ہوا ہے ہیں، ہوٹل آباد ہو رہے ہیں۔ جتنے زیادہ ہوٹل بڑھتے

ہیں اتنے ہی گھر خالی ہوتے ہیں۔ ہوٹلوں میں دل سہلا دے کے کھلونے مل جاتے ہیں مردوں کو۔“

”بہن کا تو خواہ مخواہ نام بدنام ہے۔ اسے سرکار تو ڈھی دے تو اچھا ہے۔“

”بہن تو ت رہی ہے۔“

”بہن ٹوٹنے کی خبر مرنیک سائیں کو دلی طور پر خوشی ہوئی۔ اس کی تو

اگر ذہنی یہ غمی کہنتی کی اینٹ ٹوٹ کر اس کے چوبارے میں لگ جائے اور پھر
نیتی پیرنی ہیں کی ہو رہے۔ اس نے تو منت مانی تھی کہ جس دن تہی توئی وہ ہیں
چڑھائے گا۔

ایک مدت تک تکیے کا خوشناکرہ منسان چرا رہا لیکن نیتی پیرنی کے قدم
دھرتے ہی سُکرانے، جُکھانے لگا۔
رات انتہائی دلغز ہی سے آئی۔

رات آئی، رات جب کچھ لوگوں کے دل بیدار ہوتے ہیں، جو سو جاتے ہیں
اُن کی روحیں دیرانوں میں بھٹکتی پھرتیں یا پھر رمانوں کے جزیروں میں۔ نیتی
پیرنی کا بدن میبار تھا اور اس کے لہو کی حرارت شراب کے شعلوں کی لپک
سے ہم آہنگ تھی بھٹکتی ہوئی، اس کے پنڈے کی چراند کمرے میں جذب
ہونے لگی اور پھر نیک سائیں کے جذبات نے بھی لُوک پڑی۔ دونوں شراب
کے نشے میں چلنے لگے۔ رات بھر چتا جلتی رہی۔ چراند اڑتی رہی۔ صبح ہوئی تو
چتا بجھ گئی اور دیرِ بختہ بدنِ قالین پر اُدھ موئے پائے گئے۔ قریب ہی
شراب کے برتن پڑے تھے۔

باہر تکیے میں نصر و حسب معمول ڈنڑ پینے کے بعد ہاتھوں سے اپنی چکیلی
رانیں آہستہ آہستہ گمزدور زور سے مُسل رہا تھا۔ اُس کی پیشانی پر سینے کے
قطرے آویزاں تھے۔ بدن پر جوانی چمک رہی تھی۔ وہ ہر روز بڑے خضوع و خضرت
سے پڑتے آکر پہلے بدن کی مالش کرتا، پھر کسرت کرتا اور آخر میں رانیں مسلتہ
یہ اس کی عبادت تھی۔ اسے یہ نکتہ ابھی طرح معلوم تھا کہ صفِ اول کا خذو

جنے کیلئے بدن کمانا پڑتا ہے۔ البتہ یہ بھی اسے معلوم نہ تھا کہ بدن کا بانگیس اور کیوں کو چیت کرتا ہے۔

اس کی ساری سوچ ایک ہی نقطے پر سمٹ آئی اور وہ گرد و پیش کی دنیا سے بے خبر اپنے بدن کی شادابی اور لہو کی تابانی کے نظارے سے آپ ہی چیت ہونے لگا۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ نیتی پیرنی اسے تنگ رہی ہے۔ پل بھر کو اس کی نگاہیں اس کے بدن سے نہ نہیں۔

نیتی پیرنی خوش ذوق تھی۔ وہ بھی جس وجوہاتی کی نگہداشت کے راز سے آگاہ تھی۔ قدرت نے اُسے اچھا بدن دیا تھا، اچھی شکل و صورت عطا کی تھی۔ اس کے نزدیک اسے نکھار سفاک کر رکھنا اور ثواب تھا اور کارساز کی منشا کے مطابق انہیں بگاڑنا گناہ تھا۔

نصرو کو دندش کرتے دیکھ کر نیک سائیں بھی مسرور ہوا۔ کبھی نصرو مرہل سا لڑکا تھا۔ اس کی ہڈیوں پر گوشت کے بغیر ہی پھڑ پھڑا تھا۔ نیک سائیں کے زیر ہدایت نصرو نے گوشت پوست کو ترقی دی۔ یوں نئے نصرو نے جنم لیا۔ نیا نصرو درحقیقت نیک سائیں کی تخلیق تھا۔

نیک سائیں کے بدن پر صرف لنگوٹ تھا۔ ہاتھ میں تیریز سوپ کی ٹیکہ تھی جو چاندی کے سوپ کپس میں دھری تھی۔ نیک سائیں کا لنگوٹ ویسی وضع کا تھا لیکن مزاج بالکل دلالتی تھا اور یہ دلالتی مزاج اسے لٹڈی کوتل سے جلاتا۔ لٹڈی کوتل اس کے قدموں میں تھا۔

موتی شاہ نے بھی حسرت بھری نظروں سے نصرو کا بدن دیکھا۔ اس کے

دل میں اُنگوں کا طوفان چل گیا اور اس طوفان کے گرد ماضی کے دھندلے لپٹ گئے۔ نورو کے بدن میں بھلیاں ترپ رہی تھیں اور ان سے پھوٹتی ہوئی جوت اس کا مستقبل جنگلگ رہی تھی۔ موتی شاہ بھی کبھی یوں ہی جوان تھا اور اس کے بدن نے بھی کبھی جوانی کے سیل بے پناہ کو پناہ دی تھی لیکن پھر جو جی مر گیا اور اسے تکیہ کھا گیا۔ رنڈی کو چوبارہ کھا جاتا ہے۔ غنڈے کو تکیہ۔ رنڈی چوبارہ نہیں چھوڑتی۔ غنڈہ تکیہ نہیں چھوڑتا۔ انھیں بیٹھے کو تو مردہ جگہ چاہیے تھی۔

جو جی حسین اور نازک مزاج تھا۔ لانا قدا پتلا جسم، بڑی بڑی آنکھیں و انت چمبے کی کلیاں۔ ہر وقت ہنستا رہتا۔ موتی شاہ اسی ادا پر فریفتہ تھا۔ جو جی کو اختیار تھا کہ بازار کی جس دکان سے چاہے سودا لے۔ جو چیز چاہے اٹھا لے۔ جسے گالی دے وہ ٹپ چپا پٹ لے۔ جسے پیٹنا چاہے وہ شرافت سے پٹ جائے۔ اس کی پٹائی میں موتی شاہ کی صرف وجاہت ہی شامل نہ تھی۔ اس کے کمانی دار چاقو کا دبدبہ اور خوف بھی شامل تھا۔ جو جی کبھی جلال میں آتا تو اس کا گلابی چہرہ ہنستا کر لال گلاب بن جاتا اور پھر دیکھنے والا اسے محلے لگانا چاہتا تھا اور یہ جلال تو بس گھڑی دو گھڑی ہی کا ہوتا، پھر وہی لال شعلہ گلابی تاؤ بر آ جاتا۔ جو جی کیا ٹرا، بازار مر گیا۔ موتی شاہ مر گیا۔ اس کا جنازہ اس دھوم سے نکلا جیسے کسی ہیرو کا جنازہ ہو۔ موتی شاہ دل شکستہ ہو گیا، ہاتھوں میں سکت نہ رہی۔ اس نے کمانی دار چاقو پھینک دیا۔ تکیے کی شمی میں مل کر مٹی ہا آج جو اُس نے نورو کا بھرہ بدن دیکھا تو وہ تلوار تھا۔ اس کے بدن میں نورو کا بدن ہلکے سے لیٹے لگا۔ اس کے بدن میں اچھل سی مچی۔ اس نے جو امیں باند لہرا

کھڑے کھڑے دوڑ لگائی۔ نضر اس حرکت پر ہنسا اور پھر اس کی ہنسی قہقہوں میں بدل گئی۔ ان قہقہوں کی جھوٹ موتی شاہ کے دل پر لگی جو اس نے نوٹ کر لی۔
 نیتی پیرنی کے بال کھلے تھے۔ برچھکتی تو ٹیٹیں تمللا اٹھتیں۔ سامنے سے گریبا کھلا تھا اور ویسے تو سارا بدن ہی کھلا تھا۔ وائل کی تھپتھپ سے کیا ڈھکتا چھپتا۔ کپڑے تو جیسے اسے چھپتے تھے۔ یوں تو کھلے گریبان پر ہر کسی کی نگاہیں جا سکتی تھیں لیکن اس تک پہنچنے والا ٹکیے کی حدود میں کہیں نہ بھتا۔ یہ تو ٹیک سائیں ہی کو شرم حاصل تھا۔ اس کے شاواہا رہیں پنڈے کو چھو سکے۔
 نیتی پیرنی موت تھی۔ قریب آنے والے کے لئے! نہ جانے ہر کسی کو ڈس لیتی نضر کو قہقہہ لگاتے دیکھا تو اس نے گریبان کچھ اٹھکھول دیا اور پورے ٹکیے کو فیر کی زد میں لے لیا، موتی شاہ پر قہقہہ لگنے لگا نظریں ڈالتی ہوئی نضر کے پاس چلی گئی اس کے حضور میں ایسا بھر پور بدن تھا جس کا انگ انگ جوانی سے لبریز تھا۔ ایک خفیف سی خراش، زخم کا منہ لی سا نشان بھی نہ تھا کہیں پنڈا اٹھلا ہوا چاند۔
 ”یونہی ہنستا رہ کر قہقہے مارتا رہ کر ہڑا اچھا لگتا ہے تو“ نیتی پیرنی نے پاؤں تلے سگریٹ مستے ہونے کہا۔

بہ بی بی موتی شاہ کیوں جلد ہے مجھ سے؟ اسے میری ہنسی اچھی لگتی ہے،
 نہ قہقہے اچھے لگتے ہیں؟

”اس کا جو جی جو سر گیا۔ وہ تو پاگل ہے، پاگل۔ جو جی کی یاد میں گھل گھل کر گھوٹا ہو گیا ہے۔ اس کے اندر کچھ نہیں رہا۔ بڈیوں میں سے گودا بھی نکل چکا ہے۔ جوانی اور جو جی کو یاد کرتا رہتا ہے۔“

”جوانی کے لئے بڑی جان مارنی پڑتی ہے بی بی! جان بنا نا کھیل نہیں۔“
”ٹھیک کہتا ہے تو نصرو!“

ادھر مکالمہ ہو رہا تھا، ادھر کنویں پر مولا ملنگ بوکے نکال نکال کر نیک سائیں پر چینک رہا تھا۔ نیک سائیں نہا نام کم اور نیستی پیرنی کو دیکھتا زیادہ تھا۔ نصرو بھی اس کی نگاہ میں تھا اور کیسے نہ ہوتا؟ نیک سائیں اس کا خاتی تھا اور اب اسے اپنے منصوبوں کا معیار سمجھتا تھا۔ اس کے خیال میں بھی نصرو کے چالو ہونے اور اس کے کام کی رسم اقتراح کا وقت نہ آیا تھا۔

نیتی پیرنی نے ایک بار پھر نصرو کا بھوٹا جوازہ لیا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر چلی گئی

نیک سائیں نہا کر دیزر باندیر کے پاس چلا گیا۔ نصرو کنویں پر چلا گیا۔
نیتی پیرنی نے اندر سے مولے ملنگ کے ہاتھ حلوے پوری کا طباق بھیجا۔
چائے کی چینک خان کی دکان سے آگئی۔

نیک سائیں پر ابھی تک ناتھانہ کیفیت سوار تھی۔ اس نے موتی شاہ کی رائے پر ہاتھ مار کر کہا، ”مولا جانے! عورت کو جوتی تلے دبا کر رکھتا ہوں۔ کیا مجال ہے، جائے اور لوٹ نہ آئے۔“

”اوے! آہو بادشاہ! نیتی پیرنی کی کیا ہستی ہے جو تجھ سے مقابلہ کرے؟“
”مقابلہ! تو بہ تو بہ کر کے کہتا ہوں، غرور کی بات نہیں، جس عورت کا ایک دندہ کلاہہ بھرا ہے۔ وہ دوبارہ کسی دوسرے کے پاس نہیں جاتی۔“
”کیا کہنے نیرے بادشاہ؟“

”قسم ہے مولا کی! رستم کی بھی عورت ہوتی سے لوندی بنا لوں۔ اللہ مدد فرما
ماں کا یار ہوں، ماں کا یار!“

”مجھے خبر ہے تیری! دشاہ! گلی کی عورتیں تجھ سے پناہ مانگتی تھیں؟“
”جلی کو تو بھگنل کر دیا تھا۔ میں نے قسم پروردگار کی! ابھی منڈے کے
پاس ہوتا تھا تو گلی کو میری خبر ہو جاتی تھی اور پھر ادھر رنڈیوں نے میری شکل
دیکھی۔ ادھر ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو گئیں۔“
”تجھ سے ڈرتی تھیں بادشاہ!“

”موتی شاہ! کبھی مفت بری نہیں لڑائی۔ پہلے ناک پر دھا کا رکھتا تھا
پھر رنڈی کی دلیز پر پاؤں دھرتا تھا۔
”جڑی جڑی رنڈیاں پاؤں پکڑتی تھیں۔“
”نیتھی پیرنی گھٹ نیتی کسی سے۔“

”جواب نہیں اس کا۔ خدا کی قسم ناک پر کھتی نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ جڑی منہ
زور نیتی۔ دس روپے روز دیتی تھی کرایہ جو بارے کا۔ جڑی سچ سنو کر بیٹھتی تھی۔
ابے مفت برو کو چاقو مار دیا تھا اس نے اتنی تو سہتہ چھوٹ نیتی بمزور داتنی تھی
کہ آنکھ بھر کر نہیں دیکھتی تھی تماش میں کو۔ لیکن دیکھ لے، رام کر لیا ہے اسے!“
”اوسے نہیں جواب تیرا بادشاہ!“

”مولا جانے باندھ دیا ہے پیرنی کو۔ ہل نہیں سکتی۔ دو دفعہ بھاگی ہے لیکن
آپ ہی واپس بھی آگئی ہے۔ میرے یار اس کی کیا ہستی ہے کہ یہاں سے جاتے؟
عورت تو میری مٹھی میں ہوتی ہے۔“

پوری جلوہ ختم ہوا تو باتیں بھی ختم ہوئیں۔ مولا ملنگ طباق لے کر اندر گیا۔
تو نیک سائیں کی باتیں بھی اندر لے گیا۔ طباق رکھتے ہی اس نے ساری باتیں
اُگل دیں۔ ایک ایک بات زہر میں بھجا ہوا تیر تھی۔ ہر بات دل میں جھنجھتی پیرنی
نے اسے بالوں سے گھسیٹا اور دکھتی میں دو چار لائیں جڑیں۔

”بد ختم، تمک حرام! تیرے سے میری حمایت میں کوئی بات نہ نکلی تو نے
وہیں دے کے کاموند نہیں توڑا جب وہ میرے خلاف زہرا اُگل رہا تھا؟“
مولے ملنگ نے روتے روتے کہا: ”بی بی دلا جراحیر دست ہے۔“
”جانتی ہوں اسے۔ بنا پھرتا ہے زبردست تجھ ایسے کے لئے یہ
بی بی وہ کسی سے ولا نہیں جاتا۔“

”رندی کے! یعنی پیرنی اسے دل دکھائے گی۔ دیکھنا کیسے شررگ دباتی
ہوں۔ ٹوٹے چھتر کی طرح بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔“
مولا ملنگ ایک جانب ڈرسم کر بیٹھ گیا اور دیکھنے لگا کہ شعلوں بھری یہ
آندھی کب تھمے گی۔

وہ سچ پچ آندھی ہی تھی لیکن اس کی رفتار زیادہ نہ تھی کیونکہ جس قالین
پر آندھی چل رہی تھی وہ بہت ملائم تھا، بالوں کی گچھاؤں سے ریشمیں دلدل
ہو گئی تھی۔ اس میں آندھی کے پاؤں دھنس دھنس جاتے یہی ریشمیں دلدل
نیک سائیں کی حمایت میں خاموش آواز بن کر اس کے دل و دماغ میں اتر گئی۔
وہ غصے کے مارے قالین کو کھوندتی رہی۔ اپنی دانست میں نیک سائیں کو تھوڑے
تکے روندتی رہی جس نے کمرے میں اس کے حضور سارا لندی کو تل رکھ دیا

تھا۔ کوہ پر دم سے گری تو اسے ہلکے ہلکے 'نرم نرم جھلکے گئے جیسے نیک سائیں نے اسے جھولا جھلایا جو اس کی آنکھوں میں گلی کا وہ چوہا بارہ گھوم گیا جو بڑا بھگا کو ان تھا اور جہاں شام کو بدھنی کے پھول کھلتے ہی تماشا بین کی آرزوئیں اس کے گرد ہالہ بنا لیتیں۔ وہ اُجالے کے قلعے میں رانی بنی رہتی اور لوگ جھروکہ درشن کے لئے بار بار چکر کاٹتے رہتے۔ دہلیز پر وہی پاؤں دھرتا جو راجہ ہوتا۔ دوسرے تو بس دور ہی سے آنکھ مار کر جی خوش کر لیتے اور اس کی دہلیز پر پاؤں دھرنے کی تمنا کر کے چلے جاتے لیکن اب جی اُجڑ رہی تھی تلخ برباد ہونے کو تھا ہر صبح تباہی کی خبر لاتی اور اُسے نیک سائیں سے قریب تر کر دیتی۔

سگرٹ پیالہ، پیالہ پیالہ۔ کچھ جی ملکا ہوا۔ پھر صندوق میں سے دس دس کے نوٹ نکال کر مولے ملنگ کے ہاتھ جیسے کو بھجوائے۔ مولے ملنگ نے جاتے جاتے کہا: بڑی نیکی کراتی ہے تو بی بی! جیلاں بچاری کا اس دُنیا میں کون ہے؟ ابھی تو اس کے بچے بھی جوان نہیں ہوئے؟

چاند بھیر نور عثمانی کے ساتھ طلوع ہوا۔ ملنگ سرور میں آئے۔ جہانگیر محبوب تھا، ہجرت فراق کا سا تھنی تھا، خوب صورتی کی علامت اور بس اس کی کرن کلیوں سے زمین و آسمان جگمگا رہے تھے۔ یہ کرن کلیاں تو ملنگوں کی محفل سجا رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر قوالوں نے بار بار انتہائی جوش و خروش سے نعرے لگائے اور ملنگ بھنگ کا پیالہ پی خیاں کی میٹر جی لگا، آسمان پر چڑھے اور ستاروں پر کند ڈال آئے۔ بھنگ کا پیالہ پی کر وہ ٹھہرے جاتے اور ان کے خیال پلڑے تک بن جاتے۔

رات کو ملنگ سرور میں آئے اور قوالی کی محفل جمی۔ دو ملنگ لڑکھڑا کر رقص کر رقص کرنے لگے۔ ویسے ہر ملنگ جھوم رہا تھا۔ سربول اور گھڑے کی بھڑبھڑیسیے روح میں جھوم رہی تھی اور پھر پوری کائنات گھوم رہی تھی۔ موتی شاہ کے گلے میں نور تھا۔ اس کی آواز نے جاؤ جگا دیا اور مریلی آواز نے سب کو مہر مست کر دیا۔ مہر مستی مہر مستی میں بدل گئی۔ ٹیک سائیں کی آواز بھی کم دکھائی نہ تھی۔ مہر مستی نے رقص کرنے والے ملنگوں کا انگ انگ ٹوڑ دیا۔ وہ گر گئے اور فرش ہو گئے وہ ملنگ ہی تو تھے۔ افریقہ کے جاؤ پرست تو نہ تھے جو چاندنی میں دیوتا کو زیر کرنے اور کھیتیاں لہلانے کے لئے رات رات بھر ناچتے اور تنکے کا نام نہ لیتے۔ یہ تو بھنگ پی کر خود ہی زیر ہو جاتے دنیا کو کیا زیر کرتے۔

نصر عروج پر تھا تو نصر بھی آگیا۔ دو گھوڑا بوسکی کی بے داغ بے سلوٹ چمکیلی قیس پہنے ہوئے تھا۔ ہرے بتو والا ریشمی لاپا بانڈھ رکھا تھا چاندنی رات میں بھی اس کے چہرے پر تمازت تھی۔ ہوا سے دھوئی مہرستی تو اس کی پتلیوں کا شکار ڈور ڈور چلتا اب تو غیبی بیرنی بھی باہر آ کر چوتھرے پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں رہ رہ کر نصر کی تنی ہوئی گولوں اور چوڑی چمکی چھاتی پر جاتیں۔

یہ سحر اچھلا بھر پور بدن جس پر کوئی داغ دھبہ نہ پڑا تھا۔ اس کے دل میں پرست ہو گیا۔ کھنکھاتی ہوئی جوانی کے اس چمکتے ہوئے ساز کو ابھی کسی نے بیدار نہیں کیا تھا۔ نصر ایک تیز خواہش بن کر میتی بیرنی کے بدن میں تیر گیا۔ اس نے نصر کو ٹپکے کا آم سمجھ لیا جو ٹوٹا تو اس کی جھولی میں گرے گا۔

نصر مستوں اور مہر مستوں کے حلقے میں بیٹھ گیا۔ موتی شاہ اور ٹیک سائیں

کی آواز کا جھادو اس پر بھی چل گیا۔ وہ بھی سرستی میں جھومنے لگا۔ موتی شاہ نے ذرا دم دبا کر سگریٹ میں چرس بھری۔ مشک کا کرچار کش لئے اور نضر کے کان میں کچھ کہہ کر سگریٹ اسے تنہا دیا۔ نضر نے کش لیا ہی تھا کہ وہ لپک کر آئی جھپٹ کر اس نے سگریٹ چھین لیا اور جوتی سے مسل دیا۔ اس وقت نیتی بیرنی کا چہرہ چنگاری تنہا اور دل کی دھڑکن تیز تھی کہ لہے پر ہاتھ رکھ کر دو چار گھڑی گھڑی رہی اور پھر اس کا سارا غصہ اس کی دائیں مٹھیلی میں کھینچ آیا۔ آگ سے لبریز لپکتے موتی شاہ پر بے تحاشہ برسے گئے۔ نیک سائیں ہاتھ پکڑتا تو جانے کب تک مشق جاری رہتی۔ نیک سائیں بڑی مشکل سے اسے حلقے میں سے لے گیا۔ کمرے میں جا کر اسے کوچ پر بٹھا دیا۔ غصے کے مارے اس کا بدن خفقہ کا منہ ہاتھ۔ وہ بھرپور عورت تھی، رنڈی تھی۔ رنڈی کا غصہ عورت کے غصے سے زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ اندر سمٹنے کی بجائے باہر چھلک آتا ہے۔

نیک سائیں نے غصہ اُٹھوانے اور اسے ہلکے تاڑ پر لانے کے لئے بات چھیڑی۔ دلبر جانی! نضر کو بھی چار چاٹے لگا دیئے ہوتے؟

”اس کے تو میں بال نوچ لیتی وہ تو وہاں سے کھسک ہی گیا۔“

”موتی شاہ چنگاندا دیکھتا ہی نہیں، ہر کسی کو چرس پر لگا دیتا ہے؟“

”کمینہ سونے سی جوانی کو داغ لگانا چاہتا ہے۔ وہ معصوم لڑکا، اُنھنی

جوانی۔ اسے کیا خبر یہ زہر ہے؟“

”نضر تو میری آس ہے رانی! جوان ہے! جیدار ہے۔ ایک دن اپنا

سارا دھندا اس پر چھوڑ دوں گا؟“

”اور تو چہین کی بلندی بجائے گا۔ نیکی میں بھنگیوں، چرسوں کے ساتھ
پڑا رہے گا۔“

”وہ کیوں جب کبھی ڈھیر سا مال لانا ہوگا۔ میں آپ جاؤں گا۔“
”ہوں۔“

نصرو کے بارے میں نیتی پیرنی کو نیک سائیں کی نیت کا پتہ چل گیا۔
اگلے روز اجنبیوں کی ایک ٹولی آئی اور نیک سائیں کو اپنے ساتھ لے گئی۔
کام خطرناک اور چوکے سودے کا تھا۔ اس میں فقط دلیری کام نہ آتی بھٹی، رگو
خجربے اور حاضر دماغی کی ضرورت تھی۔ یہ علم دوسرا تھا جس کی ترسیت نیک سائیں
نے زندگی کے خار زار میں پائی تھی۔

نکیہ خالی خالی تھا۔ موتی شاہ بھی ہم پر گیا تھا اور نصرو حسب معمول
کسرت کر رہا تھا۔

نیتی پیرنی اس کے پاس چلی آئی۔ سر دست اس نے اس کے بال نوچے۔
نہ سگریٹ والی بات چھیڑی۔ اس وقت وہ کیسے غصے میں آئی۔ نصرو تو اس کے
دل میں پھل رہا تھا۔ بولی: ”اڑیا! اور امیرے ساتھ تو چلتا، کام ہے مجھے۔“
نصرو کی آنکھیں جھجک گئیں اور اس پر شرم کا بوجھ پڑ گیا۔ وہ تو اس کے
سائے تلے دب ہی گیا۔ شرم تو چیز ہی ایسی ہے کہ جوانی کی صبح اولیں بن جاتی
ہے اور پھر عورت کے سانسوں کی گرمی سے ایک دن چمک جاتی ہے۔ تب
شرم بواہن کے اڑتی ہے۔ وہ شرم کے مارے اودھ موا ہو کر رہ گیا۔ اس کی
زبان سے صرف ”اچھا“ نکلا اور وہ بھی بڑی جھمی آواز میں۔

نیتی پیرنی پھول تھی، پھول سُکرایا۔ اس نے اپنی دھانگیوں سے اس کی
 ٹھوڑی اُدبھی کی اور اس کی جھکی ہوئی آنکھوں کو اپنی آنکھوں کے متوازی لے
 آئی۔ ٹھوڑی تھامے رہی۔ مبادا پھر آنکھیں جھٹک جائیں۔ اس کے بدن میں جھڑک
 سی آئی اور چہرے پر سُرخ سمٹ آئی۔ وہ سُکرایا اور اس نے نیتی پیرنی کی نظروں
 سے نظریں ملائیں۔ جلو سے سرور سے لبریز ہو گئے۔

”کیوں رہے نصو وہ ماں کے یارے سگرٹ کیوں لیا تھا؟“
 ”اس ماں کے یارے کہا تھا، چرس کا سگرٹ پیتے ہی سو رنگ تیرا پہنچا گیا۔“
 ”سو نہ، کیہنے کم ذات نے بات بھی کی تو کیسی۔ حرامی سو رنگ میں پہنچا جائیگا۔“
 ”سو رنگ میں پہنچاؤں گی کئی؟“
 ”ہج؟“

”ہج؟“
 ”کب؟“

”آج لیکن قسم کھا میری جان کی کہ کبھی سگرٹ نہیں پے گا، چرس والا نہ خالی۔“
 ”تیری جان کی قسم! سگرٹ نہیں پیوں گا۔ نہ چرس والا نہ خالی۔“
 ”بس اب سو رنگ تیرا ہو گیا۔ جھٹ سے نہالے۔ بازار ہوا آئیں؟“
 نصو بدن کی حرارت کم کرنے کے لئے بیٹھ گیا۔

نیتی پیرنی کمرے میں چلی گئی تاکہ اپنے رانچھے پر جادو کرنے کے لئے میرے
 بھی زیادہ خوبصورت بن جائے۔ اس نے غسل کیا اور نئی شادابی سے طلوع
 ہوئی۔ اپنے آپ کو خوشبوؤں میں بسایا۔

اس کے اندر بدن بول رہا تھا۔ چاروں طرف خوشبو کے بھنور بچ رہے تھے۔ کپڑے پہن کر وہ بیس سال کی تنگی بن گئی۔ نصرو نے اس میں جوانی کا احساس جگا دیا۔ ہاتھوں کی رگیں چھپ تو نہ سکیں لیکن اس کے ہونٹوں پر کھلے ہوئے پھولوں اور دانتوں کی چمپا کلی نے اسے سجا کر دیا۔

دونوں بازار چلے گئے۔ اس کے بدن کی جھک سرور بخش تھی نصرو صبح پہلے سو رگ میں پہنچ گیا۔ سو رگ اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے پاؤں تو جیسے زمین پر ٹپکتے ہی نہ تھے۔ اس کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ یہی اسی ہی ذی شان عورت اسے شرفِ رفاقت بخشے گی۔ وہ کب جانتا تھا کہ جوانی ایک غرور لاتی ہے، ایک کا غرور توڑتی ہے۔ وہ بار بار گردن تان کر نگاہیں اُڑا رہی کرتا لیکن گردن اپنے آپ جھک جاتی، نگاہیں نیچی ہو جاتیں یہی پیرنی کی بڑی بڑی آنکھوں سے چمکتی ہوئی گزریں اکہرے مہین نقاب میں سے چھن چھن کر باہر آ رہی تھیں اور دیکھنے والا ان کے نقاب میں تھا۔ بسے حلوائی کے تھڑے پر خیرا جھرنی والا اور اس کے دوسرے بیٹھے ہوئے تھے۔ اکھٹوں نے نصرو کو عورت کے ساتھ جاتے دیکھا تو حیران ہوئے۔ انہیں امید نہ تھی کہ نصرو اتنی جلدی پر پڑے نکال لے گا۔ خیرے جھرنی والے نے کھانسی کھنکار کر گلا صاف کیا اور پھر ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا: "مشتوق بھڑوں ہے؟"

نصرو نے سنا تو اس کا چہرہ تھمتا اُٹھا۔

پھر اس نے کہا: "اس مشتوق کے لئے جان بھی دینی پڑے تو پروا نہیں؟" نصرو کا چہرہ اور بھی تھمتا یا لیکن وہ چپ رہا۔ دراصل وہ اتنی جلدی پہنچے زے

لکھنے پر مضیق سا گیا تھا۔ یہی سیرنی پر دو پوٹیں ہوئیں اور وہ چپ رہا۔ اس نے نقاب اٹھا اور نصرہ سے کہا۔

”کیسے کہنے بد ذات کی کھال دیکھتا کیا ہے؟“

یہ جملہ بجلی کا بھالا تھا جو اسے جا چھجا۔ وہ بجلی کا بھالا بن گیا اور بجلی کا بھالا اس نے خیرے جھرنی والے کو چھو دیا۔ وہی چاقو جو انڈیاں کاٹ چھینتا خیرے جھرنی والے کے سینے پر اس کی مار چیر گیا۔ اس کی دھوٹی خون سے لخت پت ہو گئی۔ چاقو تو خیرے جھرنی والے کے پاس بھی تھا لیکن ڈب ہی میں رہا۔ نصرہ کی کلائی کا زور دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ نصرہ کا بازو اس تیزی سے حرکت میں آیا کہ سب دنگ رہ گئے۔ اس کی کلائی میں نیا کس بل تھا اور اس کی انگلیوں کی حرکت اتنی زبردست تھی جیسے وہ آدمی کو نہیں سائڈ کو مارنے چلا تھا۔ ٹیڈی بائی ٹیک نے آنکھ ماری پھر گالی دی۔ پھر دھکا دیا اور خیرا جھرنی والا بھاگ گیا۔

نصرہ نے چاقو ہوا میں لہرا کر کہا ”ابھنگل“

بھنگل نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ گلی میں مڑ کر غائب ہو گیا۔ نصرہ نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

کر کہا ”عورتوں کی کمائی کھانے والے یہ کیا لڑیں گے مجھ سے؟“

ٹیڈی بائی ٹیک نے ہاں میں ہاں ملائی۔ اس نے ہوا کا بدلتا ہوا رخ دیکھ لیا تھا۔

یہی سیرنی نے نصرہ سے چاقو لیا اور اسے لے کر چلی گئی۔

خیرے جھرنی والے کے بڑے گور تھے۔ بستہ کا بد معاش بستہ الفاف میں ترقی پانے کے لئے بے تاب تھا۔ لیکن نصرہ نے کوکری کر کے اس کی ترقی کیا۔

راستے بند کر دیئے اور اس کا مستقبل تاریک کر دیا۔ علاقے کے رہ لڑکے جو اس کے شاہدِ مستقبل، بڑھتے ہوئے رسوخ اور پھلتے ہوئے کاروبار سے متاثر ہو کر دھڑا دھڑا اس کے حلقہٴ احباب میں داخل ہوئے اور اس کے حکم سے دار نہیں کرنے لگے تھے بدظن اور بد دل ہو گئے۔ اس کا تو سارا طلسم ہی ٹوٹ گیا۔ ادھر یتیمی پیرنی کے دل پر ضرور کی دھماک کچھ اور بیٹھ گئی۔ اب وہ اکثر نصرو کو لے کر بازار میں سے گزرتی کہیں کو بیڑھی آنکھ سے دیکھنے اور آوازہ کہنے کی جرات نہ ہوتی۔ یتیمی پیرنی نے ایک اور نگہ بان پالیا۔ وہ اسے ہر وقت خوش رکھتی۔

سورگ میں رہتے رہتے اس میں اکٹا ہٹ آ گئی۔ آدمی سورگ سے بھی اکٹا جاتا ہے۔ اس میں امیری کا احساس بھی شامل تھا۔ آخر ایک دن اُس نے کہا۔
”میں فس کلاس پشوری تا نگہ لوں گا۔“

”مال ہے“ یتیمی پیرنی نے پوچھا۔

”چاچے سے لے لوں گا۔ گھوڑی اس کے پاس ہے۔ بھبری تا نگہ وہ لے دے گا۔ تجھے تا نگے میں پٹھا کر بیٹوں کا تو مزا آجاتے گا۔“
”تا نگے گھوڑے کے آبِ دن نہ گئے۔ سکوڑے لے لے“
”سکوڑے لئے چاچا دھبلا نہیں دے گا۔“

”رام نیک سائیں سے لے دوں گی۔ پہلے کہیں سے سکوڑ چلا نا سیکھو۔“
پھر میں تجھے آپ پل کے سکوڑ خرید دوں گی۔“

”سچ؟“

”سچ!“

نصرہ کے لئے سکوتر تو بہت بڑی نعمت تھا۔ آدمی کو کار اور کوٹھی پا کر سستی اور خوشی کی کیفیت حاصل ہوتی ہے لڑکے کو سکوتر پا کر حاصل ہوتی ہے۔ وہ فیروز فرما لے کے ڈرائیونگ سکول میں سکوتر چلانے کی تربیت پانے لگا۔ سکوتر اس کا خواب تھا، وہ غریب خواب اور وہ سوچنے لگا۔ جب وہ تیار ہو کر کچھ بٹھائے گا، بیتی پیرنی اپنی باتیں اس کی کمر میں ڈال دے گی اور وہ سکوتر اڑاتا جائے گا تو کتنی اونچی جہازوں میں اڑنے لگے گا۔ بالکل سدرگ میں جہازوں سکوتر پر پری اڑائے گا اور فٹ پاتھ پر چلنے والی دنیا اسے رشک کی نگاہ سے دیکھے گی۔

نیک سائیں کو گئے کئی دن ہو گئے تھے۔ لیکن اس میں تشویش کی کوئی بات نہ تھی۔ وہ لنڈی کوتل سے سیدھا کراچی چلا گیا ہوگا، وہاں سے اور کہیں نکل گیا ہوگا۔ بڑا اکٹا تھا۔ اس کے پاس ہم جوتی کے لئے عقل، تجربے اور حاضر دماغی ایسے تینوں حربے تھے۔ یوں ہی تو روپے کی ریل پل نہ تھی، بیتی اس کے گنوں سے خوب آگاہ تھی، وہ اس کی قدر کرتی تھی۔ وہ اس کی تھی اور نصرہ، نصرہ اسکے بے پیاں غرور اور حکمت کو سنبھالا دینے والا، اس کی آرزوؤں میں کھٹکنے والا جو ان تھکائیں نے ایک خانے میں عقل، تجربے اور حاضر دماغی کو جگہ دی، دوسرے میں بھر بھرنے کو۔ وہ اپنے وقت کی درد پدی تھی۔ اگر درد پدی نوکا پنے دل و دماغ اور بدن میں رکھ سکتی تھی تو وہ دو کو بھی سنبھالنے کی مجاہد نہ تھی۔ اس نے اپنی زندگی کی تشکیل اور شب و روز کی سرگرمیوں کے لئے دو کو ضروری سمجھا اور اب ہمیں ابھی آدھرا، بالکل محصور صورت کا پیدا پایا سمجھنا بھلا لڑکا۔ یہ حیلہ کار کا بولی تھا۔

بالکل باپ پر گیا تھا۔ ہلکی ہلکی مسکراہٹ نے چپ چاپ کمرے میں داخل ہوا نیتھی
پیرنی سنگھار حمیزہ پریشانی بال سفاد رہی تھی۔ اس نے اسے آئینے میں سے دیکھا
تو غریب آنے کو کہا۔ بولی: "ڈرا پیچھے سے چولی کا بند تو کھول دے۔"

بولی جھینپا۔ آگے تو بڑھا لیکن قدم پھیرتے ہی رہا۔ وہ غرض زد ہو کر بولی
"رندھی کے! دم گھٹ رہا ہے جلد ہی کھول را"
رندھی کو آگے بڑھا اور اس نے بند کھول دیا۔

"کیسے آیا ہے رے بولی؟"

"امی! امی کی مشین ٹوٹ گئی ہے۔ سلائی کے لئے ڈھیر سارے کپڑے آئے
ہیں مشین ٹھیک کروانے کو پیسے نہیں۔"
پھر میں کیا کروں کھجرا؟

کھجرا چپ رہا۔ نیتھی پیرنی نے کنگھی رکھی اور ہاتھ مونہہ دھونے پہلی گئی۔
کھجرا ایک طرف کرسی پر بیٹھ گیا۔

نیتھی پیرنی نے ہاتھ مونہہ دھو کر بدن سمایا، چولی بدلی۔ پھر اس نے
سارھی پہنی۔ تیار ہو کر بولی: "چل پترا!"

وہ رات گئے تک جمیلہ کے گھر میں رہی۔ لوتی تو نصرود کمرے کے باہر ٹھل
رہا تھا۔ مارے خستے کے شکل تھا۔ نصرود کو دیکھتے ہی مسکرائی۔ نصرود نے اس
مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے نہیں دیا۔ پھر جب اس نے کبھی حقمانی تو نصرود نے
خاموشی سے تھل کھول دیا۔ وہ تو کپڑے بدلنے لگی اور نصرود چپ چاپ بیٹھ گیا
اب تو اسے نصرود کی سنجیدگی کھٹکی۔ بولی: "تو چپ چاپ کیوں ہے نصرود؟"

”گیارہ بجے ہیں میری گھڑی میں اتنی دیر کہاں رہی؟“
 ”موندہ، تو بھی بس دہمی ہی نکلا۔ جمیلہ کے گھر گئی تھی۔ آپ بھی بیدار ہے۔ اس
 کی مشین بھی بیدار ہے۔ دونوں کو ٹھیک کر دیا ہے میں نے۔“
 ”لیکن جمیلہ سے نیرا کیا واسطہ بنتی؟“

نیتی پیرنی پر ہم جوئی اور قدرے جلال میں آکر بولی: ”اگر میرا واسطہ نہ ہوتا
 چار دن میں مرجاتے۔ اس کچھرنے تو اسے پھوٹ ہی دیا ہے۔ اب وہ بال بچوں کو کیسے
 پالے؟ میں خرچ نہ دوں تو اور کون خرچ دے؟ کون ہے اس کا اس دنیا میں؟“
 اس کے جلال میں صداقت نیتی کی آگ تھی۔ وہ پھر بولی: ”لوگ جانتے ہی
 نہیں۔ کبھی کبھری ہوتی ہے اور عورت بھی۔“

نصرہ کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ جمیلہ کو مرنا نہ چاہئے۔ اسے بھی اس دنیا میں زندہ
 رہنے اور بال بچوں کو پالنے کا حق حاصل ہے اور یہ کار خیر نیتی پیرنی کے ذریعے ہوتا
 کیا مضائقہ ہے؟
 رات سوہگ میں گزری۔

کلی بھوٹی، صبح کھلی، زمیں جھلکائی۔ ایک دنیا بیدار ہوئی لیکن تکیہ نیک سہی
 کے مہنگی چرمی جوتوں میں نہ آسے۔ دراصل انہیں رات بھر سونے جا گئے کاہور
 پڑتا رہتا۔ فجر کے وقت ذرائع ہو جاتے۔ نیتی پیرنی بھی کمرے میں بے شدہ پڑی
 تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے پکھوٹنے کے سلاٹ وہ ساری کروٹیں گنوا رہے تھے
 جو رات بھر بدن نے لیں۔ خاکدان میں سگریٹوں کے بچھے ہوئے ٹکڑے پڑے
 تھے۔ گلاس میں ننھوڑی سی شراب رہ گئی تھی۔ چائنی جوئی پلنگ تلے دھری تھی

اور جوتی والا باہر کیے میں پڑتے ڈسٹریبل رہا تھا۔ اس نے خیرے جھرنی والے کو بھٹکتا کیا تھا اور پھر کیوں نہ بھٹکتا کرتا؟ وہ خیرے جھرنی والے کی طرح عورتوں کی کمائی تو نہ کھانا تھا۔ وہ تو عورت کا یار تھا۔

موتی شاہ کمرے میں داخل ہوا تو پہلے اس کی نظر نیتھی پیرنی کے بدن پر پڑی جو منہ سکرٹ پہنے والیوں کو مات کر رہا تھا۔ پھر اس کی نظر شراب والے گلاس پر پڑی۔ اس نے دو گھونٹ میں گلاس کی شراب تمام کی پھر کمرے کے ماحول کا جائزہ لیا۔ چمکیلی بھڑکیلی چاشنی جوتی نیک سائیں کا منہ چڑا رہی تھی جو اس وقت یہاں نہ تھا لیکر موتی شاہ تو چاشنی جوتی سے بھی زیادہ نشوونما کا خبر لایا تھا۔ اس نے نیتھی پیرنی کے شانے ہلائے اور کہا، ”بی بی!“

بی بی نے ”وسے دفع ہو“ کہا اور دوبارہ نمید میں کھو جانا چاہا لیکن موتی شاہ کے پاس اس کی نمید سے کہیں زیادہ توجہ طلب خبر تھی۔ اس نے پھر شاہ جھنجھوڑا اور پچلا کر کہا، ”نیک سائیں پکڑا گیا ہے بی بی!“

موتی شاہ نے توشا نہ ہی جھنجھوڑا تھا۔ خبر نے اس کا دماغ جھنجھوڑ دیا۔ جوش میں آئی تو موتی شاہ پھر یو لاء نیک سائیں! نیک سائیں پکڑا گیا ہے۔
”نیک سائیں پکڑا گیا ہے؟ کیسے کہاں؟“

”اگک کے پل پر ہی دھریا گیا چرس اور انیوں سے بوری بھری ہوئی تھی۔ وہ تو کونسا تھا خزانہ تھا۔ اتنا سیانا تھا۔ بوری پھینک دیتا دریا میں ڈال دے دیتا، معافی مانگ لیتا۔“

”بی بی! قسمت اُلٹ جائے، بھاگ کھڑا ہو جلتے توڑے سے بڑا لانا“

بڑے سے بڑا خزانہ اترے سے بڑا سامان منہ کے بل آگرتا ہے؟
 غیتی بیرنی کے ہاتھ میں سگریٹ سلگتا رہا۔ انگلیاں جلنے لگیں تو اس نے
 سگریٹ پھینکا۔

”بی بی! وہ کہتا تھا اب کے آسمان ہاتھ لگے گا کیتھرے لئے کوٹھی بنوادے گا۔
 بی بی اور بھی ٹھگیں ہو گئی۔ کوٹھی کا نام سنتے ہی اُسے نیک سائیں کا غم لگ گیا۔
 وہ کہتا اچھا تھا وہ، کتنا خیال تھا اسے میرا!“

موتی شاہ نے یہ جملہ سنا اور اپنی آنکھوں کے سامنے چاننی جونی کو چپکتے
 بھی دیکھا۔ اس نے زیر لب کہا ”رندھی“ اور رندھی تک یہ حرف نہیں نہ پہنچا
 وہ دلدوز انداز میں بولی ”پھر اب کیا ہو گا؟“
 ”مقدمہ چلے گا۔“

”اس کے لئے تو پیسہ چاہئے۔“

”ہاں پیسہ چاہئے۔ پیروی تو نہ ہو گی۔“

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ تھوڑا بہت پیسہ اس کے پاس تھا لیکن مقدمے
 میں تو پیسہ پانی کی طرح بہانا پڑے گا۔ نیک سائیں ایسا دار و اتیار و دزد و قز
 پیدا نہیں ہوتا۔ لاکھوں میں ایک ہوتا ہے مافی کالال۔ اس نے غیتی بیرنی کے
 سارے حق حقوق پورے کئے اور اب گریبا نہیں ادا کرنے کا وقت آگیا تھا لیکن
 پیسہ چاہئے تھا۔ مقدمے کے لئے، اس کے لئے، جیل اور جیل کے بچوں کے
 لئے، انصرو کے سکوتر کے لئے اور پیسہ دینے والا اندر تھا۔ دوسہاروں میں سے
 ایک سہارا ٹوٹا تو وہ مضطرب ہوئی اس کا دل بھج گیا۔ بتیں دانتوں میں سے

نکلنے والی ہریات پوری کرنے والے کو وہ کیسے بھول جاتی؟ اس نے تو عقل و ہنر کی بدولت تیکے کو اول درجے کا کاروباری مرکز بنا دیا اور اس کا نظم و نسق نہایت خوش اسلوبی سے چلایا۔ کس و صوم سے قوالی کی محفلیں جتیں، کس باقا عدلی سے جوا ہوتا، بھنگ گھٹتی، چرس پی جاتی اور اندر خانے ہر قسم کی نشہ آور چیزیں پرچون اور خنوک کے بھاؤ یک جاتیں۔

دن بھر وہ مقدسے کا، اپنا، جمیلہ کا، جمیلہ کے بچوں کا، نصرو کے سکوٹر کا خیال کرتی رہی۔ اس نے سگرٹ پر سگرٹ پھونکے، کمرے میں دھواں بھر گیا۔ اسے ٹپی کا خیال آیا لیکن اب وہاں کیا دھڑکتا تھا؟ وہاں تو دل ڈوب رہے تھے، امیدیں بھٹک رہی تھیں۔ ٹپی اُجڑ رہی تھی۔ ٹپی اب کسی کی آس پوری نہ کر سکتی تھی۔ نصرو آیا تو وہ ٹکلی باندھے چھت سے آویزاں فانوس دیکھ رہی تھی جس میں نئے نئے رنگ برنگی تھکے گندھے تھے جتنے تو روشنی کے پھول کھل جاتے۔ کیسے کیسے پھول کھلا کے تھے۔ پھول سائیں نے! پھر جب ٹیو میں جہنیں قورات میں دن طلوع ہو جاتا۔

نیتی پیرنی کو کھویت کے عالم میں دیکھ کر نصرو دروازے پر ہی رگ گیا۔ او! جب دینک اس کی توجہ اپنی جانب نہ کیچنے سکا تو کھانا نیتی پیرنی نے پیپروٹ سے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور پھر پہلے ہی نقطے پر نظریں لے آئی۔
”بیٹھ جا نصرو!“

اس آواز میں گرجو خشی کی بجائے درد مند سی تھی، ”دھیما پن تھا۔ نصرو ہمیشہ گیا اور ہلا۔“ ”خجے آج کیا ہو گیا ہے، بی بی!“

”نیک سائیں پکڑا گیا ہے“

”اچھا“

”ہاں“

پھر ہوں کہہ کر چپ ہو گیا۔ دل میں خوش تھا کہ اب نیک سائیں کی جبت اسی کی جو رہے گی لیکن آج جنت افسردہ تھی۔ اس نے دلجوئی کے لئے کہا بُرا ہوا بی بی! پر تو غم نہ کر؟

”کوئی اپنے آپ بھی غم کرتا ہے؟ غم تو آپ ہی اندر سے پھوٹ پڑتا ہے“

”چل دنیا کی سیر کرائیں جی ہلکا ہو جائے گا“

”نہیں اڑیا! آج سیر کو جی نہیں چاہتا“

”جیسے تیری مرضی“

نصرد چپ چاپ بیٹھا رہا۔ وہ بولی ”نصرو! تو تانگہ گھوڑا خرید لے!“

”کیوں سکوتر نہیں لیتا؟“

جس کے بھرد سے پر سکوتر لینا تھا وہ تو اندر ہو گیا۔ میرا تو خیر ہی اتنا بڑھ

گیا ہے کہ اس کے سوا، دوسرا پورا نہیں کر سکتا۔“

”تھوڑا بہت خیر تو میں بھی چلا دوں گا لیکن گھوڑے تانگے کا قرض بھی

تو اٹانا ہو گا۔“

”مجھ سے یہ خیر پورا نہیں ہو سکتا، بلی! تمہاری کیسل کے سگڑ پتی ہوں“

”کبھی ویسی نہیں بی۔ یہ خیر تو دھڑ پوری کرتا تھا۔“

”ہوں“

رات بھر تدبیریں سوچتی رہی۔ نیکیے کا کاروبار بڑا مشکل تھا۔ پولیس کی زد سے بچنا، جواریوں سے نمٹنا، پھر س کا اسٹاک چھپا کر رکھنا، اثر و رسوخ سے کام لینا آسان نہ تھا۔ لے دے کے موتی، شاد اور مولائی نگ رہ گئے تھے۔ نیک سائیں کے جانشین لیکن نیکیے کا نظام سنبھالنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ وقت آن پڑا تھا اور اسے خود ہی کچھ کرنا تھا۔

نصرو نے گھوڑا مانگ لے لیا۔ چاچا نے مشکلی دے دی۔ مشکلی بھی ایسی جیسے پری۔ پورے اڑے پر سب سے الگ نظر آتی اور دوڑنے میں بھلی تھی۔ مہنہ تھی تو گردن منحنی اور لانی لانی ایال ہوا میں لہراتی۔ پھر تانگہ؟ وہ تو قوس قزح تھا۔ ساتوں رنگ اس پر اتار دیئے تھے کاریگر نے۔ نہایت فصاحت پسند اور شوقین مزاج اس پر بیٹھے۔ معمولی گاہک سے تو نصرو سیدھے موندنا نہ کرتا۔ جو بھی آتا سالم تانگہ کرتا۔

ایک دن مینہ پڑا اور آسمان پر قوس قزح نکھری۔ رنگوں کی موجیں اس میں آکر ٹھہر گئیں۔ ایک گوشے میں چاند ترازو ہو گیا تھا۔ بادلوں کے جزیرے جگہ جگہ ثبت ہو کر رہ گئے تھے۔ مینہ پڑا تو ہوا میں خشکی آگئی۔ نصرو کے عین سامنے قوس قزح کا پل کھڑا تھا۔ طبیعت مچلی، جی میں آئی چل کر بی بی کو لائے اور قوس قزح پر نکل آئے۔ پان سات روپے کم کما تے تو کیا ہوا؟ ابھی خیال کی گردش تھی نہیں تھی۔ اور وہ باگیں تمام کر مشکلی کو اسٹارٹ کرنے ہی کو تھا کہ پیچھے سے ایک لڑکے کی آواز آئی۔ ”تانگہ! یہ آواز بُو بی کی تھی۔ اور کسی کی آواز ہوتی تو وہ کان بھی نہ دھرتا لیکن بُو بی کی آواز پر کیسے شنی ان شنی کرتا؟ اس نے ایڑ لگائی۔ ود اور تلگے آواز

کے کوندے پر لپکے۔ نضرو کی مشکلی فزائے بھر کرائی اور اگلی ٹانگوں پر ناپچنے لگی۔ بھجوا اور بوٹی کے ٹانگے بھی بلا کے خوبصورت تھے۔ ان کے گھوڑے بھی بڑے بائکے تھے لیکن نضرو کی مشکلی کے چمکتے ہوئے ریشمی پنڈے کی شان ہی اور تھی۔ شاہی دروازے کے باہر والے دروازے پر جگمگاتے جھللاتے ہوئے یمن ٹانگے اکھڑے ہوئے جن کے جانور بڑے میل تھے۔ سواری بڑے خرنے سے برآمد ہوئی۔ بوبی کے ہمراہ کبوتری رنگ کے نئے برقعے میں ایک عورت اندر باران میں سے شاہی دروازے کی جانب آئی۔ چال میں پھرتی تھی۔ برقعہ اوچک رہا تھا۔ اور پہ ٹانگے ایسے ہی چمکتے دکھتے ہوئے برقعوں کے لئے مخصوص تھے۔ انگلیوں میں بڑا ڈانگوٹھیاں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ عورت نے نقاب اٹھائے بغیر بوبی کے کان میں کچھ کہا۔ بوبی اور عورت ٹانگے میں بیٹھ گئے۔ نضرو نے بوبی کو دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ جمیلہ کس نیت سے ٹانگے میں بیٹھی ہے۔ جانتا تھا کہ نیت پیرنی کے پاس اب اتنا روپیہ نہیں کہ جمیلہ اور جمیلہ کے بچوں کا خرچ بھی پورا کرے۔ اب تو یہ خرچ خود اسی کو پورا کرنا تھا۔

عورت نے دونوں نقاب گرا رکھے تھے لیکن ٹانگے پاؤں کی وہ بار بار مسالٹن کرتی۔ نضرو نے جمیلہ کو دیکھا تو نہ تھا۔ لیکن جانتا تھا کہ نیک سائیں بڑا خوش قسمت ہے۔ اس کا انتخاب ضرور دلا دیں گے۔

لاہی لانی مریض انگلیوں نے اشارہ کیا اور نضرو نے مشکلی کا رخ اشارے پر پھیر دیا۔ ہوا میں سناٹا لہرایا، مشکلی بجلی ہو گئی۔ بڑی شرک پر نکل آیا تو مشکلی رکستی تھمتی ہوئی دھنک کے متوازی دوڑ رہی تھی۔ ایک بار مریض انگلیوں نے

اشارہ کیا تو نضر نے پیچھے کو ذرا گردن موڑی اور اس کی نظر پورے ننگے بازو پر پھسل گئی۔ اس کی مضبوط انگلیاں پھل گئیں اور وہ چکنے پھیلے، طاسم گردن بازو کو دبانے کے لئے تڑپا۔ اسے اندازہ ہوا کہ معشوق بے نظیر ہے۔ جو ہوسو ہونٹیں پیرنی سے بے وفائی جوتی ہو تو ہو، وہ کون اس کی بیوی تھی اس سے کاہے کی وفا کاہے کی بے وفائی، آج وہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دے گا۔ اس نے پیر چابک ہوا میں لہرایا، مشکلی اور بھی مہر کی اور وہ آپ معشوق بے نظیر کے حسن کے خط و خال مرتب کر کے پھر کی اٹھا۔ رگ دپے میں حرارت دوڑ گئی اور لہو میں مستی کو زندہ لگی۔ اس نے بالو کا نغمہ چھیڑا اسے

ہتھ جوڑا اسے کہیاں دا
نالے سا ڈاما ہی لگدا

نالے چائن اکھیاں دا

بوی پیک کر اٹھی سیٹ پر جا بیٹھا اور گاہے گاہے دو انگلیاں ہونٹوں میں رکھ کر زور سے سیٹیاں بجانے لگا۔ مشکلی بار بار مہر گئی۔ نضر بھی سیٹیاں بجانے لگا اور پھر دونوں ہنسنے لگے۔ مشکلی اب بڑے ہوٹل کی سمت جا رہی تھی اور نضر کے چہرے نے کہہ رکھا تھا، بڑے ہوٹل کی سواریاں لینا۔ موندہ مانگا گرایہ ملے گا اور قرض جھٹ پٹ اترے گا۔ لیکن نضر تو سود و دنیاں کی منزل ملے کر کے عقل و خرد سے دور جنونِ مستی کے سرب میں اُگیا تھا جہاں آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔

پچھل نشست پر عورت بیٹھی تھی کبھی کبھی اس کی زلفیں ہوا میں لہراتی جہنیں وہ مرضع انگلیوں سے سمیٹ لیتی۔ اس پر ایک کار کی روشنی پڑی اور

اس نے نقاب اُلٹ لئے۔ کار کی رفتار سُست پڑ گئی۔ وہ مسکرائی۔ روشن کھراؤور
 روشن چہرے میں سمجھوتہ ہو گیا کار رُک گئی۔ مرصع انگلیوں نے اشارہ کیا، منٹکی
 رُک گئی۔ انگلیوں نے بوبی کے پٹکی بھری۔ بوبی اور مرصع انگلیاں نیچے اُتر گئیں
 نصر و نے جنوی دستی کے مراب سے پٹنے کی کوشش کی لیکن اسے دیر ہو گئی۔ اور
 عورت کار میں جا بیٹھی۔ بے نقاب عورت نے کار والے کو دس کا نوٹ نکالنے
 کو کہا۔ سو سو کے نوٹوں میں پانچ پانچ کے دو نوٹ تھے عورت نے نوٹ لے کر
 بوبی کو دیئے اور نصر و کو تنہا آنے کو کہا۔ اب نصر و جنوی دستی کے مراب سے
 پلٹ آیا تھا عورت کا جانا پہچانا ہوا تاب دار چہرہ اس پر بھلی بن کر گرا۔ بوبی تانے
 میں ایک نوٹ پھینک کر کار میں آ بیٹھا جو شعلہ دار گزرتی۔ نصر و کا سارا غصہ
 اس کے حلق میں سمٹ آیا اور اس نے پوری قوت سے چلا کر کہا: "گشتی"

"اُداق" لاہور

بڑیاں

وہ بڑیاں آماں سے کب بڑیاں بنیں کسی کو یاد نہیں۔ ان کی عمر کا بھی کسی کو اندازہ نہیں۔ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا وہ لاکھوں لاکھ تو نہیں مگر بیاں صحت کی لہجہ تھیں اور پھر برسوں ان میں ذرا سی تبدیلی بھی نہیں آئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ جیسی ہیں سدا ایسی ہی رہیں گی۔ ساٹھ سال سے وہ کسی نامرغی عمارت کی طرح قائم و دائم تھیں جس کے نہ ہونے کا کبھی کوئی تصور بھی نہیں کرتا۔

انگوٹوں دیکھی نہیں کانوں سنی ہے کہ جب اولاد نہ ہونے کے بہانے میاں نے دوسری شادی کی تو یہ ماتھے پر نل نہ لائیں۔ چھوٹی کی ساری اولاد کو یہ پیدائش کے بعد سمیٹ لیتیں جیسے قدرت نے تقسیم کار کر رکھی ہو کہ وہ جنیں اور یہ پالیں۔ چھوٹی کے سارے بچے انہیں بڑیاں کہتے اور یوں چست رہتے۔ جیسے گڑ پر چوشتیاں۔ ریڈیو پر فلمی گانوں کی فرمائش کی طرح ان کی فرمائشوں

کو کوئی اختتام نہ تھا۔ ہاتھوں کا میل اتارنے کے انداز میں روٹیاں مل مل کر ملیں جتا تیں اور خوب شکر گئی قال کر ان کو ٹھونساتیں۔ میدہ بمبون کر اس میں آم اور چینی ملا کر گڑسا پکتا بچے بھاگ بھاگ کر کام کرتے۔ اسی بہرہ پر ہیں چھوٹی کو خبر ہو جاتی وہ ان کو بڑھرائیں۔

”اے بڑی کیا ہو گیا ہے تمہیں، بیٹھے کا گھی دو دوں میں فٹھا دو گی اے وا۔ روز صلوے روز پر اسٹے“

بڑی تپھنا کر کہتیں: ”اے رہنے دہتمیں گھی پچوں سے پیار ہو گا سوا، کون سے صلہ سے بچے ہیں، ایک ذرا لپٹا بنا کر دے دیا تو قیامت آگئی، جھاڑا سہا سہا کیا کام ہے۔ اپنے سیاں کے کوفے سے لگ کر بیٹھو میں جانوں میرے بچے، یہ سب ہو ہونا جیسے رو بہنوں میں لاگ لپٹ ہو رہی ہو میاں آجاتے تو کہتے، ہاں ہاں بچے ہیں کھانے وہ بڑی، میں بھی چکھانا“

”اے خاک یہ موا حلوہ ہے؟ نہ خشک میوا، نہ کیڑہ نہ الا پچی، یونہی پچوں کو بہلانے کو بنا دیا ہے تمہارے حلق سے کہاں اُترے گا؟“

میاں چپستے، چھوٹی بڑ بڑاتی چل جاتیں اور بڑیاں غرے پچوں کو بٹا کر دیتیں۔ ”لے چو تو اور لے لے“ اے لیکن تو بھی چکھ“ پچوں کے درد سے الگ رہ کر چھوٹی کو کتن سکون تھا اور چھوٹی سے پچوں کو جھین کر اپنا لینے میں بڑی کے ہذبہ رقابت کو کتنی تسکین ملی تھی یہ تو وہ جانیں یا ان کا خدا مگر یہ ضرور ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ مطمئن تھیں۔ رات کو کبھی بڑیاں اُٹھتیں اور میاں کے شہستان کا دروازہ بند کرکے دل پر گھونسا سا پڑتا مگر جلد ہی وہ جی ہلانے کو پچوں میں گم ہو جاتیں۔ کبھی کبھی سیاں

جگنو بنے ان کی اندھیری سی کوشری کو جلیگٹا نے بھی آتے مگر اب انھیں خود ہی سمجھنے
 سمجھانے کا شوق نہیں رہا تھا۔ دل کے نازک شیشے پر بال توڑ پڑھی چکا تھا۔ "اوند
 ہٹاؤ۔۔۔ یہ کیا بڑھبھس ہے دائیں بائیں بچے سو رہے ہیں" وہ غرض پیش کرتیں۔
 خدا ایک در بند کرتا ہے تو مشرود کھول دیتا ہے۔ بڑیاں پر محبت کا ایک دھند
 ہوا تھا تو واقعی مشرور کھل گئے تھے جس کو دیکھو مارے محبت اور حرورت کے بھیا
 جارہا ہے۔ خاندان میں کوئی شادی بڑیاں کے انتظام کے بغیر نہیں ہوئی۔ کتنی
 ہی شادیاں بڑیاں کی بیماریوں کی وجہ سے تل تل گئی تھیں۔ نہ بھیا بڑیاں ہمارے
 خاندان کی بزرگ ہیں ان کی شرکت کے بغیر یہ شادی نہ ہو گی۔ وہ چھلنے پھرنے لگیں
 تو تائید مقرر ہو گئی۔ شادیوں میں وہ کئی کئی بدل ادا کرتیں۔ شادی کا حساب کتاب
 کھانے کا انتظام اور پل پل پر ضرورت پڑنے والی ہر چیز کا خیال۔ اسے غلام نے بلوا
 ہمارے ہو تو دلہن کی نتھ کے لئے دو مونی موتی اور ایک بھتی لیتے آنا۔ یہ چیزیں دوا
 کے گھر کی ہو رہے ہیں، موقع پڑتا تو جا کر سمجھانے سے بھی بھر پھرتیں۔ اسے سہلی والو
 کے ہاں یہ رواج ہو گا، ہمارے یہاں یہ دستور نہیں۔ غرضیکہ بڑیاں کیا انھیں اچھی
 خاصی اسرت دھارا انھیں کہ سڑیں درد ہو تو ماتھے پر شوق لوہیٹ میں درد ہو تو
 پانی میں ڈال کر پی لو، اگر ٹھنڈیاں ہوں تو چینی میں دو قطرے ڈال کر شاد۔
 دیور کے ہاں بیاہا ہونے لگتا تو وہ دلیز کی مٹی لے ڈالتے، بیاہا جی کے بجائے
 وہ بھی بڑیاں ہی کہتے۔ "ارے چلو بڑیاں تمہاری دلس نہیں بہت یاد کر رہی
 ہے۔" کچھ دن تو وہ ٹانہیں پھرا کر مارے موت کے اپنی پوٹلی میں اٹرم سٹرم باہر نکلتی۔
 اور دو چار چھوٹی منجھلی لونڈیاں چھوٹی کی ناں ناں کر کے ان کے ساتھ ہولہٹیں۔

”اے جانے دو تم سے باقی ہی نہ سنبھلیں گے۔ وہ چھوٹی کیچھوٹی رہیں کاہلی اور علاء
تذکرہ کرتیں۔ بات ٹھیک تھی۔ یہ تو وہاں جا کر نواز سیدہ کے پوتے کھوئے بازوئے
اور اعشوار کے مسطورے میں لگ جاتیں یہاں باقی بچے چھوٹی اماں کو ناک چنے
بجھا دیتے۔ بچے جن جن کرکچہ ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ یہ جان لیوا کام اب ان کے
باتیں ہاتھ کاکیل ہو گیا تھا مگر بڑی کے جانے کے بعد ان کی جانوں کو سمیٹنا
اور ان کی جٹوں کو پورا کرنا ان کے بس کا نہیں تھا۔ ان کو گئے دو چار دن ہوئے
کہ یہ مانتے ہیں چھوڑ بیٹھتیں مشکل سے کچھا وردن صبر کرتیں پھر ڈولی لے کر پہنچ جاتیں
”اے ہے تم تو اگر بیٹھ رہیں کچھ گھر کی بھی خبر ہے، بچوں نے میل ناک میں دم کر
دیا ہے“

”لو اور سنو! ابھی کچی کو چھوڑ کر کیسے آجاؤں جمعہ جمعہ آٹھ دن کو ہوتے ہیں
مجھے آئے“

”میں کیا جانوں، منجھلے کو کالی کھانسی ہو گئی ہے۔ کھانسی کھانسی کرم دینے
وے ہے“

”اے ہے یہ کیا ہوا، میں تو اچھا بھلا چھوڑ کے آئی تھی، خشتوت کے پتے
اور شہد چٹایا“

”سب کچھ کر لیا، چھوٹی یوں کہتیں جیسے اب دواؤں سے گزر کے دوا
کی کسر رہ گئی ہو۔“

”لو بڑا سنبھالو اپنا ہتھو میں چلی جانے میرے بچے کو کیا کروا۔“ اب لاکھ
کوئی روکے وہ نہ رکیں گی، گھر اکروم لیں گی اور منجھلے کی پٹی سے پٹی لگا کر رات

بھر جائیں گی، بھولیں جس آلا بلا بھول کر اسے دیں گی اور چھوٹی یوں الگ ہو جائیں گی پیسے کسی کو مانت لوٹا کر غنت ہو گئی ہوں۔

بھائیوں کے گھر کوئی بیمار ہو، بچہ ہونے والا ہو یا کسی بچے کی روزہ کشائی ہو کوئی نہ کوئی بڑیاں کو لینے آپہنچتے۔ وہ تھوڑا بہت عذر کرتیں پھر اصرار کے آگے ہمتیار ڈال دیتیں۔ بھائیوں کی ضرورت پر ان کا جاننا بھی ضرور اور چھوٹی کا یہ کہنا بھی ہے اب جا کر بیٹھ نہ رہتا، جلدی آجانا، تمہارے پیچھے یہ بچے مجھے کھا جائیں گے، تمہارے لاڈلے رو کوڈی کا کر دیا ہے انہیں؟ ہاں ماں میں نے تو سب کو بگاڑا ہے، چلو تم اچھی ہو کسی سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتیں۔ اور بچہ تھا کہ کوئی بچہ بیمار ہو، چوٹ لگ جائے یا جھل جائے روتا بھینکتا سیدھا بڑیاں کے پاس آتا چھوٹی مارے مامسا کے درمیان میں کہتی رہ جاتیں۔ اسے ہے کیا بھا، ادھر آ، میں دیکھوں، بچہ پلٹ کے دیکھے بغیر سیدھا اس اندھیری کوٹھری میں پہنچتا جو بڑیاں کا ٹھکانہ تھا۔

گرمیوں کی دوپہروں میں سارا زمانہ سو جاتا نہ سوتیں تو بڑیاں اور ان کے چیلے چانٹے۔ وہ بیوقوف چھوٹی چھوٹی کتروں سے بٹوے بستے دہکتیں اور بچے لڑتے رہتے یہ میرا ہے۔

”واہ تمہارا کہاں سے آیا، اس دن بھی تم نے لے لیا تھا یہ میرا ہے۔“ بڑیاں؟ وہ بڑیاں کو میکوٹ میں ڈالتا۔

”اے ہے بننے تو دو، پہلے ہی ہاتھ ہاٹے ڈال دی، لے بڑو جاکر کھڑا تھا، بننے، بٹوے اور تلے دانیاں بھیتیں اور بھیتیں۔ قرآن شریف کے ٹکڑے غلام کوٹے

لپکے لگا کر تیار ہوئے۔ اس سے دل اکتاتا یا بچے فرمائش کر بیٹھے تو جلتی و دہریا
میں بولنے کے پاس جا بیٹھتیں اور ہند گلیاں شروع ہو جاتیں۔

ایک دیور جانے کہاں کالے کوسوں رہتے تھے، پیروی کے بچے ہونے لگا تو
انہوں نے بڑیاں کو بٹا بھیجا۔ چھوٹا سا قصبہ جہاں کوس بھر پر کوئی بڑھی ٹھڈی
والی رہتی تھی، اسی کا سہارا تھا جو فی شد فی عین وقت پر برابر کے گاؤں میں سیت
ہو گئی و چہرے میں جلی گئی۔ ایسے وقت خدا نے بڑیاں کو مہبت دی کہ انہوں نے
باد چھی خانے کی گھٹل چھری سے نال کٹا، گرم پانی کر کے بچے کو منڈایا، اور جیسے
تیسے زوج کو منبھال لیا۔ وائی اپنا حق پھینے جا نہ بڑوں ہی دل میں عرصے تک پچھتا
کھاتی رہی۔ انہی کے ہاتھوں ایک اور بچے نے ریو سے بڑیاں میں جنم لیا یہ وہنا تھا
جب بچے خدا کی دین ہوا کرتے تھے، ہر سال نہیں تو دوسرے سال ہر گھر میں ایک نئی
دور کاٹا گیا فرض تھا، اسی لئے ہر گھر میں بڑیاں کا پھیرا لگتا ہی رہتا۔ بیکڑوں
بچے وائی اور نرس کے ہاتھ سے سیدھے بڑیاں کے ہاتھوں میں آتے تھے۔ ان
کے ہاتھ سے گھٹی مینے والے بچوں کی گھٹی ہی نہ تھی اور تو اور خدا ان کی دعا ایک بڑیا
عمورتوں کو قبر میں پہنچانے سے پہلے غسل دینے کا کام بھی کر چکی تھیں۔ عرض کوئی ایسا
کام نہ تھا جسے کوئی عورت کر سکے اور بڑیاں نہ کر سکیں۔ احسان ماننے والے جس
طرح داسے ورے بن پڑتا ان کا احسان امارت کی کوشش بھی کرتے۔ چھتے وقت
کسی نے نیا ریشمی بوڑا بنا دیا۔ کسی نے نئی رضائی دے دی۔ اس طرح ان کا پرانا
ٹرکس ریشمی کپڑوں سے پُر رہنا پہننتی تو کم ہی تھیں۔ موج میں آتیں تو بھی نئی تھیں
کو بانٹ دیتیں۔

ایسے ہی کسی کام سے گھر سے کوسوں دور تھیں کہ میاں کی بیماری کا آثار پہنچا۔
 ہوائی جہاز ان دنوں تھے مگر صرف آسٹریا پر اڑتے نظر آتے تھے۔ ان میں سفر کرتے کسی
 کو نہ سنا تھا۔ لے وے کے ریل گاڑیاں تھیں جو کھڑے ہو کر تین دن رات چلتیں تو ذرا بھی
 دن میں لمبے سفر بھی طے ہو ہی جاتے۔ بڑیاں گھر پہنچیں تو میاں کو زمین کے نیچے سوتے
 بھی دیر ہو چکی تھی۔ باہر ٹرپنی اڑتے مرد پکے چڑھنے میں مصروف تھے، اندر دوپٹوں
 سے سر ڈھانکے عورتیں مل جل کر قرآن شریف پڑھ رہی تھیں۔ خود تو عمر سے یہ اوتار
 کی طرح رہتی تھیں مگر سوکھ کا سفید دوپٹہ اور سر کندے سے ہاتھ دیکھ دیکھ کر دل
 پر گھونسا سا چڑھا اور وہیں دلیزیر گر پڑیں۔ پھر سب ہوش میں آئیں تو سارا گھر پہلے کی
 طرح سنبھال دیا۔ چھوٹی سے وہ پہلے بھی نہیں جھلتی تھیں۔ اب تو وہ قابلِ رحم تھی۔
 اس کے پاس ایک میاں تھا وہ بھی نہ رہا۔ ان کے بچے ماشاء اللہ سب حیات
 تھے، پھل پھول رہے تھے۔ جس طرح مالی اپنی پھولتی پھلتی کھیتی کاری کو دیکھ کر خوش ہوا
 کرتا ہے اسی طرح بڑیاں اپنے پوتوں اور نواسوں کی فوج کو دیکھ کر نہال ہوتیں۔
 بچے بھی سب بڑیاں کو برابر یاد رکھتے۔ آخر ان کے گھروں میں بھی مزمیریاں
 تقریبیں اور بچے ہوتے تھے۔

بڑیاں پر دوسرا بڑا صدمہ چھوٹی کی موت تھی جس نے ان کی کمر توڑ دی۔ ایک
 دو تین تیس بیس سال کا ساتھ، پھر اس نے خدمت بھی تو نہیں کروائی اس کا
 بھی اہنہیں غم تھا بس بیٹھے بھٹائے پھل کھڑی ہوئی جیسے میاں کے پاس جانے کو
 اصرار کھاتے بیٹھی ہو۔ بڑیاں کو یوں لگا جیسے کوئی برسوں سے تنہا ہوئی لاشی
 ہاتھ سے پھین کر بھاگ گیا ہو۔ اچانک دنیا کیسی خالی خالی لگنے لگی۔ اس زندگی

میں کیا خاک دکھا ہے جس میں میاں اور چھوٹی نہ ہو۔ رہے ان کے بچے تو اصل میں یہ تھے تو اسی پیل کے ریز جو اچانک سوکھ گئی تھی۔ چھوٹی کسی گھناؤنی سی جھڑی میں مبتلا ہوتیں، بیماری طول کی سختی کچھ دل پر میل آتا تو ادبیات ہوتی مگر ان کے یوں چل دینے میں تو سوائے احساسِ محرومی کے کچھ نہ تھا۔ بڑیاں اس جھٹ کی طرح بیٹھ گئیں جس کے نیچے سے اچانک ستون کی طرح لیٹ گیا ہو۔ اس بڑی سی جھڑی میں جہاں کبھی بند روئے دل پر دھوکے دیتے تھے گھونے پھرنے کا کچھ مزا نہ رہا۔ آج سبائیں بھائیں کرتے کھلے دروازے کھانے کو آتے تھے۔ جلوسے بنائے ہیں کوئی سواد نہ تھا۔ جب گلی پر کوئی ٹوکنے والا نہ ہو۔ بچوں کے ساتھ چادڑوں چنچلوں میں بھی توجہ ہی نہ تھی کہ چھوٹی مٹا بے پر تھی اب تو وہ ہائے کے اس رخ کی طرح تھیں جس کے سارے مقابل کھپ گئے ہوں ایسی جیت اور شاہی کس کام کی۔

پھر وہ دور آیا جو اب تک بہت سے دلوں میں ناسرد ہن کر پل رہا ہے جس نے تخت والوں کو تخت، اشرافیوں میں پہنچایا اور بورڈ انشینوں کو بادشاہی دی۔ ۷۷ء میں سارا کنبدینہ ریزہ خانہ کے عہد میں چھانڈا بے گھر بے در اس سرزمین میں پہنچا جسے پاکستان کہتے ہیں اور پورے ملک میں جس کو جہاں نہ چھپانے کی جگہ ملی بیٹھ گیا۔ کہا افراتفری میں کیا کھویا کیا پایا حساب کتاب کرنے کی بھی کسی کو فرصت نہ تھی نہ غصے کا ایک دھدھکا آیا اور چلا گیا مگر وہ بات پھر پیدا نہ ہو سکی 'اکھڑے دل پھر نہ بے' مجھے کی کوشش میں لوگوں نے چاہا اپنی جڑیں مضبوط کر لیں کھو رہا ہی ہے تو کیوں نہ ذرا گہرائی تک کھودیں۔ سب اسی کھودنے اور مجھے کی نگاہ میں پڑ گئے اور کسی نے نہیں دیکھا کہ بڑیاں اس ہڈ سے درخت کی طرح جس کی ایک آدھ ہی جڑ

مجم پائی ہو، آہستہ آہستہ سوکھ رہی ہیں۔ اس عارفہ دادو گیر میں ان کو پرانا بڑنگ ٹرنک تو صبح سلامت پہنچ گیا تھا مگر وہ خود آدمی ہی آپائی تھیں۔ ان کے دماغ پر کچھ اثر ہو گیا تھا جس کا احساس ایک دم نہیں دھیرے دھیرے ہوا۔ کام کرنے کی وہ بے پناہ دھن اب نہیں رہی تھی کسی نے کہہ دیا تو کر لیا۔ ورنہ بس شلے باتیں جیسے پاؤں میں پھپھے لگ گئے ہوں یا کسی نے چابی دے کر بھوڑ دیا مہلے بڑیاں اب بس کرو جھک جاؤ گی، لو پیٹھ کر یہ سبزی بنا دو وہ سبزی بنا رہیں اور پھر شلے شلے کر دیتیں۔ چلتے چلتے خود ہی بڑبڑاتی رہیں۔ کوئی غور سے سنسا تو بڑبڑاہٹ کا موضوع کوئی ایسی بات ہوتی جو انھیں بڑی لگی ہو چاہے وہ آج ہوتی ہو یا چینوں برسوں پہلے۔

”بڑیاں کس سے باتیں کر رہی ہو؟ کوئی پوچھتا تو وہ چڑھ جاتیں۔“

”اے واہ کس سے باتیں کر رہی ہوں؟ خواہ خواہ مجھے تنگ مت کیا کرو۔“ اور شلے جاتیں۔ اسی دھبے انھیں بھوک بہت لگتی۔ ہر وقت باورچی خانہ چھوڑتیں اب وہ آتما کام بھی نہیں کرتی تھیں کہ گھر کے بچوں سے بڑھ کر انھیں کھلایا جائے ”اے ہے بڑیاں تم نے تو بچوں کو بھی مات کیا ہے، ہم نے تو تم سے بھی پہلے ناشتہ کیا ہے؟“

”بھوک لگی ہے۔“ وہ ہاجت سے کہتیں۔ پھر جو کچھ بھی روٹی، باسی سالن اور پڑا پڑا دودھ نظر آتا یا ڈالٹیر۔ کھ پی کر وہ پھر شلے اور بڑبڑا م شروع کرتیں۔ پھل قد ہی اتنی بڑھی کہ کمرے اور دالان کا چکر لگا لگا کر انھوں نے گھر والوں کو گھس چکر بنا دیا ہر وقت کی بھوک نے گھر والوں کو کھلایا اور بڑبڑاہٹ کا

یہ عالم ہوا کہ وہ جیتی ہوا سے لڑنے لگیں۔ بڑیاں بڑیاں تو بھنبھلتی ہیں، اسے راہ جا رہا تھا کہ
 کہ، کیوں دماغ چاٹ رہی ہے مارچوں چوں چوں چوں اور کوئی کام نہیں ہے کچھ
 مرنی کڑکڑاتی تو پچھلتی ہیں ہاں ہاں ٹیکم صاحبہ سن لیا انڈا دیا ہے تم نے، بس اب
 زیادہ مت اتراؤ، سارے زمانے کی مرنیاں انڈے دیتی ہیں ایک ختم ہی مرنی
 نہیں، جو بچے کسی لیتے تو تماشہ بنا لیتے، وہ اور بھنبھلتی ہیں، بچوں کو سناتیں تو وہ
 اور چھیڑتے، غرض گھر میں یہ جنگ نامہ چرچر رہی عورتوں کو بد مزہ کر دیتا وہ بچوں کو
 مارنے کی دھمکی کے ساتھ بڑیاں کو بھی باتیں سناتیں کہ خواہ مخواہ بچوں میں بچی
 بن رہی ہیں۔ فوراً مشورہ بچوں کی طرح انہیں کسی کام میں بھنسا دیا جاتا جسے وہ
 اٹا سیدھا کر کے پھر محاذ پر آتی پھنپتی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اپنی جن دلی خواہشات
 کو وہ ایک زمانے میں کام کر کر کے بھولی تھیں اب انھوں نے دوسری آواز
 راہیں ڈھونڈ لی تھیں۔ کام میں اب ان کا دل نہ لگتا تھا معلوم ہوتا تھا جیسے
 رشتیاں تڑا رہی ہوں۔ آتا جیسے وہ کسی زمانے میں بڑے پیار سے سچ سچ گھنٹوں
 کیاں مار کر گوندھا کرتی تھیں اب منٹوں میں گول کر رکھ آتیں۔ روٹیاں پکاتیں
 تو کبھی جلی کبھی کچھ، بانڈی بھونپتی تو چراندرہ جاتی۔ برتن دھوتیں تو مار چکے اور
 چکے کہ ایک ایک برتن دوبارہ دھونا پڑتا۔ گھر کی عورتیں ہتیرا جتا جتا اور
 سناٹ کر کہتیں مگر ایک کان سے سن کر دوسرے سے صفا اڑا دیتیں۔

اب لوگوں کا معیار زندگی بھی اُنچا ہو رہا تھا۔ چھوٹے سے گھر میں چاہے
 گھر والوں کے بیٹھنے کی جگہ نہ ہو مگر مہمانوں کے لئے سنتے سے صوفے ضرور
 ہوں۔ رات کو بچے ایک پلنگہ پر چاد چار سوئیں مگر نیا م گھر سے خریدی کئی کھانے

کی میزاد کر سیوں کو جگہ ضرور ملے۔ بچے بھی اب گھروں کی بجائے اسپتال میں پیدا ہونے لگے تھے۔ شاہیوں میں اب ایسے "ایٹ ہوم" ہونے لگے تھے جس میں بڑے امانوں کی ضرورت ذرا کم ہی پڑتی ہے۔ ایک تو چیز کی مانگ پہلے ہی کم ہو اور پھر اس کی کوالٹی بھی خراب ہو جائے تو اس کو کون دھارے گا۔ بریتانیا بھی بقول ایک انگریزی دان پوتے کے اب "نیوسٹنس" ہو گئی تھیں۔ اچھے کھاتے تھے گھروں میں تو قطعی ان کا ٹھکانہ نہ تھا ہاں پرانے دھرانے گھروں میں تو ٹی چار پانی کی گٹر کونے میں پڑی رہتیں مگر چند دن گزرتے تو کسی نہ کسی بہانے سے ان کی بلٹی دوسرے گھر روانہ کر دی جاتی۔ جہاں گھر میں کوئی بیمار ہو یا جہان آئے تو سب سے پہلا کام یہ ہونا کہ بریتانیا کو رکشہ میں بٹھا کر کسی دوسرے نواسے یا پوتے کے ہاں چلا گیا جاتا وہاں دو ایک دن ان کی آؤ بھگت ہوتی پھر بدی اخبار کی طلبہ اور دھراؤ ضرورتی پھرتیں۔ ان کی بھوک اور بڑبڑاہٹیں جب زیادہ پریشان کرتیں تو کوئی بہانہ ڈھونڈ کر انھیں تیسرے گھر بھیج دیا جاتا۔ گھر کی لڑکیاں کسی نہ کسی طرح ان کے ٹرنک کے کپڑے اڑانے کی فکر میں رہتیں۔ ان کی خدمت سے تنگ بچائے کی فحش لوٹ رہی تھی اور پرانے زمانے کی سسی ساٹن اور مشطی میں بند ہو جانے والے دوپٹے اب کہاں ملتے تھے۔ محبت کی بھوک بریتانیا کے جب لڑکیاں کھسی لگتیں تو وہ خوش ہو کر فوراً جوڑے کے جوڑے ان کی نذر کر دیتیں۔

اب بریتانیا پر کچھ خرچ ہوتا اس کا حساب ذہنوں میں محفوظ رکھا جاتا۔ تاکہ موقع موقع پر دوسرے رشتہ داروں کو شایا جاسکے۔ ایک وہ برماں تھیں جن کو ہر گھر میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ اب ٹانگ برابر کی چھوڑیاں کہتی تھیں

کام کی نہ کاج کی سیر بھراناج کی۔ جب دیکھو باد رچی خانے میں کچھ نہ کچھ ٹٹول رہی ہیں۔ بچے بچے کو پتہ تھا کہ یہ بہاری سنگی نانی داوی نہیں ہیں بے اولادی ہیں بے چاری ہم نہ رکھیں گے تو اور کون رکھے گا۔

”اے ہے یہ رات کا قہم ہے پھپھا دے نہیں تو وہ نکل لیں گی۔ ان کے بارے میں ایسی باتیں اب عام ہو گئی تھیں۔ بھوک کی خدّت اور تشکیم کی کمی نے جنوں کو ایک اور را شجائی، شعلتی تھلتی آئیں اور ناک ہوا میں دے کر کھینچ ”اے بے سیدب کی خوشبو آرہی ہے“ بے نا کہاں ہیں مٹی ارے ایک ٹکڑا ہیں بھی دے نا۔ مٹی جسے خود سیدب سو گئے برسوں ہو گئے تھے جل کر کہتی ”سیدب نہ کچھ اور“ پاگل ہو گئی ہو بڑیاں تم تو“ ٹکڑہ اس وقت تک سیدب سیدب کی رٹ لگاتے رکھتیں جب تک انھیں دوسرے کمرے میں امدو دیا کیلے کی خوشبو نہ آجے کسی نے گھر میں جا کر جب انھیں یہ خوشبو آتی تو گھر کا کوئی شریف بچہ یا نصیات کا ادھر بکرا طالب علم انہیں یہ چیزیں لا دیتا کہ شاید اسی طرح ان کا دل بھر جائے مگر ان باتوں کا الٹا اثر ہوتا، پھر تو ان کی ناک راہ ہی دیکھ لیتی، کبھی نورے کی خوشبو چلی آرہی ہے، کبھی متغین، کبھی بریانی، آتنا حوصلہ کوئی کہاں سے لانا دھڑ ہی دیں سے تو تو میں میں شروع ہو جاتی۔ خالی پیٹ کب تک ان مرغین کھانوں کا ذکر اور خوشبو برداشت کرتے۔ کام دام اب دے نہیں کرتی تھیں۔ اول اس لئے کہ ان کو سمجھائی کم دیتا تھا، دوسرے لوگوں کے کہنے کے مطابق بادلوں میں جان ڈال لی تھی ورنہ اسی دیر میں وال کا ولیہ کر دیتیں۔ کچھ دن بعد ان کے جنوں نے ایک اور رنگ پکڑا۔ انھیں یہ خیال ہو گیا کہ لوگ انھیں چھوڑ کر بھاگ

جائیں گے۔ سارا دن گھبراگھبرا کر کہتیں: ارے کہاں جا رہے ہو! مجھے بھی ساتھ لے چلو؟

ہر نئی بات کچھ دن تو مذاق رہتی پھر جی کا جھلا پابن جاتی۔ اچھا بھلا ایک آدمی گھر میں بیٹھا ہے دوسرا اس کے سر ہو رہا ہے کہ بول تو کہاں جا رہا ہے! تو وہ آپ ہی مر کنا بیل بن جاتے گا۔ بوں بوں ان کی آنکھیں کمزور ہو رہی تھیں توں توں یہ وہم بڑھتا جا رہا تھا۔ ذرا گھر میں خاموشی مونی اور وہ برائیں! ارے کہاں چلے گئے سب! مجھے چھوڑ گئے، ہائے میں اکیلی رہ گئی! کیا کریں! کہاں چلے گئے سب؟

”مر گئے۔“ جل کر کوئی کہتا تو وہ کھیل اٹھتیں: ”ہو! ارے میں سمجھی سب چلے گئے۔“

یہ مرض بڑھا تو وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر میاں بیویوں کے پلنگ ٹولنے لگیں۔ سوتے میں چونک کر کوئی چلا اٹھتا کون؟ تو وہ جڑی ہی مصیبت سے کہتیں: ”سور ہے ہو؟ میں سمجھی چلے گئے۔“

ایک دفعہ کسی شخص کو جھک جھک کر چلتے دیکھ کر کوئی بچہ ڈر کر چیخ اٹھا سارے گھر میں چور چور کا شور مچ گیا۔ محلے والے جاگ اٹھے اور آخر میں نکلا کون بڑھا۔ یہ باتیں برداشت سے باہر ہوئی جا رہی تھیں۔ ہر آئے گئے کو سنائی جاتی تھیں تاکہ ان کے سہارے موقع پاتے ہی انہیں کسی اور گھر روانہ کیا جاتے۔ کہاں تو وہ سالوں رہتی تھیں تو لوگ اور رہنے کا مطالبہ کرتے تھے اور اب مینے میں جا کر گھر گھوم لیتیں۔ ریشمی کپڑے بٹ بٹا گئے تھے اور ان کی جگہ بے ہوشے کپڑے پھینچ

کو ختم ہو چکے تھے۔ بستر بھی بوسیدہ اور خراب تھا مگر اب ان کو کھانا ہی دیکھ
 تھا کہ اس سنگائی کے زمانے میں ان کے لئے جوڑے اور گھوڑے بھی جوتے
 گھر میں تقریباً ہوتی تو بڑیاں کو چھپا دیا جاتا یا دوسرے گھر بھیج دیا جاتا
 ہاں نہیں تو بڑیاں پھریں گی سارے گھر میں اصل ڈر اس بات کا تھا کہ کسی
 نے دیکھ کر پوچھ لیا کہ کون ہیں تو کچھ کہتے بن نہ پڑے گی اپنا گھٹنا کھو لو آپ
 ہی لاجوں مرد۔ اب ان کی حالت اس قابل نہ رہی تھی کہ انھیں کسی کے سامنے
 خیرہ پیش کیا جاسکے اور جان بوجہ کر سبکی کرانے کا فائدہ! اخیش اسل گھرانے
 ہاتھ جوڑتے کہ ہمارے ہاں باہر کے لوگوں کا آنا بھانا ہے! انہیں یہاں نہ بھیجو
 البتہ کھانے پینے کا خرچ دینے کو تیار ہیں۔ یہ بھی زبانی جمع خرچ تھا کون مانگتا
 تھا اور کون دیتا تھا۔ جس گھر میں پڑ جاتیں آپ ہی روٹی دے دیتا کھانے کا
 خیرہ لینے کی بدنامی کون سستا۔

دن گزرتے رہے۔ گھر والوں کو پتہ بھی نہ چلتا۔ باہر والا کوئی بہت دن
 بعد دیکھتا تو کہتا بڑیاں بہت کمزور ہو گئی ہیں۔ بڑیوں سے ہاتھ لگ گیا ہے۔
 گھر والے بتاتے کہ کوئی خاص بیماری نہیں ہے بس بوکا ہو گیا ہے اس لئے
 پیٹ سدا خراب رہتا ہے یا پیٹ میں کیڑوں کا بسیرا ہے کہ ہر وقت کھانے کو شہتی
 ہیں۔ آنکھیں بھی اس رفتار سے روشنی کھو رہی تھیں کہ پاس رہنے والوں کو کچھ
 اندازہ نہیں تھا، یا پھر ان کی حرکتوں نے اس قابل ہی نہ رکھا تھا کہ کوئی ان
 کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتا اور گھر کے ہزار روڑے جھگڑے بننے لگے کہ گھر میں
 بڑیاں جوئی بڑی بی کے پیچھے لوگ خوار ہوتے پھرتے۔ اچھے بھلے آدمی کام کرتے

کرتے تھکے جا رہے تھے۔ ایک صبح کے گھر سے نکلے ہوئے کہیں اندھیرے میں گھر ٹوٹنا نصیب ہوتا۔ کراچی کی زندگی تھی کہ سانس لینے کا موقع نہ دیتی تھی۔ مگر دکانیں، سڑکیں، ہر چیز محسوس تھی۔ جگہ اور وقت کی کمی کی بات کوئی کراچی والوں سے پوچھے، گھر کے سیکڑوں ضروری کام برسوں ملتے رہتے۔ کوئی جیسا ہوتا تو یہ سوچ کر جان لگتی کہ کون گھنٹوں جا کر ودا کے لئے قطار میں کھڑا ہو، عطاریں اور نیم حلیوں کی چاندی ہو رہی تھی۔ بیماری کے اسپیشلسٹوں تک رسائی باڈیوں کے درباروں کی رسائی ہو گئی تھی۔ ۱۰ ایسے میں کون انھیں ہسپتال لے جانے کی مہم کا ذمہ لیتا اور لیتا بھی تو کس سے یہ ہفت خواں سر ہوتا۔

دن یوں ہی گزر جاتے اگر بات اور ذہنی، مگر کون چیز دنیا میں ہے جو ایک حالت میں ہے جسے تقریر نہیں۔ ہر آدمی ہر شے بہتر یا بدتر صورت میں بدلتی رہتی ہے۔ بڑیاں کی حالت کی بہتری کی کیا امید تھی بس دن بدن بگڑتی رہی تھی۔ جب تک وہ خود پہل پھر لیتی تھیں۔ ان کی باتوں کو رد و صحر کر بڑاقت کر لیا جاتا تھا مگر جب نوبت یہاں تک پہنچی کہ غسل خانے لے جانا ہو تو ہاتھ پکڑ کر لے جاؤ تو بڑی مشکل پیش آتی۔ وہ چلائی رہیں اور ابھی ذرا تو صبر کر دوں۔ تقریحوں سے بھی گئی گزری ہو گئیں۔ وغیرہ آوازیں ان کے کانوں میں پڑتی رہیں۔ اگر وہ صبر کرتی رہیں تو اس صبر کی کوئی میعاد نہ تھی۔ چنانچہ وہ ٹھول کر اتریں اور جس جگہ کو غسل خانہ سمجھ لیتیں وہیں بیٹھ جاتیں۔ بعد میں بڑی ہائے ہرمنجی۔ کراچی کی بھگتیں ہر وقت ہاتھ نہیں آتیں اور اب تو جب سے گھروں میں فلش عام ہو گئے تھے انھیں گندے کام کرتے ہوئے اٹھیاں آنے لگی تھیں۔ ایسی حالت

میں جب گھر والوں کو ان کی بے جا حرکتیں سمیٹنا پڑتیں تو ان پر کوسے کاٹنے نہیں تو کیا پھول برستے۔ اب وہ یا تو ان باتوں سے بالا ہو چکی تھیں یا سُن کر انجان بننے میں عداوت ہو گئی تھی کہ ذرہ بھر پروا نہ کرتیں بس تکیے سے سرُکائے کرکے اُگے جھکائے، آنکھیں بند کئے، ہونٹ بچوں کی طرح بسورے غنڈہ گی کے چلنے کوئی سے عالم میں کھوئی رہتیں۔ دن رات ان کے لئے برابر ہو چکے تھے جس وقت اس پر ہوشی سے چوٹیں سب سے پہلے کھانا مانگتیں چاہے اس وقت رات کے دو بجے ہوں یا صبح کے چارہ لوگوں نے اب نوٹس لیت چھوڑ دیا تھا کھانا اس وقت دیا جاتا جب کھانے کا وقت ہوتا، بس ان کی موجودگی کا احساس اس وقت ہوتا جب وہ ایسی ایسی حرکت کو بیٹھتیں۔ ان حرکتوں میں اضافہ ہوا تھا جس گھر کے باہر ایک ایسے کمرے میں ڈال دیا گیا جہاں وہ جو بھی چاہے اور جہاں جی چاہے کرتی رہیں۔ دوسری صبح محکم ناک پر کپڑا باندھ کر کمرہ دھو جاتی۔ اس دھلائی اور خراب ہو جانے والے کپڑوں کے پیسے وہ الگ لیتی۔ بڑیاں کے کمرے میں سے مرغیوں کے ڈربے ایسی گھرانہ آتی ان کو کھانا دینے والا بھی سانس روک کر مشکل چند منٹ وہاں ٹھہرتا۔

وقت کسی کے لئے رکتا تو نہیں۔ دن اور راتیں ریس کے گھوڑوں کی طرح بھاگے جاتے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے لڑکیوں کے چہرے پر حیا اور لڑاکاں کے کٹوں پر بال پھوٹ آتے ہیں۔ شادی بیاہ کی باتیں ہونے لگتی ہیں، پھر اُن کے بچے بڑے ہو جاتے ہیں اور وہ بھی اسی تیزی سے بڑھنے لگتے ہیں۔ بڑیاں کے پوتے بھی آلِ اولاد والے ہو گئے تھے ایک پڑپوتے اور ایک پڑنواسی کی شادی ٹھہر گئی

تھی۔ جیسا کہ آج کل کا دستور ہے۔ بڑی محنت سے بڑے گھرانے ٹھونڈے کئے تھے۔ شادی کی تیاریاں بڑے زوروں پر تھیں۔ بڑے گھرانوں سے مکر لینے نے سارے گھر کا پلستقن نکال دیا تھا۔ پھر بھی بات بنتی نظر نہ آتی تھی۔ اچھے ہی ایک دن جب گھر میں لپا بھپ جوڑے لٹکے جا رہے تھے، بڑیاں چپکے سے چل بسیں صبح کو کوئی ناشتہ لے کر گیا تو دیکھا ختم ہو چکی ہیں۔ ان میں تھا ہی کیا ایک سانس چل رہا تھا وہ کسی وقت خاموشی سے یوں بند ہو گیا جیسے کسی نے سویرے آٹ کر دیا ہو۔ فوراً انھیں اٹھا کر گھر میں لایا گیا ہر طرف سناٹا سا دوڑ گیا کسی طرف سے آہ و بکا کی آواز بلند نہیں ہوئی لڑکیوں نے چپکے چپکے دو چار افسوس بھائے بڑیاں کی موت پر نہیں بلکہ ان کے ساتھ اپنی زیادتیاں یا بالائیاں یاد کر کے خاندان والوں کو اطلاع دی گئی بڑیاں کا خاندان بڑے درخت کی طرح پھیل کر کہیں کا کہیں جا پہنچا تھا۔ لوگ آتے جاتے تھے، چپ چاپ بیٹھتے جاتے تھے ان کے سارے آخری کام بڑے سکون سے ہوئے اور وہ ایسی خاموشی سے وداع کر دی گئیں جیسے کسی بیوہ عورت کی رخصتی ہو۔ اس کے بعد کام سارا زیادہ دشوار کن تھا۔ ایک شادی میں چار اور دوسری میں پانچ دی تھے۔ دنیا والے کیا کہیں گے کہ بڑیاں میں بڑی بی کا جسم بھی ٹھنڈا نہ ہوا کہ بیٹھے پونے رنگ رلیاں مند ہے ہیں۔ لاکھ کچھ ہو دیں سے دنیا رکھنی بھاری ہے شادی کی تاریخیں ٹالنی پڑیں گی۔ مگر شادی کی تاریخیں بدن بھی مشکل تھا۔ کہاں کہاں سے لوگ آئے بیٹھے تھے، ایک بھائی بیٹھنے بھانے کو پابدار کا بیٹھا تھا۔ لڑکی کا دو لہا چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ پھر جانے کب چٹی ملے اور لڑکیوں کی شادی میں آج کل دیر دورا مناسبت نہیں، کب دام میں

آیا ہوا پتھی پتھر پھڑا کر نکل جائے۔ ہاں نہیں تو جن گھروں میں شادیاں تھیں وہ ہرگز انہیں ٹالنا نہیں چاہتے تھے صرف کنبہ برادری کا ڈر تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ روز صبح سے شام تک بحث ہوتی مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچا جاتا۔ وقت اتنا کم تھا کہ مزید بحث کی گنجائش بھی نہ رہی، تاریخ بڑھانی ہے تو فوراً بڑھاد کھانے والوں کو بڑھت اطلاق تو دی جا سکے مگر بڑیاں کے ایک مسجددار بیٹے نے آخر اس مشکل کا حل ڈھونڈ لیا۔ دیکھو یہ موقع اچھا ہے، شادی کرنا مگر دھوم دھڑکانہ کرو، کھانے کے بجائے معمولی سی چائے ہو جائے۔ بہانہ بھی کم بلاتے جاتیں کہ بس شرعی رسم کر رہے ہیں۔ بہانہ ہمارے پاس ہے ہی کہ ہمارے ہاں ایک بزدل خاتون کا انتقال ہوا ہے ہم دھوم دھام سے نہیں کر سکتے۔ یاد رکھو یہ موقع پھر کبھی نہ آئے گا۔“

چنانچہ یہی ہوا۔ بڑیاں مرتے مرتے بھی ایک کام کر گئیں۔ جن تقریروں میں ہزاروں خرچ کرنے کے بعد بھی اُلاہنے کا دھڑکا تھا انہیں سیکڑوں پنڈتا گئیں اور کسی طرف سے کوئی اعتراض نہ ہوا۔ سچ ہے نیک آدمیوں کی موت بھی نیک ہوتی ہے۔

”سیپ“ کراچی

سراب

ایرو گرین کلب کے وسیع لان میں کھول شوہر ہلاتا۔

میں نے ہزار بار بڑی منت سے رخصت کو سمجھایا کہ میں گھر وادی میں اتنی الجھ چکی ہوں کہ اس قسم کے ہنگامے اب میرے لئے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے مگر وہ نہ مانے۔ کہنے لگے: ”تمہارے لئے ہی تو میں ٹکٹ خرید کر لایا ہوں ورنہ مجھے پچاس روپے خرچے کی کیا ضرورت تھی؟“

”پچاس روپے! میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ چائے کا نیا سیٹ ہاتھوں سے پھینکتے پھینکتے بچا۔ ارے ارے“ رخصت نے لپک کر بیالی سنبھالی: ”تم تو ذرا ذرا سی بات پر گھبرا جاتی ہو۔“

”آپ کو پچاس روپے نا تھی برباد کرنے کی کیا مصیبت تھی؟“

”بھئی۔ وہ۔۔۔“ رخصت قدرے نادام ہو کر بولے: ”اپنے وسیع صاحب

میں نا۔۔۔ انکھوں نے ہی شوکر دیا ہے سن کابے حد اصرار تھا کہیں تمہیں بھی لیکر آؤں؟“

”اُن کا کیا ہے۔ چندہ جمع کرنے کو تو وہ ساری دنیا کو کھٹا کر لیں گے۔ اُن کی بلا سے بعد میں کوئی ناقص متاثر ہے؟ میں ایک دم جھگڑنے کے موڈ میں آگئی؛ کوئی جھگ بھی ہو جھلا! ایک نہ دو! اکٹھے پورے پچاس روپے — کوئی خدا کا خوف بھی ہونا چاہیے۔“

لیکن رفعت نے گہرا کمرہ پھیر جانے میں ہی عاقبت سمجھی۔ اپنے کمرے کی طرف جانے جاتے شکست خوردہ سی آواز میں بولے: ”نینا کا ڈانس پروگرام ہے؟ ڈانس؟ اور وہ بھی نینا کا! میں نے سنک میں گرم پانی انڈیل کر چلی ہی جلدی برص ہا ہرنکا لے شروع کئے اور پونچھے بیٹھ گئی۔ بار بار سی خیال آتا رہا کہ گڑبستی میں دھنس کر میرے جیسی عورتیں وقت سے کتنی پہلے بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ نہ کہیں گئے کا خیال نہ جانے کا بس پیٹ کاٹنے اور خواہشات کا گھلا گھونٹنے ہی گزرے چلی جاتی ہے، مگر زندگی تو نینا جیسی لڑکیوں کی ہوتی ہے جو کبھی بوڑھی نہیں ہوتیں۔ جیسا ابور گرین کلب ویسی ہی ابور گرین نینا!

چمکتی آنکھیں، دھمکتے گال، لہراتے بال اور تھمکتی ہوئی چال۔ سکول کے دنوں میں بھی وہ ایسے ہی جھللاتی تھی جیسے خلیسم میں نہا کر آئی ہو۔

ہم دونوں ایک ساتھ خلیسم کی منزلیں طے کر کے جڑی موٹی تھیں۔ اُس نے تعلیم مکمل بھی نہیں کی تھی کہ اپنے پیارے ساتھ سوئٹزر لینڈ چلی گئی تھی۔ جس صاحب بڑے مصروف کاروباری آدمی تھے۔ آدھی دنیا میں اُن کے دفتر کی شاخیں پھیلی تھیں۔ بنگلے پرتین تین کاریں کھڑی دیتیں۔ باوردی ڈرائیور ایک اشارے کے منتظر ہوتے۔ اندر ڈرائنگ روم میں ریکارڈ پلیئر پر ہر وقت مضمضروں میں انگریزی

دھینس بجتی رہتیں۔ قیمتی قالینوں پر سفید دوسے کتے لڑھکتے۔ نینا کی مٹی شونہ رنگ کی سارھی پہنے بڑے انتہام سے کافی بنایا کرتیں۔ اُن کے گلے میں پڑے ہوئے نت نئے ڈیزائن کے ڈائمنڈ گرٹ نیگلز آنکھوں کی روشنی لوٹ لیا کرتے۔ ذرا سی چمک ہوتی تو یوں لگتا جیسے تارہ ٹوٹا۔

اکوتی اولاد تو لگینہ ہوتی ہے جسے تراش تراش سے میرا بنا لیا جاتا ہے۔ نینا کی تربیت صبح صاحب نے بڑے دھیان سے کی تھی۔ اُس کے لیے ایک چھوٹا چار چار اُستاد بختے میں مختلف اوقات میں آتے تھے۔ ایک پہلے ڈانس کے لئے۔ ایک توڑے سکھانے کے لئے۔ استاد کے اُستاد جی اور تھے براگ راگنیوں کے اور۔ پڑھنا لکھنا اُس کے لئے بہت ضروری نہیں تھا۔ بس وہ تو کافی محنت کرتی رہتی تھی۔ چال میں اٹکیلیاں خود بخود آگئی تھیں۔ جی بھر کر غلیں دیکھتی۔ کلاس میں خال وقت ہوتا تو کمانیاں اُسٹا کر سب کو لپٹا یا کرتی۔ ہر سال یورپ کا چکر لگا کر واپس آتی تو داستانوں سے بھری ہوتی۔ سکول سے واپسی پر جب کبھی وہ مجھے اپنی بڑی سی کار میں چھوڑنے آتی تو میں تمام راستے احساسِ کمتری کے مارے مرنے لاتی۔

دفعہ سے بیاہ کر کے میں اور بھی گھرے غار میں جاگری۔ گھر کے کاموں کی ایک طویل فہرست اُلجھے دھاگوں کی طرح میرے سامنے رکھی رہتی۔ بار بار میرے دل میں یہ خواہش ابھرتی کہ کاش! دفعہ بھی نینا کے بیاہ کی طرح کاروباری سیٹھ ہوتے۔ بنگلوں اور کاروں کے مالک تو خیر ہوتے ہی۔ مگر اُن کی طرح آدمی وہ جن کو کل کے ممبر ضرور ہوتے۔ میری منی کے لئے پڑھی لکھی آیا ہوتی۔ میرے پاس وقت بے وقت کہیں آنے جانے کے لئے ایک بڑی سی کار ہوتی جسے میں خود ڈرائیو

کرتی۔ بادرچی خانے میں دسی انگریزی کھانا پکانے کے لئے خانہ ماں موجود رہتا۔ اور دلی ہوتا بیڑا ہوتا۔

لیکن — مجھے تو بیک وقت خانہ ماں بھی بننا پڑتا اور آیا بھی۔ اور دلی بن کر رخصت کے کپڑوں پر برش کرنا بھی میرے ذمے، ادا ستری کرنی، جو تے پالش کر کے ایک قطار میں رکھنے، بستر بچانے اور راتوں کو منی کے ساتھ جاگ کر بیٹھنا، کہیں آنے جانے کے لئے ٹیکسی یا رکشا کا کرایہ یا کرایہ کے لئے گھنٹوں مرٹک پر کھڑے ہو کر انتظار کرنا اور جب بس نہ ملتی تو یا بس ہو کر ڈبڈبائی نظروں سے سر جھکاتے میلوں پیدل بھی چلنا۔

کاش میں دنیا ہوتی تو اپنے پیارے کے ساتھ مزے سے کبھی امریکہ جاتی، کبھی یورپ گھومتی، کبھی سویٹزرلینڈ کی حسین وادیوں میں سنہرے خواب دیکھتی۔

رفعت نے بڑی فراخ دلی سب کچھ اس روپے خرچ کر ڈالے تھے۔ بار بار میرے دل میں اُبال اُٹھتا کہ جتن بھی کر آسمان سر پہ اُٹھالوں۔ ابھی جیسے بھر کے ڈھیروں اخراجات کا پہاڑ میرے سامنے کھڑا تھا، منی کے لئے دودھ کے ڈبے منگوانے تھے، بجلی کا بل ادا کرنا تھا، خود رفعت کے کپڑوں کی سلائی کا بل چکانا تھا۔ جتنی تیزی سے منہ گائی بڑھ رہی ہے اس سے دگنی رفتار سے ددزی کی سلائی میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ رفعت کے سبھی پرانے سوٹ پھلنی ہو چکے تھے۔ اس لئے جبوری میں نئے سوٹ سلوانے ضروری تھے۔ آخر اپنا بھرم بھی تو رکھنا ہوتا ہے۔

البتہ میرے جینز کی لائی جوتی سبھی ساڑھیاں ایک ایک کر کے میرے

ساتھ ہی بد رنگ ہو چکی تھیں۔ شادی، رفعت کی آواز سنائی دی، ”بھئی تیار ہو جاؤ
 آ رہی ہوں، رفعت“ میں نے مردہ آواز میں کہا اور ایک ایک کر کے کبھی
 پرانی ساڑھیاں الماری میں سے کھینچ کر ٹانگ پر ڈھیر کر دیں۔ سب کی سب بیچا
 لاشیں دکھائی دے رہی تھیں۔

میں نے جلدی جلدی صند دھو کر ایک آسمانی ساڑھی لپیٹ لی جس کا پینڈ
 چٹنوں میں چھپا لیا۔ پھر آئینے میں جھک کر خود کو ڈھونڈا اور دھک سی رہ گئی۔ میں
 کہاں کھو گئی تھی؟

میرے چہرے پر بن بلا سے دھانوں جیسا ہلکی لکیوں کا ناگوار جال بھل رہا
 تھا۔ رنگت پرانے فرنیچر کی طرح سر دی گرمی کی زیادتیاں سہہ کرناڑ چکی تھیں۔ بالوں
 کی سبھاہی پر دھوئیں کا غبار اچھلا تھا۔ چہرے کے تنیکے نقوش پھیکے پڑ چکے تھے۔
 ”میں نہیں جاؤں گی، نہیں جاؤں گی۔ مجھے وہاں نہیں جانا چاہئے۔“ میرے
 اندر سے نکلا اٹھنے لگی۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر چلانا چاہا
 تو رفعت نے بے اختیار گھسیٹ لیا: ”جلدی چلو“

”نیں کیسی لگ رہی ہوں، رفعت؟“

”بس ٹھیک ہے“

ان کے لہجے میں ایسی جھلک تھی جیسے کہہ رہے ہوں کہ اب تمہارے اچھے
 لگنے کی ایسی ضرورت بھی کیا ہے؟

ہم دونوں گھر سے باہر نکلے تو رفعت نے پڑوس میں جا کر گھر کی کنجیاں خالی
 کے حوالے کرتے ہوئے منی کو ایک ہڈل کی صورت لپیٹ کر ان کے سپرد کر دیا۔

دلوں میں چور تھے ہم چپ چاپ پیدل ہی روانہ ہو گئے۔ ٹکٹوں پر پہلے ہی بہت روپے ضائع ہو چکے تھے اور شو شروع ہونے میں ابھی کافی وقت تھا۔

راستہ طے کر کے جب ہم ایوڈ گرین کلب کے ہرے بھرے لان میں پہنچے تو سارے شہر کی رونق وہاں سمٹ آئی تھی۔ ہر طرف ہنستے مسکراتے چہرے تھے کوئی غمگین نہ تھا۔ میری طرح کسی کی پیشانی پر کم مائیگی کے احساس کی شکستہ تھیں بل کھاتی لڑکیاں تھیں، لمبے بالوں والے بے فکر جوان تھے، انہی پوتی ادھیڑ عمر خواتین تھیں، اور بے جنگم، بے ٹول زندہ دل مرد، احساسِ کسری کا ایک جانا پنچا ناخول میرے گرد اُرنچا اٹھتا گیا، جیسی تو میں نے اُس نرم گرم ماحول کے ایک کونے میں چھپ کر چپ چاپ ساری شام گزار دی۔

پہلے جاسے ہوئی۔ پھر جب ذرا جھٹ پٹا ہوا اور شام گہری ہو چلی تو دل بھلانے والے بڑے فخر سے اپنے ماتحتوں میں پیگ سنبھالے نظر آنے لگے۔ نینا کی مٹی بالکل نینا لگ رہی تھیں بلکہ اُس سے بھی دس برس چھوٹی اور بچا سا میرے ساتھ مل بنا سے، باریک سر سراتی ساڑھی میں تنہا ہوا شاداب جسم مٹکی کرا کھیلے گلاب جیسی، وصلی وصلی رنگت، گتے میں ڈائمنڈ کٹ ٹیکس، کبھی ایک میز پر، کبھی دوسرے پر، کبھی تیسری پر۔ کسی تنہی کی طرح چکیوں میں ساڑھی منہال ہونے سے اُدھر منڈلا رہی تھیں۔

نینا کے پیاسدا کے بل ڈاگ تھے۔ یورپ اور امریکہ کی مسلسل سیاحتوں نے تو انہیں اور بھی باہر والا بنا دیا تھا۔ ڈھیلے پائنتوں کی پٹواری، اسوٹ کا کوٹ، آٹارے قمیص، پھرن واسکٹ پہنے، آستینیں ذرا سی اور کچھ چھائے، بے حد

قیمتی ثانی اور ثانی پہن لگائے پھیلے ہونٹوں میں پائپ دبا سے اور جینی سیٹج کے گرد غراتے پھر رہے تھے۔ کام کرنے والے اُن کے بھاری بوٹوں کے دھماکوں سے چونک کر جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگتے۔ بڑا رعب تھا اُن کا۔

میں اپنی کرسی پر بیٹھی ٹھنکی بازو دھے نینا کی نمی اور پاکوڑے رشک سے کھتی رہی۔ درختوں کے جھنڈ میں دیکھتے ہی دیکھتے لکڑی کی سیٹج تیار ہو چکی تھی سیٹج کے واس میں ذرا گہری خندق کھود کر پام کے پودوں کی صورت سلسلہ دار بجلی کے حقے لگائے گئے تھے بھاری سیاہ پردے گرے تھے۔ ذرا اہل جاتے تو بھرتی میں سے فرش پر کھپے ہوئے نرم روئیں دار تالین کے گرد نینا کے ڈرائیونگ کی آرائش کا سارا سامان نظر آنے لگتا۔ بڑے بڑے سنگ تراشی کے جیسے چمکتے ہوئے گلدان، رنگین قطاروں کی تصویریں، پس منظر کے لیے حبیبی دایوں کے کھینچے ہوئے پردے، غیر ملکی گڑیاں

تقریباً سبھی سامان نینا کی ممی باہر کے ملکوں سے لائی تھیں۔

جب پردہ ذرا زیادہ سرک جاتا تو اندہ کی طرف سے دونا معلوم ہاتھ اُس کی دُشی کھینچ کر درست کر دیتے۔ پھر سیاہ پردہ ایک حبیب سی سیاہ آہنی دیوار بن جاتی۔ جس پر وائیں بائیں دونا بھی رنگ کے پھنکارتے ہوئے اردہوں کی تصویر بنی تھی جو ایک معصوم سی بھولی بھالی ناچنے والی کو گھیرے میں لے آگے بڑھتے جہاں تھے۔

اس تصویر پر نظر پڑتی تو سارے بدن میں کیکی سی دوڑنے لگتی معلوم نہیں

میرے روئیں روئیں میں ایک اُن جانا خوف کیوں میں گیا تھا؟

پھر اچانک ہلکا ہلکا سا سا زبجا شروع ہو گیا۔ تمام تیاں ایک ایک کر کے جل

اٹھیں۔۔۔ لوگ اپنی اپنی جگہ بے تابی سے پردہ اٹھنے کے منتظر ہو کر بیٹھ گئے۔
پل بھر میں نینا تھم تھم کرتی، جادو جگاتی۔ سنبھل گئی۔

وہ چمکتی آنکھوں اور دھمکتے گالوں والی دس برس پہلے کی نینا تھی۔۔۔ تھے پہ
کم کم لگاتے گورے تھوڑے میں گلال اور ہتھیلیوں کی پشت پر خدائی جال سجائے۔
پیروں میں گھونگرند کی چوڑی پٹی باندھے! وہ ایک دلربا انداز میں مسکراتی جھک کر
سلام کیا۔ پھر اس نے بل کھا کر فرش پر ایک پاؤں مارا۔ طلبے پہ تعجب پڑی اور
اُس نے ہاں میں ہتھیلیا لیں۔

چمکے گونے کی بس ایک بھلی سی تھی جو وہ رہ کر کوند نے لگی۔ وہ اپنی باہوں میں
سب کچھ سمیٹتی چلی گئی۔

تھا تھنی تھک تھک۔۔۔ ہاتھوں کے کنول بن رہے تھے، ہونٹوں کی کلیاں
چمک رہی تھیں، پلکوں کے اُدھے تیر رہے تھے، کلائیوں کے گہرے دھک رہے
تھے اور کولہوں پر سے ڈھلک کر پھسلتی ہوئی گئے ہاروں میں گوندھی چوٹی کی ناگیں
لہرا رہی تھیں۔

نرت تھا، نال تھا، نال کے بھنور تھے، اُدھی نچی گت کے ہلکورے تھے، ایک
جادو سا جاگ اُٹھا تھا۔

ایک نہیں دو تین تھیں جوئے۔ نینا سارے شہر کو لوٹ کر لے گئی
پھر جب شو ختم ہوا تو وہ اچانک میرے پیچھے سے آکر میرے گلے میں عجول گئی:
”شادی!“ اُس نے مجھے کھینچ کر کہا: ”تم تو چچائی بھی نہیں جانتیں۔“ اُس نے میرے
کھردرے ہاتھ بے اختیار اپنے نرم نرم ہاتھوں میں ڈبائے۔

میں نے گھبرا کر اپنے ہاتھ کیپٹ لئے۔

اُس نے میرے اڑے اڑے بال کپٹیوں کے پیچھے سنوار کر کہا: ”کتنی بدل گئی ہو۔“

”ہاں، یقیناً۔“ میں نے بے دل سے کہا: ”ون ہی کچھ ایسے آگئے ہیں۔“
”بیمار ہو گیا؟“

”نہیں نہیں۔“ میں نے جھٹ بات بدلنے کو کہا: ”تم سناؤ، کیا ہر تلوہنا ہے؟“
”ہونا کیا ہے؟“ وہ ایک اداسے منہ پھلا کر بولی: ”بس، بور ہوئی ہوں سارا رات۔“
”کہیں باہر جانے کا پروگرام نہیں ہے کیا؟“

”ہے تو سہی۔“

”کب تک؟“

”شادی کے بعد۔“ وہ اترا کر شرمانی۔

”آہ۔“ میں نے ہنس کر کہا: ”کون ہے وہ خوش قسمت؟“

”دکھاؤں؟“

”ہاں — ہاں۔“

اُس نے چٹک کر سیلج پر کھڑے ہوئے ساندوں اور پچیوں کو ہدایات دیتے ہوئے ایور گرین کلب کے گھونگریالے بالوں والے میجر کی طرف اشارہ کیا: ”وہ۔“
احمد ہیں۔“

”گرا، یقیناً۔“ میں نے تعجب سے کہا: ”تمہاری منگنی تو پہلے....“

”ارے چھوڑو، شادی“ اُس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھا: ”وہ بھی کوئی

منگنی تھی!“

”لیکن واحد کی پہنائی ہوئی انگوٹھی تو تم بڑے ارمانوں سے پہنے بھرتی تھیں۔“
 ”انگوٹھی کا کیا ہے؟“ اُس نے کمال بے نیازی سے مسند پڑایا: ”جواب چاہو
 ہیں لو: پھر وہ بڑے رومانٹک انداز میں اُنکلی میں پڑی ہوئی ایک نئی انگوٹھی
 گھماتے ہوئے بولی: ”وہ تو ایک جذباتی دُور تھا، ختم ہو گیا۔“
 ”تم اسے جذباتی دُور کہتی ہو؟ حیرت ہے۔“

”ہاں، شاذی، دیکھو نا،“ اُس نے میرے دونوں شانے اپنے ہاتھوں
 میں تھام کر بڑے وثوق سے سمجھایا، ”تعلیم کا ابتدائی زمانہ ہوتا ہی ایسا ناراض
 کا ہے کہ پہلی مرتبہ جو بھی لڑکا سامنے آتا ہے بس آنکھیں بند کر کے جھٹ سے
 اُس کے متعلق فیصلہ کر لیا جاتا ہے مگر پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسا
 موقع بھی آتا ہے کہ....“
 ”تم خوش ہو؟“

”جے۔۔۔۔۔۔“ اُس نے بڑے سرور میں آنکھیں بند کر کے مجھے بھیجی
 کر گئے لگایا۔ اُس کے رویے روئیں میں ناچنے والیوں کی جھک چکی تھی۔
 ”احمد کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ کلب کا کام تو بس پارٹ ٹائم ہی ہے۔
 ایڈورڈ روڈ پر بہت بڑا ذاتی بنگلہ ہے۔ دو کاریں ہیں۔ ایک کوٹھی کراچی میں
 ہے، ایک کاٹچ سمندر کے کنارے ہے، ایک اسٹ آباد میں گھسے ایک
 مری میں، ایک....“

وہ جنگلوں اور کاروں کے ساتھ ساتھ چاہتوں کا دفتر کھول ہی تھی

اور میرے اشک کا جام لبریز ہوتا چلا جا رہا تھا۔

کاش اگر میں نینا نہ ہوتی تو اس کی بہن ہی ہوتی۔ یہ بتلی جیسی مٹی میری بھی ماں ہوتیں اور یہ بگل ڈاگ جیسے غراتے ہوئے جوڑے کتے کے پاس میرے بھی پاس ہوتے۔

پھر — میں بھی ایک سچے سچائے بنگلے میں رہتی۔ میرے ارد گرد نوکروں اور دیوں کا ہجوم ہوتا۔ مجھے ہل کر کوئی کام نہ کرنا پڑتا۔ بس نرم نرم صوفے میں جنس کر خواب دیکھا کرتی؛ اور پھر جب میں جاگتی تو میرا ایک قدم ایک کاریں ہوتا اور دوسرا قدم — دوسری کاریں — میں بھی کاریں — میں بھی سال میں دو مرتبہ دنیا کے گرد چکر لگا کرتی۔

مجھے اپنی کمروری ہتھیلیوں، اپنی سیلنگھی ساڑھی، اپنے کھسے ہوئے سینڈلوں، خود اپنے آپ پر ترس آنے لگا۔

پھر نینا کی شادی بڑی دھوم سے ہو گئی۔ اُس نے مجھے بھی بڑے اسرار سے بلایا مگر میں نہیں گئی۔ کس صورت سے جاتی؟

میں تو اُس کی شادی کے چرچے ہوتے رہے، مدتوں اُس کی خوبصورت تصویریں اخباروں کی زینت بنی رہیں۔ ایک رنگین مودی بھی تیار کی گئی تھی۔ ہزاروں ہی شاٹ لئے گئے تھے۔ ہر روز میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی شاڈ کے بعد وہ سنی مومن مٹانے کے لئے مانگ کا لگ چلی گئی۔

اُس کا قصور میرے ذہن میں خوشبو کی طرح بساتھا، دن بھر کے کام کا کے بعد جب میں تھک کر سونے کے لئے لیٹی تو نینا ایک پھول کی طرح مجھ پر

آن گرتی۔ میں بار بار سوچتی کہ شادی ہر زندگی کا ایک نازک موڑ ہوتا ہے مگر فیما
کے لئے یہ موڑ تو لاکھوں خوشیوں کا پیغام لے کر آیا ہے۔ چھینا ہانگ کلک سے
آگے نہ جا پان چلی گئی ہوگی۔ آڑو اور خوبانیوں کے شگوفوں سے گھرا ہوا اُس
کا لکڑی کا خوبصورت بنگلہ ہوگا۔ اُس کی صبح حسین ہوگی، دوپہر اُس سے بڑھ کر
شگفتہ ہوگی اور شام رنگین....

وہاں روشنی ہوگی، خوشیاں ہوں گی اور جھٹکے....

میں انہی خیالوں میں ڈوب کر سو جاتی اور صبح کو جب سو کر اٹھتی تو میرا نگہ
بھیگا ہوتا اور آنکھیں بوجھل بنت نئے کاموں اور اخراجات کی طویل فہرست میرا
انتظار کر رہی ہوتی: دودھ کا بل، اخبار کا بل، بجلی کا بل، دھوئی کی دھلائی، نئے
کی دواؤں کا بل، منی کے نئے جوتوں کی فکر، بار درجی خانے کا کام، گھر کی صفائی،
کپڑے دھونا، امرت کرنا، راشن لانا....

میں عہد کر لیتی کہ اپنی منی کا بیاہ سوچ سمجھ کر کسی اونچے سے گھر میں کر دوں
گی جہاں روپے کی ریل پیل میں یہ سب اخراجات بڑے معمولی نظر آئیں۔ دولت
کی گرمی سے تو ہزاروں جھیلے موسم کی طرح پگھلائے جاسکتے ہیں۔
تین چار برس اس کشمکش میں گزر گئے۔

اب تو تنہا بھی ہوشیار ہو چلا تھا۔ میں نے سوچا بیک وقت دو بچوں کو سنبھالنا
ناممکن ہے۔ اب منی کو اسکول میں داخل کر دیا ہی دینا چاہئے۔ کوئی کمان تک
مترتا بھرتا رہے۔ رفعت سے بات کی تو وہ یوں گھبرا گئے جیسے میں نے منی کے
بیاہ کی بات چھیڑ دی۔ اُن کے ماتھے پر پھوٹتے ہوئے پسینے کے قطرے صاف

کہہ رہے تھے کہ اتنی تھوڑی تنخواہ میں منی کی فیس کیسے نکل سکے گی ؟
” مگر تعلیم تو بہت ضروری ہے ، ارفع ! “

ہم دونوں نے بڑی بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر وہ ایک
لبا سانس کھینچ کر کہنے لگے ” بہت ضروری ہے ۔ واقعی بہت ضروری ہے ۔
آج کل کے زمانے میں تو جب تک لڑکیاں لڑکوں کی طرح پڑھ لکھ کر روزی
کمانے کے قابل نہ ہو جائیں حالات سے نپٹنا ناممکن ہے “

بات ادھوری چھوڑ کر میں نے فیصلہ کر لیا کہ منی کو کسی بڑے سے سکول میں
نہ سہی کسی سستے سے پرائیویٹ سکول میں ہی لے جاؤں گی ۔ آج کل قدم قدم
پر نئے سکول کھلے ہیں ۔

منی سکول کا نام سن کر خوشی سے تالیاں بجانے لگی ۔ میں نے دوسرے دن
صبح ہی اُٹھ کر اُس کا منہ دھلایا ۔ نیا فراک پہنا یا اور بالوں میں سُرخ رہن باندھ
دیا ۔ وہ بار بار میرا منہ چومتی تھی ، پیاری پیاری باتیں کرتی تھی ، جھجک جھجک کر
میری طرف دلا رہی تھی ۔

اپنے گھر کی بڑی سڑک پار کر کے جب میں اُسے ایک چھوٹی سی کوٹھی میں
کھلے ہوئے پرائیویٹ کنڈرگارٹن سکول میں پہنچی تو لان میں پی ۔ ٹی ہورہی تھی ۔
بار بار سیٹی بجتی تھی ، بھٹی بھٹی بچیوں کے پرے سفید یونیفارم پہنے ایک حاکم
میں جمع تھے ۔ کبھی ہاتھ پکڑ پکڑ کر گھومتے تھے ، کبھی بیٹھتے تھے ، تھکتے تھے اور
اُٹھتے تھے ۔ بس دینا گروٹڈ میں کلیں بھر رہی تھی ۔ وہی چہرہ ابدن عزت کا سا
انداز ، بڑی بڑی آنکھوں میں اتنی چمک اتنی دمک جیسے کسی کا شدید انتظار ہو

مجھے دیکھ کر وہ دُور ہی سے بھاگی آئی، "شا۔۔۔ ذی! اس نے مجھے
 بائیں پھیلائیں؟" ادھر، "نہیں، اتم؟" میں اُس سے پٹ گئی: "یہاں کیسے؟"
 "دیکھ لو۔"

"شاوی کے بعد بدلی نہیں ذرا بھی۔ کہاں ہوتی ہو؟"
 "مٹی کے پاس"

"اور۔۔۔ احمد؟"

"چھوڑ دیا؟"

"چھوڑ دیا؟"

"ہاں اور کیا؟" وہ اس طرح بولی جیسے بڑی معمولی سی بات ہو۔
 "کیوں؟"

"لڑائی ہو گئی؟"

"تو صلح کر لی ہوتی؟"

"تو بہ! " اُس نے جھج کر منی کو پار کیا پھر بولی: "میرا بھی ایک بیٹا

ہے۔۔۔ جہلو! یہیں کہیں ہو گا۔" اُس نے تلاش میں چاروں طرف نظر

دوڑائیں: "پتا کیسے ہیں؟" میں ابھی تک اُدھیر ہیں میں لگی تھی کسی طرح تشفی

نہ ہو رہی تھی۔ "وہ تو مر بھی گئے؟" نینا لحو بھر کے لئے اسرہ رہی ہو گئی، میں نے

طلاق لی تو اُن کا ہارٹ فیل ہو گیا۔"

"گمرہ" میں ابھی شکایت کے لئے الفاظ ہی تول رہی تھی کہ وہ مجھ

میرے لیے کو پہچان کر بولی: "ہاں! شاوی! ہم نے بڑی خاموشی سے اُن کا

کفن دفن کر دیا۔ اب کہاں سارے شہر کو اکٹھا کرتے۔

”مگر، نیتا، احمد تو...“

”فراڈ تھا وہ تو، پکا فراڈ!“

”فراڈ؟“

”ہاں اور کیا۔ نہ جنگلے، نہ کاریں، نہ کاروبار، نہ بینک، بلیس۔ شادی کے

بعد سیدھا گاؤں لے گیا مجھے۔ وہاں اُس کی بوڑھی بیارماں تھی اور گنوا گنوا رسی

بہنیں۔ تو بڑا“

میرے ذہن میں قسماقی ہوئی تمام روشنیاں ایک ایک کر کے گل ہونے لگیں۔

”بانگ کانگ جانے کا تو محض پراپیگنڈا تھا۔ وہاں کوئی سٹینڈرڈ بھی ہوتا

گاؤں میں؟ دفعہ کر دے کس بات کا ہے۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولی: ”اب تو

شادی بھی جو رہی ہے۔“

”کس کی؟“ میں چونک کر بولی۔ ”تمہاری یا احمد؟“

”چہ۔ احمد کی تو وہ بھی چکی۔ اپنے ہی جیسی لے بھی آیا۔“

”تو تمہاری جو رہی ہے؟“

”ہاں، شادی، اور کس کی؟“

میں دھک سی رہ گئی۔

”جواہرات کی بیوپار ہے؟“ وہ مجھے یقین دلانے کو آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

”یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ کیا لندن، کیا امریکہ، کیا سب پان“

”کیا افریقہ...“

”میرے پاس کوئی ٹریفک نہیں ہے اس لئے میں کچھ نہ کر سکی۔ یہ نوکری
 تو میں نے وقت گزارنے کے لئے کر لی ہے۔ شادی ہوتے ہی ہم افریقہ چلے
 جائیں گے۔ وہاں بہت بڑا بزنس ہے جیسی بھی کمپنی تھیں کہ گھریلو بیکار مٹانے
 سے اچھا تو یہی ہے کہ میں یہاں بچوں کو پانی کی گروا دیا کروں۔“
 ”بہت اچھا کیا، نینا۔“ میں نے بغیر سوچے سمجھے کہا۔

”شادی؟“ وہ مجھ پر جھپک آئی۔ ”ابھی راحیل مجھے لینے آئے گا، مرنے والا
 کی قسم۔ جان دیتا ہے۔ اُسے آرٹ سے بے حد لگاؤ ہے۔ میرے فن کی کچھ قدر
 کرتا ہے جب تک ہم افریقہ نہیں جائیں گے میں ایک ڈاننگ سکول کھول
 لوں گی۔“

پھر وہ ہنس کر بولی: ”منی کو میرے پاس بھیج دینا۔“
 مجھے سکتے سا ہو گیا۔ نہ معلوم کیوں میری پتھرائی آنکھوں کے سامنے
 ایوڈو گرین گلاب کی سیلج پڑنے ہوئے بھاری سیاہ پردوں پر چھنکاتے ہوئے نارنگی
 اثر وہوں میں گھری ہوئی ناچنے والی کی تصویر پھر گئی تھی۔
 ”نہیں نہیں“ میں نے گہرا کر سوچا۔ ”یہ کبھی نہ ہوگا۔“
 پھر میں منی کو اُس کی کلاس میں بٹھا کر واپس چلی آئی۔

میں نے اپنے تصورات کے سبھی دو بچے ایک ایک کر کے بند کر دیے۔ اب میں
 اپنے ذہن پر چھپائے اندھیرے میں سکون کی روشنی تلاش کرنے کے لئے بھٹکنے لگی۔
 اب میں اپنے خالی وقت میں ننھے کو تھپک تھپک کر لوبیاں سُتا تو اندازاً کچھ عرصہ
 میں اُسے صبح کے وقت سکول پہنچانے جاتی اور واپس کو لینے جاتی۔ کسی کسی

”اُس کی فیس جمع کروانے جاتی۔ میری مصروفیات میں اضافہ ہو چکا تھا مگر میں بہت مطمئن تھی۔“

نینا شادی کے بعد بھی کافی عرصے کام کرتی رہی پھر اچانک وہ چھٹی لے کر کہیں چلی گئی۔ غالباً افریقہ کا پروگرام پورا ہو گیا تھا۔

ایک شام منی میرے گھٹنے سے لگی بیٹھی قاعدہ پڑھ رہی تھی اچانک پوچھنے لگی، ”ماں‘ طلاق کسے کہتے ہیں؟“

”طلاق؟“ منی نے منہ سے یہ لفظ سن کر میں کانپ گئی۔ میں نے بے تابی سے اُس کے منہ پر ہاتھ دیا۔

”سب کہتے ہیں: اُس نے میرا ہاتھ اپنے منہ پر سے ہٹا کر کہا۔ سب کہتے ہیں پی پی کو طلاق ہو گئی۔“

”ایسی باتیں نہیں کرتے، منی!“ میں بدحواس ہو کر بولی۔

”سب لوگ یہ کہتے ہیں، ماں‘ وہ اچھا آدمی نہیں تھا۔ پی پی کو بہت مارنا

تھا۔ زخم ڈال دیتا تھا۔“

میں نے باتوں میں ہلا کر منی کو ٹال دیا مگر مجھے تمام رات نیند نہ آئی۔ کوئی بولتے ہوئے صبح ہو گئی۔ دوسرے دن میں نینا نے ملنے سکول پہنچی مگر وہ نوکری چھوڑ کر کہیں جا چکی تھی۔

سال پہ سال گزرتے گئے۔ نینا بہت لشکائے سکول جانے لگا۔ رفعت کی ترقی ہو گئی تو ہم نے اپنا مکان بھی مہنت کر دیا۔ رفعت اب بوڑھے نظر آنے لگے تھے۔ ذمہ داریاں بڑھتی تھیں۔ خود میری کمزوری بھی جی جی رہنے لگی۔ منی

اب بڑی ہو گئی تھی۔ اب وہ میرے بہت سے کام بھاگ بھاگ کر کر دیا کرتی تھی۔ اپنے باپ کے دو مال دھو دیتی، کپڑوں پر ستری کر دیتی، چھوٹی موٹی صفائی کر لیتی جاتے بنالیتی، ہنڈیا بھون دیتی۔ مجھے اب جیسے تھرا آچلا تھا۔ ذہن میں جو خراشیں تھیں وہ مٹ چلی تھیں۔ جو پچائیس جمع تھیں ایک ایک کر کے نکل چکی تھیں۔ سوچنے سمجھنے کے انداز بدل رہے تھے۔ پڑوس بہت بدل چکا تھا کئی پرانے مکان ڈھائے جا چکے تھے۔ اُن کی جگہ نئے مکان بن گئے تھے۔ کچے اور مورا دار مکان، جدید طرز کے خوش نما ہنگ، دو منزلہ عمارتیں، ہیمنٹ کی بیلوں سے سجے پھول دار میلوں سے ڈھکے اونچے اونچے گھر....

سامنے ہی ایک جوڑا ہوا کرتا تھا جس کے کنارے پڑی ہوئی تھیں بھری فلاطت میں مرغیاں دان چنگتی پھرتی تھیں۔ دونوں کی محنت سے یہاں ایک دو منزلہ کوٹھی نما مکان بن گیا۔ کوئی تھکیا اور صاحب تھے جو بھری اور چوڑے کی سپلائی کا کام کرتے تھے۔ اپنے نئے گھر میں اُترے تو چاروں طرف پہلے شیرینی بانٹی اور پھر میلا و شریف کے رتھے بھیجے۔ پڑھنے والی کا خاص اہتمام تھا سنا تھا کہ آواز میں تھکا کا سوز ہے۔ نعت کیا پڑھتی ہے۔ دل نکل لیتی ہے۔

مجھے میلا و شریف کی محفل سے زیادہ پڑھنے والی کا اشتیاق گھسیٹ کر لے گیا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ تھکی تھکی سی فضا تھی۔ تھکیا داروں کے گھوٹکی اینٹوں کے صحن میں دیگیں چڑھ چکی تھیں۔ برآمدے پر نیلے استر کی بجاری چھیں گئی تھیں۔ ہال کمرے میں چاندنیوں کا ترش تھا۔ کارنس کے پاس ہی مسند بھی تھی جس پر بچھنے دار گاؤں گئے رکھے تھے۔ قریب ہی ایک تپائی پر سیپا رہے جمع تھے۔

مغلے کی بیبیاں ایک ایک کر کے انہیں سپارہ اٹھا کر بڑی عقیدت سے
چوم کر آنکھوں سے لگاتیں اور چاندنی پر بیٹھ کر تلاوت میں مصروف ہو جاتیں تاکہ
جتنے میں مغلانی بی کی آمد ہو ایک کلاہ پاک ہی ختم ہو جائے۔

کمرے میں بتیاں جلی تھیں۔ روشنی کی جگہ گمر ہو رہی تھی۔ دروازے پر
مچھول دار پر دے گئے تھے۔ باہر بہت سے بچے کھیل رہے تھے بھیکدار کی بہو
بار بار انھیں دور ہٹاتی۔ پھر کوٹے کناری کا آنچل سنبھال سپارہ اٹھا لیتی۔
”اگئیں، اگئیں! مغلانی بی اگئیں۔“ بچوں نے شور مچایا۔

معدنیں سپارہ سے پھوٹہ مچا گئیں۔ درچار گلاب موتے کے ہارے آگے
بڑھیں۔ ایک نے لپک کر پردہ اٹھایا دوسری نے انھیں مسد پر بٹھایا نگلے میں
مار ڈالے، کلائیوں میں گجرت باندھے۔ الائجی مصری کی تھالی آگے بڑھائی۔ مغلانی
بی نے دو دانے منہ میں ڈالے بھیکدار کی بہو نے اٹھ کر اگر بتیاں سلگائیں گلاب
پاشن ہلا کر ساری محفل کو معطر کر دیا۔

مغلانی بی کا رنگ زرد تھا، کچھڑی بال تھے۔ بیمار نظر آرہی تھیں بلبل کے
کرتے پہیل بنی تھی۔ گردن میں تعویذ کا کالا ڈورا جھانگ رہا تھا۔ سسر ڈھکا ہوا
بلبل ہی کا مسلا دوسلا دوسلا تھا۔ نگلے میں موٹے موٹے منکوں کی مالا تھی۔ ہاتھ
میں سبز امام کی قبیح باندھے آنکھوں نے بڑی عقیدت سے میلا و نامہ آنکھوں سے
لگایا۔ پھر حلق کی کھوہ میں سے نازک سی آواز لہر لہر نکالی:۔

وہ درویش ڈوبی درود پڑھ رہی تھیں۔ سب ہی پڑھ رہے تھے مگر مجھے اپنے خیالوں میں خبری نہ ہوئی کہ کب میلاد شروع ہوا، کب ختم ہوا۔ احساس نہ تھا تو بس اتنا کہ سوز میں ڈوبی ہوئی ایک آواز، جھل جھل کرتی، مصل پر چھائی جا رہی ہے۔

دعا کا وقت آیا تو ساری مصل نے ہاتھ اٹھائے۔ منلا بنی کی جھکیاں بندھی تھیں۔ سسک سسک کر رگ رگ کر، کانپتے ہوئے ہونٹوں پر فترے و جمل رہے تھے۔ بے روزگاروں کیلئے روزگار کی دعا، ناواروں، بے سہاروں کے سہارے کی دعا، لاوارثوں اور یتیموں کی دستگیری کی دعا، مریضوں کی شفا کے لئے دعا نہ معلوم کتنی دعائیں انھیں اذہن تھیں۔ جب قرض داروں کی نجات کا ذکر آیا تو وہ بے قابو ہو گئیں، جھکیاں ڈوبی، دہی جھنوں میں بدل گئیں۔ روتے روتے منلا بنی بنی مذہب حال ہو گئیں۔ انھوں نے دعا کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور وہیں مسند پر بے جان سی گر گئیں۔

”مینا! میں نے اُسے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے ٹھنڈے پانی کا کٹکاس اُس کے ہونٹوں سے لگایا۔ شا — ذی!“ اُس نے پڑھ رہا ہو کر کہا۔ اور تپ تپ اُس کے آنسو گالوں پر گرنے لگے۔

”یہ کیا حالت بنائی ہے؟“

”رضائے الہی!“ اُس نے آنسوؤں کے نچھ کر خاص مغلانیوں کے انداز میں کہا۔

”تمہاری تو شادی ہو گئی تھی؟“

اُس نے دم کی جھلکی نظروں سے میری طرف دیکھا اور خاموش ہو گئی۔

”تم تو ڈانسنگ ماسکول...“

وہ ایک کرب میں تڑپ کر رہ گئی۔ جیسے اس کو تیر سا چھو گیا۔ میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبایا: ”کہاں رہی اتنے دن؟“ ”ہاں، شادی“ وہ بڑے دکھ میں بولی: ”میری شادی ہو تو گئی تھی۔ مگر راجیل اچھا آدمی نہیں تھا۔“

”اب کے پھر؟“

”اب کیا کہوں۔ وہ خود تو طلاق تھا مگر شادی اُس نے کاروبار کے خیال سے کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اُس کے لئے سہیزمیں خزانے لے کر آئی۔ میرے ساتھ تو صرف میرا بھلو تھا۔“

”خزانے؟“

”ہاں، شادی! اُس کا منصوبہ یہ تھا کہ جب میں ڈھیروں روپیہ لاؤں گی تو وہ سیاحت کے لئے باہر جائے گا مگر جب میں خالی ہاتھ وہاں پہنچی تو وہ مجھ پر ظلم کرنے لگا۔ بڑی بے دروی سے مارا کرتا تھا۔ مہاجر میں نے طلاق لے لی۔“

”خدا ساڑک کر وہ بولی: ”پاپا مرے تو لاکھوں بلکہ کروڑوں کا فرض چھوڑ گئے۔“

”بچے کی قرتی بھی ہو گئی۔ ادائیگی پھر بھی نہ ہو سکی۔“ وہ جیسے سوتے میں بول رہی تھی: ”اب تو مٹی بیچا رہی کو فروت ہوئے بھی عرصہ ہو گیا۔“

”اوہ نینا!“

اُس نے اپنے پلو سے آنسو پونچھے۔ صحتی کھنکھار کر صاف کیا، ہونٹ کھٹ کر بڑی حسرت سے بولی: ”بہت خوش نصیب تھے پاپا اور مٹی۔ اپنی زندگی تو بہت اچھی گزار گئے۔ آرام سے مر بھی گئے۔“

وہ بار بار آنسو روک رہی تھی، پھر بھی اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ آواز
حلق میں گھٹ رہی تھی۔

”حوصلہ رکھو، اینا، حوصلہ!“

”میرے پاس حوصلے کے علاوہ اور ہے بھی کیا۔ جی بھی تو میری شادی ہو
رہی ہے۔“
”شادی!“

”ہاں“ اُس نے جبری بے نیازی سے سر ہلایا۔ حاجی رمضان علی نے
مجھے اپنے عزیزوں سے بڑھ کر پناہ دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بے سہارا خودت کا
اس دنیا میں کوئی ٹھکانا نہیں ہے، اور یہ ہے بھی ٹھیک۔ میرے پاس تو سر
چھپانے کی جگہ بھی نہ تھی۔ کسی نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ کہاں ہو؟“

منی جوان ہو گئی ہے۔ اُس کے بہت سے پیام آرہے ہیں۔ دفعت روزانہ
بحث کرتے ہیں کہ منی کا بیابان بہت اونچے گھر میں کریں گے جہاں دولت کی
ریل پیل ہوگی، معیار زندگی بہت بلند ہوگا۔۔۔۔

میں اپنی منی کا بیابان اپنے ہی جیسے گھر میں کروں گی، میں نے وہیں بیٹھے
بیٹھے فیصلہ کر لیا۔

”اُن کی پہلی تین بیویاں ہیں،“ مینا بڑی رازداری میں مجھے پرچھکائی۔ دس
بارہ بچے بھی ہیں۔ سب بہت خوش ہیں مل جل کر گزارہ کر لیں گے۔ نکاح ہوتے
ہی ہم حج کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ خدا بڑا کھلم کھلا ساز ہے، شادی اُس نے
میرا ہاتھ بڑے پیار سے دیا۔

رفت سے روزانہ بحث کرنے کے بعد ہم نے منی کی سنگتی کر دی۔ آفتاب بالکل رفت کی طرح ایک دفتر میں ملازم ہے چھوٹی سی خواہ ہے اور اخراجات کی ایک طویل فہرست۔ منی دن بھر کام کرے گی۔ پیٹ کاٹ کر اور اپنی معصوم خواہشات کا گلا گھونٹ کر گزارہ کرے گی۔ برتن مانجھ مانجھ کر اُس کی پھیلا کھوری ہو جائیں گی۔ اُس کے چہرے کی رفتی چیز ہی دنوں میں ختم ہو جائے گی۔ میری طرح وہ بھی جنگوں اور کاروں کے خواب دیکھ کر سو جایا کرے گی اور صبح کو جب اُٹھے گی تو اُس کا تکیہ بھیگا بھیگا ہوگا۔ مگر میں خوش ہوں... بہت خوش...

کل میں اُس کے بھینز کے لئے سارے محیاں خریدنے گئی تھی۔ بازار سے واپس آ رہی تھی تو کالے شاہ کے مزار کے گرد لوگوں کا دس قدمہجوم تھا کہ راستہ چننا دشوار تھا۔ لشکر تقسیم ہو رہا تھا شاید۔ جیسی تو بھلک سنگوں اور فقروں نے اُدھم مچا رکھا تھا۔

اسی جنگاے میں مجھے عینا نظر آگئی۔ اُس کے ساتھ میٹے پرانے کپڑے پہنے تین چھوٹے چھوٹے پتے تھے۔ جو راہ گیروں کو سلام کرتے، اُن کے پیچھے ہاتھ پھیلا کر بھاگتے، اور پھر ہانپ کر واپس آ جاتے۔ لوگ گزرتے گزرتے کچھ پھینک جاتے تو وہ دنوں ہاتھوں سے بڑا کر چھین چھپٹ کرتے، اُن کی جھولی میں ڈال دیتے۔

وہ فٹ پاتھ پر پوسیدہ سا برقعہ لپیٹے بیٹھی تھی۔ ایک سوکھا ہوا زرد ہاتھ مانجھنے کے انداز میں پھیل ہو ا تھا۔

میں نے قریب جا کر آہستہ سے پکارا: "نینا!"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"نینا!" میں نے دوبارہ کہا۔

اُسے کوئی جنبش نہ ہوئی۔

"نینا، نینا" میں نے اُسے جھنجھوڑ ڈالا، اُس کا بخار میں جلتا ہوا ہاتھ اپنی

مہتیلیوں میں دبایا مگر وہ ساکت بیٹھی رہی جیسے موجود ہی نہ ہو۔

"سویرا" لاہور۔

رسل جو

میر شام مال روڈ کے ایک بک اسٹال سے کتابیں خرید کر میں بچوں پر بیچتا تھا۔
 نوکتابوں کا سات میر کاپیکٹ ایک دم سات من کا ہو گیا۔ اس وقت مال پر کھڑے
 ہوئے خوش پوش لوگوں کے بڑے سونوں پرنگا دے چکی تھی اور مجھے احساس ہوا
 تھا کہ میں خود بھی ایک اوسط درجے کے سوٹ میں ملبوس ہوں اس لئے اپنے
 اور دوسروں کے سوٹوں کی لالچ اسی بات میں تھی کہ میکٹ کسی مزدور کو تھا دیا
 جاتے۔ اور گردن گاہ دوڑائی مگر کوئی مزدور نہ تھا شخص نظر نہ آیا۔ آخر خود ہی پینٹ
 اٹھا کر دائیں بائیں دیکھتا کسی قدر جھپٹتا ہوا چل پڑا چند قدم کے فاصلے پر
 پیچھے سے ایک مسکین سی آواز آئی ”ہم اٹھالے بولو صاب؟“

میں نے مڑ کر دیکھا: بولو صاب! کہہ کے تنہی نکالنے والا یہ ایک افسانہ
 مزدور تھا جو شاید ابھی ابھی زمین کی تاریک تنوں سے نہیں بھڑٹا تھا۔ کینا
 کے دھول میں آئے ہوئے فلاکت زدہ چہرے پر جو ہمیں سی مسکراہٹ کھیل رہی

مختی اس میں سادگی اور معصومیت کا ایسا امتزاج تھا جو کسی فرمولہ دیکھ کے بشرے پر زندگی کی سہا سہی پہلی بار دیکھنے پر ابھر آتا ہے۔

وہ سامنے شہر جانے والی جو لوکل بس کھڑی ہے تا بس وہاں تک لے جیلا روریہ لوٹیں نے دس پیسے کا ایک سکہ نکال کر اس کی مختی میں تمغا دیا۔ مزدور کا پسینہ نکلنے سے پہلے اس کی مزدوری چکا کر میں نے بہ زعم خود مزدور میں خود اعتمادی اور اعتبار کا لازوال جذبہ تخلیق کر دیا تھا۔

اُس کا کیا جبروت تھا بوجہ اب اس نے بوسیدہ واسکٹ کی اندر جیب میں دس پیسے رکھتے ہوئے اس معمولی فاصلے اور برائے نام بوجہ کا خیال کر کے شاید یہ بات کہی تھی لیکن مجھے اس میں اس کی نجابت اور شرافت کی ملک آئی۔ اس نے مسافروں کی بھیڑ کو چیرتے ہوئے بس کے اندر جا کر ایک سیٹ پر سیکٹ جما دیا۔ میں اُسی سیٹ پر بڑے اطمینان سے براجمان ہو گیا اور بس ڈولتی ناؤ کی طرح ہچکولے کھاتی شہر کی طرف بڑھنے لگی۔

میں نے دیکھا، بس میں میرے قریب ہی کھڑا، مسکرا رہا تھا، مجھے حیرت تو ہوئی لیکن میں نے اپنے ساتھ والے آدمی کو کسی تندر و تھکیل کر اس کے لئے جگہ بنا نا چاہی، مگر وہ جبے اطمینان کے ساتھ زمین پر بیٹھ گیا۔

”حم اترے نہیں؟“ میں نے اُس کی سادہ مگر پراسرار سی مسکراہٹ کا

پس منظر بھانپنے کے لئے اُس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

دھول کی تلوں کے نیچے اُس کے پڑھوڑے رخساروں کے کٹوں میں زندگی

جنبش ہوئی اور اس کی شریانوں میں خون کی گردش نے لمحہ بھر کے لئے تمام سی

سرخ چمک دھڑادی "بس جی ہم بھی شہر جائیں گا" اُس نے پھر بتیسی نکال دی۔
 "کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے اُس کی فات میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔
 "رسل جُو" ایک بے مقصد سی احمقانہ مہنسی کے درمیان اُس نے جواب دیا۔
 بس کنڈیکٹر ایک کونے میں کھڑا کھٹ کے لئے ہانک لگا رہا تھا۔ وہ قریب
 سے گزرا تو چپکے سے میں نے شہر کے دو ٹکٹ لے لئے۔ اس خیل سے کہ جب
 رسل جُو کو معلوم ہو گا تو وہ حیران ہو گا لیکن وہ حیران نہیں ہوا بلکہ اس انگشت
 پر عجیب مہنویت اور احسانِ ہندی کے جذبات سے لبریز آنکھوں سے میری
 جانب دیکھنے لگا۔ جیسے میں نے اس کا سان پیسے کا ٹکٹ خرید کر اس پر بہت
 بڑے احسان کا بوجھ لا دیا ہو۔ اس بوجھ سے اس کی کمر تو نہیں مگر اُس کا دل
 کسی قدر ضرور چمک گیا۔

میں راجہ بازار میں بس سے اتر پڑا۔ یہ اس لوکل بس کا آخری اسٹاپ تھا
 میں کتابوں کا ہنڈل بغل میں داب گرفت پاتھ پر چلنے لگا۔ چند قدم چلنے کے بعد
 معامیں نے محسوس کیا کہ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔ ایک موجدوم سے تجسس آیز
 خوف نے میرے لاشعور کے پردوں پر سرسرانا شروع کر دیا۔ بس پر چڑھتے اور
 اُترتے وقت جیب کترے جو ہاتھوں کی صفائی دکھاتے ہیں، اُن کے تذکرے
 اُس چمکا تھا۔ پھر چور اچکوں کو مسافروں کی جیبوں کو دُور سے جانچ کر اُن کا
 تعاقب کرنے میں بھی کمال حاصل ہے۔ میں خشکا اور میرا ایک ہاتھ خود بخود
 کوٹ کی اندرونی جیب میں بٹے کو ٹٹلنے کے لئے سرک گیا۔ پھر اٹلیان کی
 ایک ہلکی روشنی لہرنے معامیرے چہرے کے نقوش کا احاطہ کر لیا۔ اس

اطمینان بخش لہر کے دوران میں سمجھا کرنے والے اس سائے کو دیکھنے کے لئے مڑا ہی تھا کہ وہ اُچک کر اچانک میرے سامنے آگیا اور میلے میلے پیلے وائٹ نکالنے جوئے میرے ہاتھ سے کتابوں کا بندل چھیننے لگا۔ مجھے اس کے روپے پر کسی قدر شک گزرا اور جھنجھلاہٹ بھی ہوئی۔ چھوڑ دو بھی۔ کیا تم مسافروں کا سامان زبردستی اٹھاتے ہو؟

رُسل جو میرے سوالوں کا جواب دیتے بغیر کتابوں کا بندل اپنے پوڑے شانوں پر جا چکا تھا۔ تم کس طریقہ پر جاتیں گا بو صاب؟ مجھے اُس کے لہجے میں غمزہ انگسار کی گھلاوٹ محسوس ہوئی۔

”میں تو جامع مسجد کی طرف جاؤں گا۔ لیکن بندۂ خدا تم کس سمت کا ارادہ رکھتے ہو؟“

”ہم بھی جمہوریت کی طرف جاتی ہو یو بی“

سوچا عجیب جنگلی اور دیوانے مزدور سے پالا پڑا ہے۔ ایسے دیوانے سے جو اپنے مطلب کے لئے تو ہوشیار ہے۔ اس نے سوچا ہے کہ چلو اپنے گھر کی طرف جاتے جاتے ساتھ شریعے اور اس شخص سے ہتھیاناؤ۔ لیکن مجھے بھی پتی مگرہ کا پکا بنا پڑے گا۔ میں بھی اس زبردستی کے مزدور کو ایک اٹھنی سنبیلو ایک جیسہ بھی نہیں دوں گا۔

یوں تو یہ پکیٹ شہر سے جامع مسجد میں خود ہی اٹھا کر لے جاسکتا تھا کیونکہ یہاں مال روڈ کی طرح کسی ایسے خوش پوش نوجوان کے ملنے کی توقع نہ تھی جو یک وقت میرے سامان اور ثانی پر استہزائیہ نگاہیں ڈال سکے

لیکن رسل مجھ ایسے لوگوں کی پیٹ کی آگ کے لئے ایندھن دیا کرنا بھی تو ہم ایسے سفید پوش انسانوں کا فرض ہے۔

”پیٹ کی آگ کے لئے دن بھر کام کر کے کتنا ایندھن اکٹھا کر لیتے ہو؟“ میں نے قدمے مزاحیہ انداز میں اُس سے پوچھا۔

میرا خیال تھا کہ وہ میرا مطلب سمجھ جائے گا، مگر اُس نے اپنی مخصوص عاجزانہ مسکراہٹ کے ساتھ میری سمت دیکھا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا: ”ہم اُدھر صبح سے شام تک دھیان ڈاڑھی پر کوم کرتی ٹھیکیدار اچھا آدمی نہیں ہوتی۔ جبین میں دو چار دھبیاڑی کھانکھا کاٹ لیتی۔۔۔“ اس کا جی ٹھیکیدار کو موٹی سی گالی دینے کو چاہا اور گالی کا ایک حرف اُس کی زبان پر اُکرا نکلا گیا۔

”کہاں کے رہنے والے ہو؟“ میں اس کی دلچسپ شخصیت کی تمہوں میں اُترنے کی کوشش کرنے لگا۔

”کثیر کا بوبو صاحب؟“ وہ تشکر آمیز نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا: ”سو پور میں ہمارا جدی پشتی مکان ہوتی۔ ہم بال بچہ کے ساتھ اب اُدھر پنجاب میں سر چھپاتی۔ اُدھر کا پھوجی لوکھ لڑائی میں ہمارا کھیت اور گھر بار جلا دیں۔ گریب کے لئے بوبو بی بی اس جبین پر کوئی جگہ نہیں ہوتی؟“ اُس کے افلاس زدہ چہرہ پر مسکراہٹ کی جگہ یکایک نفرت ابھرا آئی۔ نہ جانے یہ نفرت ظلم کے خلاف تھی یا اُس کی اپنی ذات کے خلاف۔ چلتے چلتے یکایک وہ رُک گیا۔ کچھ سوچتا ہوا سا۔ مجھے اس دقت در یک

اچھا خاصا فلسفی لگ رہا تھا جس نے گریزِ حالات کے تحت بامحض زندگی کے تلخ حقائق اور خیالات کی ریل پیل سے آگٹا کر محنت مزدوری میں پناہ لی ہو۔
 ”محنت مزدوری کر کے کتنا کچھ روز کما لیتے ہو تم؟“ میں نے ہمدردانہ لہجے میں اُس سے پوچھا۔

”دو ڈھ دو روپیہ بی“ کبھی کبھی بارش ہوتی یا موسمِ خراب ہوتی تو مچھری نہیں ملتی۔ اس روز گھر میں چولہا نہیں جلتی جس پرانا دازمہ اور ستوپر گزارتی ہم لوکھ۔“

”صل جو بڑے خلوص کے ساتھ اپنے گھریلو حالات بتا رہا تھا اُنٹ لٹا کر ہمارے حیرت سے پنجاب میں آئے تنگ کی داستان اُس نے چند ہی جملوں میں مجھے سُنا ڈالی۔ میرے دل پر اس کی سادہ اور معصوم باتوں کا اتنا اثر ہوا کہ میں دودھ تک انہی تصورات و احساسات میں غلطاں چلتا رہا۔“

جامع مسجد کے قریب باہمی راجہ بازار کے بڑے چوک میں مجھے ایک پرانا شاعر دوست مل گیا۔ جس نے اپنی نئی غزل سُنانے کے لئے مجھے زبردستی روک لیا غزل اُس کے قول کے مطابق نئی تھی مگر اس میں وہی عشق و محبت اور وصل و فراق کی گھسی پٹی داستانیں و ہرائی گئی تھیں۔ میں نے جلدی جلدی گلو خلاصی کے لئے اس کی دوسری نئی غزلیں سننے کے لئے طوقا و کربا دوسرے دن کا وعدہ کر لیا۔ ذرا آگے بڑھ کر اچانک مجھے رسل جو کا خیال آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ دوست تو مجھے نظر آ رہا تھا لیکن مزدور غائب تھا۔

اس احساس کے ساتھ ہی کہ اس ہنڈل میں لاتبریری کی چھ سات

سودہ پے کی کتابیں تھیں، میرے اُداسان خطا ہو گئے۔ میں نے بدحواس سا ہو کر پیچھے کی طرف تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ دُور تک راجہ بازار کی پُردہ نق شہراہ پر چھوٹا کاروباری انسانوں اور خریداروں کا ایک سیلاب عظیم تھا۔ جس میں مجھے کہیں رُسل مجھ کو کتابوں کے بندل میں چھپا ہوا سرِ نظر نہ آیا۔ آخر وہ ہی ہو کر ہمارا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ شام کا رنگنا ہوا سرد اندھیرا ایک دم اُماندس کی حبیب رات میں بدل گیا۔ اُس کی برف آلود گھرائیوں میں اپنے آپ کو ڈوبتا ہوا اُردو ہوا محسوس کرنے لگا۔ دل ہی دل میں ہر کس و نا کس پر اعتبار کر لینے کی عادت پر افسوس بھی اُبھرا۔ رسل جو خود تو غائب ہو چکا تھا لیکن اس کا سادہ بے یار اور محسوم سا چہرہ ابھی تک میری آنکھوں تلے گھوم رہا تھا۔ سچ ہے لوگوں کے ظاہر اور باطن میں زمین اور آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ میں اپنی انسان دوستی کی کرناک شکست کے متعلق سوچتا ہوا، انتہائی گہیدہ خاطر کی کے عالم میں گھر کی طرف چل دیا۔

میں اب قلمی کتابوں کے زیاں پر دل ہی دل میں چیخ و تاب کھاتا مشا مشی نظروں سے وائیں باتیں دیکھتا و جوان مارا گئے بڑھنے لگا۔ اب اُسے کہاں ڈھونڈوں؟ کہاں جادوں؟ کیا تھا نے میں برپا گھبراہٹوں؟ پھر خیال آیا کہ جہاں اپنے دوست سے مصافحہ کر کے چند لمحوں کے لئے کھڑا ہوا تھا اور اس نے تازہ غزل سننا شروع کر دی تھی۔ شاید وہیں کہیں کسی قطرے کی ادب میں رہ چور و بکا بیٹھا ہو بھاگا بھاگا اُدھر گیا۔

زندگی اسی طرح رواں دواں تھی۔ کسی کے سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر۔

شام کے گھجے اندھیرے میں ریختے ہوئے کاروباری لوگوں کے دھیسے دھیسے شور پر یکھیوں کی جھنجھٹا ہٹ کا گنگان بھٹکا تھا۔ دکانیں بجلی کے تقصیر سے بے وقعتہ نور بنی تھیں لیکن میرادل نا امیدی اور احساسِ زیاں سے گھبراندہ سیاروں میں ڈوب رہا تھا۔ وہ رہ کر رسل جو کا معصوم اور بھولا سا چہرہ نظروں تلے ہمیری بد نصیبی کی علامت بن کر گھوم رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ہی تو میرے اعتماد کو کسی کی پراسرار شخصیت سے ٹھیس پہنچی تھی اور میں پہلی بار نظریاتی شکست کی ایسا تلخ کیفیت سے دوچار ہوا تھا جو کسی لحاظ سے بھی زہرِ عجبے جام کی تلخی سے کم نہ تھی۔

رسل جو کہیں نظر نہ آتو میں مایوسیوں اور افسردگیوں کے اندھیالوں میں محصور سا ہو کر گھر کے راستے پر چڑیا۔ پھر گھر کے نزدیک پہنچ گیا۔ سامنے بجلی کی روشنیوں میں جامع مسجد کے سپید معنوی گنبد اندر منقش دُند و دیوار نظر آ رہے تھے۔ مسجد کا بلند و شن مینار وحدت الوجود کا اظہار کر رہا تھا اور دُند و دیوار کی بٹائی کا اعلان کر رہا تھا۔

”اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے۔“

لیکن — میں نے سوچا۔ انسان بہت چھوٹا ہے۔ انسان بہت نیچا ہے۔ وہ اپنے گھر میں آسودگی کا چراغ روشن کرنے کے لئے دوسروں کے دینے بکھا دیتا ہے۔ وہ تو اللہ ہی کا نائب اور اس کا وجود معنوی ہے۔ پھر اس نے اپنی بڑائی اور عظمت کو کیوں دنیا کے ہزاروں میں غلام پر اٹھا دیا ہے؟ میں چند لوگوں کے لئے پلٹ کر کھڑا ہو گیا اور بازار کی طرف باوجود عرصے گئے

معا جیسے محسوس ہوا جیسے بازار کے اس شور و ہنگامے میں کوئی مجھے پکارتا ہے۔
 آواز مانوس سی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو فریڈ مسرت سے میری باجیس کیل گئیں۔
 ”بو بولی! تم عجیب آدمی ہوتی۔ ہم ادھر سارا سڑک پر تم کو دیکھتے پر تم نظر نہ آتی
 — تمہارا ٹھکانہ معلوم ہوتی بو بولی تو سامان ہم گھر پہنچا دیتی۔“

میں چند لمحوں تک حیران کھڑا اسے سر سے پاؤں تک دیکھتا ہا پھر میری
 رسل جو کو خوشی سے سینے کے ساتھ چٹالیے کو چاہا۔ میں نے اس سے بو نہی
 تجسس کی خاطر بو چھپا ”تم یہاں مسجد میں کیا کر رہے تھے۔ کیا نہ اپڑھنے چلے
 گئے تھے؟“

”ناہیں بو بوجاب! ہم نماز پڑھنے نہیں جاتی۔“ اس نے حسب عادت
 پھر شیشی نکال دی۔ ہم تو ادھر سے محسوس پر بیٹھا تھا بار انتظار کرتی۔ تم نے بولنا
 بو بوجہ تم جیسے مسیت کے پاس رہتی۔“

میں رسل جو کو ساتھ لے کر مسجد کے سامنے والی گلی میں مڑ گیا۔ دروازے پر
 دنگ دیتے ہوئے میں نے سوچا کہ کل جب میں اپنے دوست شاعر سے ملوں گا
 تو صورت اور لحاظ کو بلائے طاق رکھ کر اسے کہوں گا کہ وہ زندگی کے بارے میں
 کھٹا کرے۔ اس کی لفظ فتور، اس کی کثافتوں اور اس کی صداقتوں کے بارے
 میں۔ اپنی بے لکی شاعری اور بے وقت کی راگنی کو چھوڑ کر اس کو ہستانی مزدور کے
 مستقل کوئی عہدہ آفریں نظم لکھے۔ اس کی دیانت، اس کی محسوسیت بھٹائی اور
 محنت کی عظمت کے سامنے اپنا سرنگوں کر دے۔ اس لازوال انسانیت کے بارے
 میں کچھ لکھے جو گلیوں کے سائے میں بھی زندہ و تابندہ رہتی ہے اور ٹٹ لٹا کر

دھن سے دور کر لوٹ کھسوٹ کے شکار معاشرے میں غربت کے دہ گزاونے پر
بھی فغانیں ہوتی۔

ماں نے دوا دازہ کھول کر ایک نظر جیتھڑوں میں لپٹے انسان پر ڈالی اس کا
مصلے پر بیٹھ گئی۔ تبیسیم کے مانوں کو روکتے ہوئے اس کا سپید بالوں والا سر
نا معلوم انداز میں برابر ہٹا رہا۔

میں نے کتابوں کا ہینڈل رسل جو کے ہاتھ سے لے کر تپائی پر رکھ لیا اور
جیب سے ایک روپیہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے کہ سپاٹ چہرے پر
بڑی معنی خیز قسم کی ایک مقدس سی چمک مسکراہٹ کا ادب دھاڑ کر کچھ گھڑی اور اس
نے نفی کے انداز میں گردن ہلا دی۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی یاہوسی ہوئی اور میں نے
چہرہ آنے اور شامل کر کے رقم اس کی پیش ہوئی واسکٹ کی اوپری جیب میں ڈال
دی۔ وہ یہ رقم اپنی جیب سے نکال کر اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھا
اور میں خفگی میں پیچھے ہٹ گیا۔

”ہم یہ ناچیں میں گا۔“ وہ منمنایا۔

”عجیب انسان ہے۔“ میں بڑبڑایا۔ کیا یہ کم ہیں؛ لیکن میں اب ایک میا
بھی اور نہیں دوں گا۔ میری متانت بھری آواز کی کڑیاں تھکنا انداز سے جھلیں۔
وہ حسبِ عادت مسکرا دیا۔

ماں اس دوران صلی الپیٹ کراٹھ چکی تھی۔ رسل جو نے سوا روپایا کتابوں کے
ہینڈل کے پاس تپائی پر رکھ دیا تو ماں نے جھنجھلا کر کہا: ”نہیں لیتا تو نہ لے تھیں
کیا تپا بیٹے! ان مزدوروں کی تنگیوں میں ہزاروں روپیہ جمع ہوتا ہے۔“ تبیسیم کے

والوں کو جلدی جلدی گھاتے ہوئے ماں نے اٹکشان کیا۔

میر بھی مجھے ریل جو کی حالت زار پر ترس آ گیا۔ اچھا تو تم ڈیڑھ دو پیالے پیو
نہیں ملو گے۔ میں بڑی مستعدی کے ساتھ جیب سے چوٹی نکالتے ہوئے اس
کی طرف بڑھا۔

لیکن وہ اپنی اسی مسکراہٹ کے ساتھ معاکرے سے باہر نکلے ہوئے بولا
”ناہیں بڑی بی! یہ بات ناہیں ہوتی۔ جب تم گریب کے ساتھ اتنا صبر بانی سے
پیش آتی۔ اتنا اچھا سو لوگ کرتی۔ تو ہم بھی ایسا ناہیں کریں گا۔ ہم پندہرگز
ناہیں لیں گے“

میں وہ ڈیڑھ دو پیالے کر اس کے پیچھے تقریباً دوڑ پڑا لیکن وہ بڑی چھٹی
کے ساتھ رات کی سیاہیوں کو اُجھاتا ہوا اگلی کے موڑ پر غائب ہو گیا۔ میرے
سر کبھی اُٹانہ ہر سکے والا قرض چھوڑ کر۔

”منون“ لاہمد

میں عاصمہ حبیب

جس دن لمبے بالوں والی نامکمل سی عاصمہ حبیب کالج میں داخل ہونے آئی تھی۔ تو ایسے لگا جیسے کالج کے لمبے برآمدوں میں کوئی نسخی سی چڑیا بچھڑک آئی ہے۔ وہ اتنی چھوٹی اور دلی نقی کہ اس کے انسان ہونے پر مشکل یقین آتا تھا۔ پر خبر نہیں کیا بات تھی پہلے دن ہی سارا کالج اس سے مرعوب ہوا جاتا تھا۔ انتہائی خوب صورت ہکا نقشے والی حقیر سی عاصمہ حبیب کو دیکھ کر خوشی اور سہمہ روی کے جذبات بیک وقت ابھرے پڑتے تھے۔ لگتا تھا خدا نے اپنا سارا کام بس گدن کے اوپر ہی اوپر کیا ہے۔ اس کا خوبصورت چہرہ اس کے حقیر بدن پر ڈیکوریشن میں لگتا تھا جیسے مٹی کے ٹوٹے چھوٹے گھمان میں تازہ اور خوبصورت پتھروں کا لگدستہ۔ نہ بدن پر کوئی بوٹی نہ کمر میں کوئی لچک، ایسا مین کے سارے آٹا بیٹھے بیٹھے اور چھپے چھپے۔ پر خبر نہیں کالج بھر کے لوگوں کو اس بے راس سی عاصمہ حبیب میں کیا نظر آتا۔ سارا دن کھیسوں کی طرح اس پر مضحکاتے اور بھڑکے بھڑکے بد نون والی لڑکیاں یہ سب کچھ لکھتے

اور حیرت سے دیکھتیں۔ یہ تو دوسرے تیسرے روز ہی پتا چل گیا کہ یہ ننگی سی چڑیا بڑی ذہین ہے۔ ہر بات کا ایسا فر فر جواب کہ پروفیسر نیاں بغلیں جھانکنے لگتیں۔ بعض لوگیاں تو اُسے کوئی ماندائی مخلوق سمجھ کر گھٹنوں پائنتیں۔ لیکن آہستہ آہستہ جب اس کے سارے پتھن ان کے سامنے آئے تو لوگیاں اُس سے شدید نفرت کر لے لگیں۔ بعض اسے قابلِ دم سمجھ کر نظر انداز کر دیتیں، لیکن بہر حال جو کچھ بھی ہفتا و صبحہ حبیب کالج کا ایک ایسا نقطہ مرکزی بن کر رہ گئی تھی جس کے گرد کالج کا ہر وجود گھومتا تھا۔ وچیری روم میٹ تھی اور آج بھی ابھی طرح یاد ہے اس نے کبھی کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیا تھا، وہ ہر ایک سے اتنے ہمزاد رائیگاں سے بولتی کہ دوسرا کچھ بچہ جاتا تھا۔ کوئی لڑکی بیمار ہوتی تو عاصمہ حبیب سب سے پہلے پہنچتی جس دن ناز فاطمہ کی ماں کی موت کی خبر آئی تھی عاصمہ ناز کے ساتھ گورات اس کے شہر گئی تھی اور سوڑو پیہ بھی اس کی چھوٹی بہن کو دے آئی تھی۔ جسے جنم دے کر اس کی ماں فوت ہوئی تھی اور دو بچہ ڈرے میں اکیلی پڑی بد رہی تھی۔ دس بیس تو کتنی ہی لوگیاں روزانہ قرض لے لیتی تھیں لیکن عاصمہ نے کبھی اُن کا نام بھی یاد نہ رکھا۔ ملک شاپ پر بھی کتنی ہی لوگیاں اس کے نام پر کھنچا لیتیں۔ اور اگر میں کبھی ان باتوں کی طرف اس کی توجہ مبذول کراتی تو ہمیشہ ہنس کر یہ کہہ دیتی: چھوٹا سا اور بہت سی باتیں توجہ کے قابل ہیں۔ کھانے دو انہیں۔ خوشی بہت ہنگی چیز ہے دوست۔ اور اگر انہیں اس طرح خوشی ملتی ہے تو بخدا میں بہت خوش ہوں۔ وہ ہمیشہ ایسی باتوں سے مجھے لاجواب کر دیتی تھی۔ ہر دیکھنے والے کو عاصمہ حبیب سے شدید نفرت کے ساتھ شدید محبت

ہو جایا کرتی تھی۔ اور میری بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ مجھے اُس کے بارے میں جو جو باتیں معلوم ہوتیں اور میں نے خود جو کچھ دیکھا میرے دل میں اس کے لئے بے حساب نفرت تھی مگر معلوم نہیں کیا بات تھی میں سوچتی اگر مجھے عاصمہ صیب کے کمرے سے نکال دیا گیا تو میں بے سانس ہو کر رہ جاؤں گی۔ میں ایک لمحہ بھی نہ جی سکوں گی۔ اپنے اند کے ان جذبات کا تو مجھے اس روز پتا چلا جس روز عاصمہ نے رات کو مجھے چاقو مار کر زخمی کر دیا تھا، لیکن جب لوگوں نے مجھے دوسرے کمرے میں شفٹ کرنے کے لئے میلا سمانا اٹھرایا تو میں نے چیخ چیخ کر اُن کو یہ ارادہ بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ عاصمہ صابت کو ہمیشہ صرف اند و دیر پہننے رنگ دھڑنگ سیا کرتی تھی۔ روز روز کا یہ معمول میری برداشت سے باہر ہو گیا، کیونکہ اسے اس حالت میں دیکھ کر میں ذہنی طور پر اس قدر پریشان ہو جاتی تھی کہ ڈھنگ سے پڑھائی نہ ہو پاتی تھی۔ اگلی صبح میرا دلچہ تھا۔ عاصمہ صابت حالت میں میرے ساتھ کسی پتا کر پڑھنے لگی۔ میرا ذہن چکرانے لگا کیونکہ اس سے پہلے وہ کم از کم میرے قریب آ کر یوں بے تحاشی سے نہ بیٹھتی تھی۔ بات ناقابل برداشت تھی۔ میں نے سختی سے کہہ دیا کہ تمہیں اس حالت میں دیکھ کر مجھ سے پڑھائی نہیں ہوتی۔ میں سوچ بگو نہیں سکتی تھی، عاصمہ صابت کو اتنا محسوس کر لے گی وہ تیزی سے اُٹھی، اُٹھی سے چا تو نکالا اور چٹخنے پڑھا کر بکوا، ٹوٹ پڑی ہجرت اور غم سے میرا حلق خشک ہو گیا وہ تو شکر مبرا بات نہ دروم کا پھیل دروازہ کھلا تھا۔ لڑکیاں عاصمہ کی چیخ و پکار پر مانند دوڑائیں (وہ جھٹکے کے قوت ہمیشہ زور زور سے جھنجھتی تھی) اور اس طرح میری جان بچ گئی۔ میری وہ انگلیاں

شدید زخمی ہو گئیں۔ بات وارڈن تک نہ پہنچ سکی۔ کیونکہ عاصمہ نے دوسرے ہی لمحے دو دو کر کچھ اس انداز سے مجھے سے معافی مانگ لی کہ اٹا میں اپنے آپ کو بھر بجھ گئی۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ عاصمہ حبیب کے متعلق روزِ خدا میں ایسی باتیں سننے میں آئیں کہ میرا ذہن توڑنے لگا گیا۔ اُس کا دن رات ہوشوں اور کھجوں میں گزرتا اور صبح کا پتا میں اگر لڑکے ایک دوسرے کو بتاتے۔ یا راپنا آپ دینے میں بڑی سکتی ہے۔ رات تو ہی بھر دیا عاصمہ نے۔ کالج کا بہرہ و بشریہ بائیں سُتھا اور میں کڑھ کڑھ کر مرنے کو آجاتی تھکی ماندی وہ رات کو ہوسٹل کی دیوار بچاند کر آتی اور ساری رات کراہتی رہتی صبح چلے پیرینٹنگ شراپ اُس کی آنکھوں میں تہرتی رہتی۔ رات کو کبھی کبھی وہ اتنے زور سے کراہتی کہ لڑکیاں گھٹٹوں کتابیں سامنے رکھے بیکار میٹھی دہرتیں اور ایک دن جب لڑکیاں چلی کر وارڈن کے پاس یہ ساری بات پہنچانے گئیں تو وارڈن نے آگ بگولا ہونے کی بجائے مجھے بچے لہجے میں کہا ہر ایک کا اپنا اپنا کیریکٹر ہوتا ہے تمہیں اس کی کراہٹوں یا آواز گیوں پر ہاتھ ڈالنے کی کس نے اجازت دی ہے۔ ختم جاسکتی ہو اور لڑکیاں بڑ بڑاتی لڑکھڑاتی واپس آگئیں۔ ہوسٹل اور کالج کا کوئی قانون اور ضابطہ اسے قابو میں نہ کر سکتا تھا۔ لڑکیاں صاف صاف کستی تھیں کہ وارڈن عاصمہ حبیب کی آواز گیوں پر پردہ پوشی کر کے اُسے برباد یوں کے کنارے پر پہنچا رہی ہے اور جب یہی جھٹک وارڈن کے کانوں تک پہنچی تو اس نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ یہ لڑکی بہت جلد مرنے والی ہے اور ہم اسے زیادہ دیر تک زندہ رکھ کر خوار نہیں کرنا چاہتے۔ اگر کوئی لڑکی اس پر فقرہ کُسن دیتی تو وہ بھرے کالج میں آنکھ مار کر کہہ دیتی۔ یادوں کے اُٹھواؤں

گی۔ سمجھیں۔ اور لڑکیاں ساری بات سمجھ کر جلدی سے کھسک جاتیں۔
 عاصمہ کے خلاف شکایات کا ایک انبار پرنسپل تک پہنچ چکا تھا اور وہ بھی سرنڈر
 کے لئے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھی۔ لیکن اسی دنوں پر موشن ٹیسٹ میں
 عاصمہ حبیب نے ساری کلاس کو شکست دے کر ساری پرنسپل کو کھجکا دیا۔
 عاصمہ کا پرچہ حیرت انگیز حد تک عمدہ تھا۔ اور اس طرح عاصمہ کے خلاف شکایات
 کا دفتر ایک بار پھر مقفل کر دیا گیا۔ اور عاصمہ کی سرگرمیاں پھر تیز ہو گئیں۔ اب
 ایک نیا جنون شروع ہوا تھا۔ وہ ہر روز شام سوئمنگ کاسیٹوم کاندھے پر ڈالے
 نیشنل ہوٹل کے سوئمنگ پول میں نہانے جاتی اور دھاتے میں کسی بھی گاڑی والے
 سے کہتی۔ اے۔ ڈیر ہیں نیشنل ہوٹل تک پھوٹ دو۔ ٹیکسی نہیں ملی رہی۔ اور ٹیکس
 کرکار میں بیٹھ جاتی۔ کاندھ والا کوئی پسند آجاتا تو دوستی کر لی جاتی، نہیں تو اترتے تو
 وہ ٹھیکنا دکھا کر یوں بے نیازی سے گاڑی سے اتر جاتی جیسے کرایہ ادا کر دیا ہو۔
 سرچتی ہوں عاصمہ حبیب کو کون بھٹلا سکتا ہے۔ اور آج جب میری بڑی بیٹی چلتی
 مجھے آکر بتایا کہ پرنسپل مس خان نے کالج کے مٹی پر پڑھل کا نام عاصمہ حبیب ہال رکھ دیا
 ہے تو میں سوچ رہی ہوں عاصمہ حبیب نے کون سا بڑا کام کیا ہے، وہ تو کالج کھانا
 ڈبوں میں سرخروست تھی۔ پھر یہ اچانک مس خان نے کیا کر ڈالا ہے لیکن سوچتی
 ہوں اس نمٹتی حقیر لڑکی نے ضرور کوئی بڑا کام کیا ہو گا۔ مجھے ملے تو اسے بیس سال
 ہو گئے ہیں، خبر نہیں عاصمہ حبیب نے اسی بیس سالوں میں زمانے بھر کیا کیا رستم
 توڑے ہوں گے۔ مجھے آج بھی یاد ہے۔ عاصمہ حبیب نے ایک شام بڑی پریشانی
 میں مجھے بتایا تھا کہ کل چائینرز ہوٹل میں مس خان نے مجھے سعید چاؤلہ کے ساتھ

حال میں دیکھا کہ اس کا ایک ہاتھ میری مکر میں تھا اور دوسرا غنیمتی راہ پر تھا۔ عاصم حبیب نے یہ ساری بات اتنے ہلکے ہلکے ہو کر بتادی کہ چند لمحوں تک میری قوت گریانی ختم ہو کر رہ گئی۔ لیکن وہ یہ ساری بات مجھے بتا کر یوں ہلکی ہو کر تنگی بجاتی سگریٹ سلگنے بیٹھ گئی جیسے یہ سارا جرم میں نے کیا ہے اور دوسرے دن کا وہ طوفان بھی مجھے یاد ہے کہ میں خان نے ہال میں تمام لوگوں اور لڑکیوں کے سامنے آگ بگولا ہو کر عاصم حبیب کو ڈانٹا تھا۔ اور عاصم نے میں خان کو جواب دیا کہ کالج کی تاریخ کا سب سے پہلا اور شاید آخری حادثہ تھا میں خان کی ڈانٹ کے جواب میں عاصم حبیب بڑے سکون سے اٹھی تھی اور بڑی گستاخی سے کہتا تھا۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور میں اپنے ذاتی معاملات میں آپ کو تو کیا خدا کو بھی دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتی۔ آپ کو مجھے روکنے کا کوئی حق نہیں اور یہ کہہ کر عاصم حبیب خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی اور میں نے دیکھا میں خان اس وقت کچھ اس انداز سے مسکرائی تھیں جس کو کبھی بھی کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔ مسکرا کر اور راز کر میز کا سہارا لے کر بیٹھ گئی تھیں۔ ہال میں موجود ہر ذی روح نے سانس روک لی تھی۔ گتہ تھا جیسے ساری کائنات میں سب کچھ مر گیا ہے۔ اور کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ اور ایک دن میں خان نے مجھے دفتر میں بلوا کر عاصم حبیب کے والدین کے نام ایک خط لکھوایا جس میں اس کی ساری کامستانیوں کی منقروں کا ذکر تھا۔ یہ سب کچھ لکھتے وقت میرے ہاتھ کاٹا رہے تھے اور میں سوچ رہی تھی میں خان کا یہ خط عاصم کے والدین پر کیسے کم ہی اترے گا۔ اور وہ جواب میں شاید عاصم حبیب کو اس تعلیم سے بھی محروم کر دیا

جس میں اس کا مستقبل اب بھی چاند کی طرح روشنی نظر آ رہا ہے۔ میں خان یحیٰی صاحب سے لکھا کہ شاید عامر حبیب کو بھی مطلع کرنا چاہتی تھیں۔ وہ میری روم میٹ تھی اور میں نے خان کا خیال تھا۔ میں اس خط کا ذکر ضرور عامر حبیب سے کروں گی۔ میں نے تو ذکر کیا یا نہ کیا بہر حال مجھے یاد ہے پانچویں روز عامر حبیب کے باپ کا آگیا تھا جسے میں خان نے مجھے اور عامر حبیب کو چڑھ کر سنایا عامر کے باپ نے لکھا تھا۔ عامر اپنے قول و فعل کی خود مالک ہے اور اگر وہ یہی کچھ چاہتی ہے جو وہ کر رہی ہے تو ہم اُسے روکنا نہیں چاہتے اور نہ ہی آپ کو اُسے روکنے کی ہمت دیتے ہیں۔ اس سے آگے کی سطور مجھے یاد نہیں بس اتنا یاد ہے اس وقت میں خان زور زور سے مسلسل اپنی کینٹھ پر غنسل بجا رہی تھیں۔ اور میں سوچ رہی تھی۔ عامر حبیب اُس ملک کا سب سے اہم اور سب سے دلچسپ انضباطی کیس ہے۔ میں خان کے کھنڈ پر دوسرے دن عامر حبیب کا انضباطی کیس سوشل ورک فورسٹائر کی دو لڑکیوں شوکت اور ثریا اجمل کے سپرد کر دیا گیند شوکت اور ثریا اجمل اب سائے کی طرح عامر کے اور اگر وہ اس انداز سے منڈلائی رہیں کہ اسے خبر بھی نہ ہوتی۔ ثریا اجمل نے تو اپنی تھکنے میں عامر حبیب کی سات چشتیں کھانسی ڈالیں لیکن عیب بات یہ تھی کہ ثریا اجمل اپنی رپورٹ کی تیاری میں اتنی اچانک عامر کے قریب آگئی کہ کوئی یقین نہ کر سکتا تھا عامر حبیب کا ہاتھ تھا عامر اسی کی روشنیوں پر اتنی تیزی اور اتنی خوبصورتی سے کود آتی تھی کہ خود عامر کو بھی یہ قلعی احساس نہ ہو سکا کہ اس کے ساتھ غنیشیل ہوٹل کے سوتھنگ پول میں نہانے والی ثریا اجمل حاصل اس کے اندر کی خواہی کر رہی ہے اور رات کو چائینر ہوٹل

میں اس کے ساتھ کھانا کھانے والی ثریا اجل وہ سب کچھ دیکھنا چاہتی ہے جو عاصمہ ہوشل اور کالج میں نہیں دیکھا سکتی تھی۔ یہاں سعید چاؤلہ، جوادینا نجم اور اس طرح کے دوسرے دوستوں کے ساتھ وہ جو کچھ کر سکتی تھی۔ وہ وہاں تو نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ عاصمہ حبیب کو اندر باہر سے نگار کیلئے لئے ثریا اجل اس کی خلوت اور جلوت میں سایہ بن کر گھس گئی تھی۔ عاصمہ بھی ایک دوست پا کر خوش تھی۔ اور یہی تو وہ باتیں تھیں جو اسے عزیز بناتے ہوئے تھیں۔ میں سمجھتی تھی عاصمہ ثریا اجل کے ساتھ رہ کر اپنی روم میٹ کے آداب اور وہ سب کچھ تبدیل جائے گی۔ اور اگر وہ ایسا کر لیتی تو میں اسے ایک عام سی لڑکی سمجھ کر بھول بھی جاتی۔ لیکن اس نے کبھی بھی میری توقعات کے مطابق کوئی بھی کام تو نہیں کیا تھا۔ میں چاہتی تھی وہ مجھے ثریا اجل کے سامنے نظر انداز کرے اور قطعاً سبلاوے کر میرا اور اس کا ساتھ ایک ہی کمرے میں بہت دیر سے ہے اور یہ کہ ہم دراصل ایک دوسرے کی بہت عزت کرتی ہیں اور وہ تمام آداب نبھاتی ہیں جو دو انسان ساتھ رہنے کی وجہ سے نبھاتے ہیں۔ میں بھی سب کچھ چاہ کر عاصمہ حبیب کو اپنے دل و دماغ کے اندر عام کر دینا چاہتی تھی۔ لیکن ہمیشہ کی طرح وہ اس موقع پر بھی میرے اندر اسی مقام پر کھڑی رہی جو بہت اونچا تھا۔ اور جسے گرانے کے لئے میں ہر لمحہ کوشاں رہی۔ وہ ہر لمحہ ثریا اجل کے ساتھ رہتے ہوئے بھی میرے ساتھ تھی۔ میرے ساتھ احترام اور محبت کا وہی اظہار۔ میری ہلکی سی تکلیف پر جاگ جاگ کر میری خدمت، میری ضروریات کی پُرکمال۔ میرے جذبات کا احترام۔ اور پھر لڑائی کا بھی وہی شدید انداز جس

کی انتہا ہمیشہ کسی ملک چوٹ پر ہوتی۔ عاصم حبیب مجھے پورا نئی روشنی و روش پر نظر آتی جہاں میں اُسے قطعاً نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ میں سمجھتی تھی ثریا اہل اُسے یقیناً اپنی راہوں پر لے جائے گی جہاں وہ مجھے الگ کٹری نظر نہ آئے گی۔ وہ مجھے لوگوں کے هجوم میں انہی کے انداز میں بالکل عام سی لگے گی۔ اور اس طرح میں اپنے اندر عظمت کے اس مینار کو گرانے میں کامیاب ہو جاؤں گی جس کے ہر انیٹ روڑے پر عاصم حبیب قدم جمائے کٹری بھٹی۔ میں سمجھتی تھی ہم دونوں کے درمیان ثریا اہل کی یہ اچانک آمد میرے اندر نفرت کی وہ طاقت ضرور پیدا کر دے گی جس سے میں عاصم کو دھکا دے سکوں گی اور اس طرف میرے سینے پر پڑی وہ ہل کسک جائے گی جس نے میری ساری طالب علمانہ زندگی تک پیٹ کر رکھی تھی۔ سبب یہ ساری باتیں کتنی ہلکی اور بے معنی لگتی ہیں۔ بیس سال کے ڈیڑھ ساڑھے دنوں نے عاصم حبیب کو پاؤں پکڑ کر میرے اندر سے فوج کر اتنی درد بھینک دیا کہ وہ اس عرصے میں مجھے کبھی یاد نہیں آئی۔ لیکن سوچتی ہوں آج وہ اتنی بے حساب یاد آئی ہے کہ مجھے لگتا ہے میں اب اس سالوں کے ہر لمحے میں اسے یاد کرتی رہی ہوں۔ صرف اسے۔ اور آج بھی اپنی شکست پر رو رہی ہوں۔ عاصم حبیب کبھی بھی میری دوست نہیں تھی۔ پھر میں نے زندگی کے ہر لمحے میں اسے کیل یا رکھا ہے۔ ثریا اہل تو چند دنوں کے لئے اس کے قریب آئی اور وہ سب کچھ پوچھ کر چلی گئی جو عاصم حبیب نے مجھے کبھی بھی نہ بتایا تھا۔ میں ننگی عاصم حبیب کے باہر کے خدو خال دیکھتی رہی اور الجھتی رہی۔ اور ثریا اہل تو اس کے اندر کرا آئی تھی۔ اس کے اندر اسب کچھ دیکھ آئی تھی۔ عاصم حبیب مجھے کتنی دیر دھکا

میں رکھے رہی تھی مجھے ہمیشہ دوست کتنی رہی۔ پھر یہ کسی دوستی تھی۔ بہر حال شیکھار
نے عاصمہ کیس کی بڑی طویل اور بڑی دلچسپ رپورٹ پیش کی تھی اور اس میں وہ
باتیں بھی تھیں جو خود عاصمہ نے خریا اجل کو بتائی تھیں۔ خریا اجل کی رپورٹ کے
بعد پتہ چلا تھا کہ عاصمہ حبیب کی ماں کسی سیکھار میں کی داشتہ تھی لیکن جسمک
کے بعد وہ کراچی آباد ہو گئیں اور وہاں خرافت کی زندگی گزارنے کے لئے ایک محل
میں خانہ داری کا منصوبہ پڑھانے گئیں کیونکہ وہ کھانے پکانے میں بہت ماہر تھیں۔
بعد میں انھوں نے ایک معمولی منزل کے مالک ایک شخص خدا بخش حبیب سے
شادی کر لی۔ یہیں کچھ عرصے بعد عاصمہ حبیب پیدا ہوئی۔ زندگی بڑی پرسکون اور
محبت سے بھری بھری گزر رہی تھی۔ لیکن عاصمہ ابھی تین سال کی بھی نہیں ہوئی
تھی کہ خدا بخش حبیب کو ممتاز زہیم کے ماضی کا پتہ چل گیا اور پھر باقی عرصہ کچھ یوں
گزر کہ خدا بخش حبیب انکارہ بن کر جئے ممتاز زہیم کی محبت سیتے اور خرافت کا
کوئی چھپتا اس آگ کر کھجا دے سکا۔ البتہ یہ تھا کہ خدا بخش ممتاز زہیم کو الگ بھی نہ
کرتے تھے گویا شدید نفرت کے ساتھ شدید محبت بھی تھی۔ عاصمہ انہی حالات
میں جوان ہوئی لیکن عاصمہ کی خیر خواہی بھی خدا بخش پر قیامت بن کر ٹوٹی۔ عاصمہ
حبیب تو وہ تھی۔ جو وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ وہ ماں کو پٹے دیکھ کر باپ کو اتنی
خلیفہ گالیاں دینیں کہ خدا بخش حبیب بچوں کی طرح چیخ چیخ کر اپنا گلا پھاڑ ڈالتا۔
نہا سادہ پرسکون گھر اب حشر کا میدان تھا۔ جہاں ہر لمحہ دھینگا بھشتی گالیاں
ہوتیں۔ لیکن یہ دھینگا مشق صرف باپ بیٹی کے درمیان ہوتی۔ وہ دونوں بچوں کی
طرح ایک دوسرے کو نوچتے کھوٹتے کپڑے پھاڑتے اور ممتاز زہیم منہ پھوڑتے

کو پتہ رکھے زار و قطار روتی یا پھر ساری رات جاگ جاگ کر دونوں کی ذمہ داری
 جسمانی صحت و سلامتی کی دعا مانگتی۔ ایک دن ماحمہ نے بتایا تھا کہ اس نے
 اپنی کچھ سیلیوں کو کھانے پر مدعو کیا تھا لیکن جب وہ لوگ میز پر بیٹھے کھانا کھا
 رہے تھے تو میں اس وقت بابا آئے اور مجھے بلا وجہ کس کمرے پر چاٹا مار دیا
 غصے اور غم سے میرا وہ حال تھا کہ میں نے اندھا دھند طاقتوں اور کموں سے بابا
 کو مارنا شروع کر دیا۔ یہ مجھے خود بھی پتا نہیں اس وقت میرے اندر کہاں سے
 اتنی طاقت آگئی تھی۔ بابا نے بھی اس دن مجھے بہت مارا تھا اور میرے سامنے
 کے دو دانت توڑ دیئے تھے اور پھر اس دن کے بعد میرا ہاتھ کھل گیا۔ اب ہم دونوں
 ایک دوسرے کو بٹھا کرتے تھے لیکن ان حالات میں اگر میں کبھی کسی سیلی کی یہاں
 پہنچ جاتی تھی تو بابا یا والدہ بوجھتا تھا وہ مات کو اٹھ اٹھ کر دیوانہ وار روتا میرے
 نام کی چھین لگاتا میری ماں کے پاؤں پر گر میٹتا پوچھتا اور پھر دن کو میری ماں
 کو اتار دیتا کہ وہ سون کر خلی ہو جاتی۔ مجھ پر گھر ٹوٹنا پڑتا۔ جس دن ماحمہ حبیب
 گھر سے روٹ کر ہسپتال آئی تھی تو میں ماؤنگ باپ کرا پنا کھوج نہ دیا تھا اور مجھے
 یاد ہے وہ باؤلی شکل کا خدائے بخش حبیب جب ماحمہ کو کھوجتا ہوا ہسپتال آیا تھا اور
 ماحمہ سے ملی تھی تو وہ ہانکوں کی طرح پھینچ پھینچ کر ماحمہ حبیب کو پیار کر دیا تھا۔
 اُسے چھ سو روپے نقد دیئے جو اس نے اسی رات اپنے دوستوں کو کاک ٹیل پارٹی
 دے کر خرچ کر ڈالے تھے اور بچوں کی طرح خوش ہو کر گھر چلا گیا لیکن دوسرے دن
 جب وہ ہسپتال میں ماحمہ کو ملنے آیا تو اس نے ساری دیکھیں کے سامنے اُسے
 اتنی گندی گندی گالیاں دیں کہ ماحمہ نے اسے دھکا دے کر ہسپتال کا گیٹ بند

کر دیا تھا اور دیکھتا ہوا واپس چلا گیا تھا۔ باقی کا سا رات کچھ یوں گزرا کہ کبھی کبھی عاصمہ کے لئے مسٹائی کے ڈبے کپڑوں کے ڈھیر اور پھلوں کی ٹوکریاں ملتا اور کبھی کبھی اُسے ساری لڑکیوں کے سامنے ٹیڑھا کر گایاں دیتا ہوا چلا جاتا۔ اور اسی لئے عاصمہ نے اپنے اوقات کا زیادہ حصہ باہر گزارنا شروع کر دیا تھا۔ اور اگر کبھی کبھی وہ ہوشل میں موجود ہوتی بھی اور اس کا باپ اُسے لئے بھیجتا تو وہ کھلوا دیتی وہ ہوشل میں موجود نہیں۔ عاصمہ ہوشل کا اتنا دلچسپ کردار بن گئی تھی کہ اگر عاصمہ حبیب اس ہوشل اور کالج سے چلی گئی تو اس کالج کے سارے طالب علم بھوک ہڑتال کر دیں گے اور پڑھائی کو کھپ کر کے گھروں میں بیٹھ جائیں گے۔ لو ایک دن واقعی عاصمہ حبیب چلی گئی میرے کمرے سے میرے کالج سے اور میرے ہوشل سے۔ اور میں جو سمجھتا تھا کہ کالج میں ہڑتال ہو جائے گی سٹوڈنٹ سٹریکٹ رکھیں گے اور عاصمہ حبیب واپس آنے پر مجبور ہو جائے گی۔ واقعی یہ سب کچھ ہوا جس دن عاصمہ حبیب اچانک سفید پتوں والی سفید کار کی ڈگلی میں اپنا سامان بھر کر چلی گئی تو لو کہیں اور لوگوں نے ہاتھ باندھ باندھ کر عاصمہ حبیب کو روکا اور رو کر اپنی آنکھیں پھولالیں اور ہوشل کے کھانوں کے نیچے آٹ دیئے لیکن سب سے حیرت کی بات تو یہ تھی کہ جب صبح کو وارڈن نے میں عاصمہ حبیب کے چلے جانے کی اطلاع دی تو میں خان نے وارڈن کو فوراً معطل کر کے سٹوڈنٹ کے ساتھ انتہائی ہمدردی کا اظہار کیا۔ دوسرے دن جب میں خان نے مجھے دفتر میں بلوایا تو مجھے محسوس ہوا میرے اندر باہر اتنے آنسو جمع ہو گئے ہیں کہ اگر میں خان نے ایک دفعہ بھی عاصمہ حبیب کا نام لیا تو میں گھل جاؤں گی۔ باگل ہو جاؤں گی، اور مجھے کوئی

بات بھی نہ ہو پائے گی۔ میں خالی بھی بھی میز پر سر رکھے پڑی تھیں۔ آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں اُن کے رخسار انگارے ہو رہے تھے۔ وہ مجھ سے شاید عاصم کے اچانک جانے کی وجہ پر چھٹا چاہتی تھیں۔ لیکن اُن سے کچھ بھی نہ بولا گیا، وہ تھوڑی دیر تک میری طرف دیکھتی رہیں۔ اور میں سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی کوئی جواب نہ دے سکی اور پھر اچانک ہی اُنہوں نے کہہ دیا۔ تم جاسکتی ہو۔ دش۔ لیکن اب سوچنا ہوں، میں خانہ کے لئے تو میرے پاس اس وقت بھی کوئی جواب نہیں تھا اور نہ آج کوئی جواب ہے۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ عاصم نے بوربین دماؤں سے عورتوں کی بہت ساری ننگی تصویریں کاٹ کاٹ کر اپٹ کرے کی چاروں دیواروں پر چپکا رکھی تھیں۔ وہ رات کو ان تصویروں پر ہاتھ پھیرتی پھیرتی سو جاتی۔ میں اکثر دن کو دفتر پر احتیاط سے اتار دیتی تھی اور رات کو اُس کے آنے سے نہوئی پہلے اسی طرح چپکا دیتی تھی۔ اس طرح یہ بات وارڈن کے چھپی رہی، لیکن میں نے روز روز کی اس تکلیف سے تنگ آکر تصویریں اتارنا چھوڑ دیں۔ ویسے بھی اُن دنوں وارڈن کچھ بیمار تھی۔ اور اس کا راونڈ مترقع نہیں تھا۔ لیکن اُس رات اچانک وارڈن راونڈ پر آگئی کرے کی ساری دیواریں ہلکے منتقل دیکھ کر وارڈن کو غصہ آگیا۔ لیکن وارڈن نے حسب معمول عاصم حبیب کو کچھ کہنے کی بجائے تصویریں پھاڑ پھاڑ کر کہنیزوں کی طرح اُڑانا شروع کر دیں۔ بجلی بند تھی، عاصم کو غصہ آگیا۔ وہ یہ صدمہ غصہ جس کا شکار اکثر میں ہوتی تھی۔ عاصم نے جھلٹی ہوئی تنگ ساٹن سروسٹیں اٹھا کر وارڈن کے سینے میں گھسیٹ دی مجھے یاد ہے اس کی ایک چھاتی بڑی طرح جل گئی تھی۔ وارڈن نے اُسے ہدایت میں گھسیٹنے کی دھمکی دی تھی۔ سوچتی ہوں عاصم نے والی حیرت

نہیں تھی۔ پھر وہ کیوں چلی گئی۔ لیکن اس کی بے خبری تو اس خط سے پتہ چل گئی جو دوسرے دن اس نے وارڈن کے نام کسی نامعلوم جگہ سے بھیجا تھا۔ اُس نے لکھا تھا غفر میرے ہاتھوں نے آپ کے ساتھ جو گستاخی کر ڈالی ہے۔ وہ چھپن مجھے نہ بخیندتی ہے نہ مرنے دیتی ہے۔ اے کاش میں بٹ مجھ عدالت میں کوئی سزا دلوا کر اس اذیت سے نجات دلا دیں۔ میں نے بہت بڑا کر کیا ہے میں بٹ۔ اور یہ زندگی میں پہلی بار مجھے احسا ہوا ہے کہ میں نے واقعی بہت بڑی حرکت کی ہے جو کس طرح بھی قابل معافی نہیں۔ میں نے وہ خط میں خان کو دے دیا میں خان اُس خط کو لے لئے لڑکھڑاتی پھر پوچھیں اور مجھے گتا تھا عامر حبیب کا منتہا سادہ جو دوس خان کی ہر سوچ اور ہر احساس پکڑ لیا کر رہ گیا ہے۔ عامر حبیب کا یہ خط اس سلسلے کی وہ آخری بیڑی تھی جس نے سرخان کی پوری شخصیت کو جکڑ کر رکھ دیا تھا۔ اور آج جب ہمیں حال بعد عامر حبیب کا ہر بات اور ہر لمحہ مجھے یاد آ رہا ہے تو میں وہ بات بھی کیوں نہ لکھ دوں جو صرف عامر اور میرے درمیان ہوتی تھی۔ وہ بات جو آج سے کچھ سال پہلے مجھے بالکل بکواس ملی تھی۔ لیکن جو آج مجھے حیرت زدہ اور دکھی کئے جا رہی ہے جس شام اچانک عامر نے ہسٹل چھوڑنے کا پرہ گرام بنا لیا تھا۔ مجھے اُس دن پہلی بار احساس ہوا تھا کہ سادہ عامر حبیب سے مجھے کتنی شدید محبت تھی۔ وہ محبت جو بے غرض اور انسانی ہوتی ہے۔ یا غیر منہاس وہ محبت میرا جذباتی بن تھا۔ لیکن مجھے گتا ہے میرے دل میں عامر کے لئے اب بھی وہ محبت ہے جس نے مجھے اُس کے جانے والے دن خود کشی پر مجبور کر دیا تھا۔ حالانکہ اس کے وجود سے مجھے ہزاروں پریشانیوں اور تکلیفیں تھیں۔ جس دن شام کو سفید گاڑی میں اپنا سامان لیے آئی اور مجھے جاتے ہوئے خدا حافظ کہا تو اُس سے

مجھے محسوس ہوا تھا میری روح اچانک میرے اندر سے نکل کر بیس کہیں فرشتہ برگر گئی ہے۔ میں نے اُسے دکھا کر اس کے سامنے نیلی سیاہی کی پوری بھری ہوئی شیشی اپنے حلق میں منڈیل لی تھی لیکن عاصم نے یہ سب کچھ دیکھ کر بچے سے میرا گل حقیقت پایا اور سکرانی ہوئی گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی۔ اور اس وقت مجھے عاصم سے اتنی شدید نفرت ہو گئی تھی کہ میں نے بیس سال تک ایک لمحے کے لئے بھی اُسے یاد نہیں کیا تھا۔ لیکن آج جب میری بیٹی نے مجھے آگرتایا ہے کہ میں خان نے اُن کے کافی کے مٹی پر پڑا ہوا کھانا ہاں رکھ دیا ہے اور فرمایا اہل کی پلوٹ کو اپنے تاثرات کے ساتھ کتاب کی صورت میں بھجوا دیا ہے۔ تو سوچتی ہوں دراصل عاصم حبیب کتنی یاد ہے۔ اور آج مجھے بس خان نے عاصم حبیب پر لکھی ہوئی وہ کتاب بھجوائی ہے۔ کتاب کا صرف آخری باب پڑھوں گی۔ اس سے پہلے کا تو عاصم حبیب کا ایک ایک لمحہ میرے علم میں ہے۔ بس خان نے کتاب کے آخری باب میں لکھا ہے۔ عاصم حبیب آج کل کو کیوں کسی جہاز ساز کمپنی میں مقرر ہے۔ اور بی بی سی اپنے کسی پروگرام میں عاصم حبیب کی انگریزی نظموں کا ایک سلسلہ ہر روز کسی فرضی نام سے نشر کرتی ہے۔ بس خان نے مجھے اپنے خط میں لکھا ہے 'وہ دو ماہ کی رخصت پر ٹوٹ کر جا رہی ہے اور اس دو ماہ کا ہر لمحہ وہ صرف عاصم حبیب کے پاس گزارے گی۔ بس خان نے مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی ہے۔ لیکن سوچتی ہوں عاصم حبیب نے اتنے بڑے دُخود کے سامنے اپنے اس حقیر وجود کو کیسے سنبھال سکوں گی۔ عاصم حبیب اب بھی میرے اندر بڑی اونچائیوں پر کھڑی ہے۔ لیکن بس سے مجھے نفرت ہے۔

سی، ایل کاوش

اُس بازار سے

میرے ہاتھ میں بندھی ہوئی راکھی کو دیکھ کر حفیظ قندھاری نے کہا: "ٹو پگل ہے! عورت ماں بھوتی ہے۔ نہ بہن نہ بیٹی۔ اس کا مرد سے صرف ایک ہی رشتہ ہوتا ہے۔ جنسی رشتہ، مرد جنسی ہوس کا پیکر ہے اس نے اسے پیٹ کی بھوک سے زیادہ جنسی بھوک پریشان کرتی ہے۔ سماج کے بندھنوں کی وجہ سے وہ کچھ عورتوں کا ٹھکانہ ضرور کرتا ہے لیکن جس طرح فالتے کے عالم میں وہ کبھی بھی روٹی چھین کر یا چرچا کر کھا جاتا ہے اسی طرح جنسی تشکیں کے لئے رشتوں کی بے حرشی کر سکتا ہے!"

سید یزدانی جاندھری نے میرے ہاتھ سے مسٹھائی کا ڈبہ چھین کر کھولا اور اسے حفیظ کے سامنے بڑھا کر کہا۔

”وہ مسٹھائی گھاؤ“

سید یزدانی نے زس گٹھا حفیظ کے مونہ میں رکھ کر اس کا مونہ بند کر دیا چاہا۔ حفیظ اسے کھاتے ہوئے میری طرف گھورتا رہا۔

ان دونوں لاہور کی ایک مشہور ایکٹرس میرے راکھی باندھا کرتی تھی۔ میں ہندو وہ مسلمان ہم دونوں ایک دوسرے کو بھائی بہن مانتے تھے۔ حقیقت اس رشتے کے مخالف تھے۔ سینڈیز زندگی کو اس بات سے توافق تھا کہ عورت جس بن سکتی ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ ایک ایکٹرس بن سکتی ہے۔

سید پروانی جالندھری کا خیال تھا کہ یہ بحث سراسر فضول ہے۔ سب رشتے بننے اور بھانے کی بات ہے۔ آج کے آدمی کی مشکل یہ ہے کہ وہ کتنا کچھ ہے اور کتنا کچھ ہے اور عمل کسی اور ہی بات پر کڑھاتا ہے۔ حقیقت قندھاری نے کہا،

”یہ کلیہ عورت اور مرد کے رشتے پر کھرا نہیں اُترتا“ اتنا کہہ کر اُس نے عورت کی بیالوچی بیان کر ڈالی۔ اور پھر عورت کی خصلیات کو سمجھانے ہوئے فرائیڈ کی قبر کو ڈی شروٹ کی۔ اور ”کام سوتر“ کا حوالہ دیتے ہوئے رشی وائساکن کی چٹا کرید نے لگا۔

حقیقت قندھاری زندگی میں ٹھیر تھلا اور بحث میں ٹوکیلا تھا۔ بحث میں کبھی ہار نہیں اور زندگی میں کبھی جیتا نہیں۔ اُردو زبان وہ لکھنوی انداز میں بولتا تھا چٹو دیہاتی پیشانوں کی طرح فارسی ایرانیوں کی مانند اور پنجابی تو اس کی مادری زبان تھی۔ نام تھا عبدالحمید کہلاتا تھا حقیقت قندھاری۔

تین مسلمان ایک ہندو ہم چاروں دوست اکٹھے رہتے تھے۔ لاہور میں بچی دودھارے کے باہر گھاٹی اترتے ہی ہمارا مکان تھا۔ مکان کا کرایہ پروانی جیانی بھرنے اور تندر ترمک دیتے تھے۔ گھاٹی کے اس طرف منزل ہوٹل تھا۔ وہاں ہم لوگ کھانا کھاتے تھے ہوٹل کا بل حقیقت کے ذمہ تھا اور میں تو ہندو تھا۔

ان دونوں منزل ہوٹل اور عرب ہوٹل اُردو ادیبوں کے دو ٹھکانے تھے۔ اُردو

سجاد کا دفتر بھی منزل ہوٹل میں تھا۔ اُردو کے بڑے بڑے استاد شمس العلماء
تاجور نجیب آبادی سرکارنا صلاح الدین احمد، احسان دانش، اختر شیرانی پورا میں
حسرت قمر جلال آبادی، ماما شودش کاشمیری، ساجد دھانی سب وہاں لکھتے ہوتے۔
اُردو ادب پر بحثیں ہوتیں۔ زندگی کے رموز اور شاعری کے نکات پر کھے جاتے۔ یہ
لوگ تنقید میں استادوں کی ٹوپیاں اُچھا ل دیتے۔ اور کبھی کبھی لونڈوں کے سر پر گریبان
باندھ دیتے۔ حفیظ قندھاری ان مجلسوں کے لہڑانے جاتے تھے۔

حفیظ قندھاری نے زندگی میں ہمیشہ کام کی تلاش کی، مگر کبھی کام نہ ملا۔ حفیظ
کے والد قندھار (افغانستان) میں ڈاکٹر تھے جب ہم لوگوں کے مالی حالات خراب
ہوتے تو حفیظ قندھاری چلے جاتے اور اپنے والد سے روپیے لاتے، اس روپے
کے آتے ہی ہم سب دوست ایک ساتھ مال دار ہو جاتے تھے۔ مگر یہیں دنگ و درمن
ہوتا۔ فریج بدلتا۔ یاروں کے سوٹ بدلنے لگتے۔ حفیظ قندھاری منزل ہوٹل کے باہر کسی
کھانا کھاتے اور دھڑلے بچلے آدی کو ہوٹل میں کھانے کی مینجر بٹلاتے۔
عرب ہوٹل سے کباب منگاتے جاتے تو گینگے بیکری امار کلی سے پیسٹری، کیک۔ یا رول
خوب سیر ہو کر کھاتے۔ حفیظ کے خلوص کی تعریف کرتے۔ اس کی بحث اور تنقید کا چمٹلا
لیتے اور ”زندہ باد“ کا نعرہ لگا کر چلے جاتے۔

ایک بار کا ذکر ہے حفیظ قندھاری نے نئے قندھار سے مال دار ہو کر آئے تھے،
دفتریں ہو رہی تھیں۔ یا رہا شی کے مزے آرہے تھے۔ ایک شام کو ہم رگ منزل ہوٹل
میں اکٹھے ہوئے تو حفیظ قندھاری نہیں تھے۔ کہاں گئے تھے کچھ پتہ نہیں۔ گیا۔ بج
نک انتظار کیا۔ پھر کھانا کھایا۔ لیکن کھانا بے مزہ رہا۔ حفیظ کی باتوں کی چٹنی دفتر

پرنہ ہو تو کھانا کیسا۔! بس کسی طرح پیٹ بھر لیا اور جا کر سو گئے۔

رات کو دو بجے حفیظ قندھاری نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ جھومتے نظر آئے۔

”کہاں تھے تم؟“ میں نے پوچھا۔

”قیامت کی گود میں“ حفیظ نے لڑکھڑاتے قدروں سے وٹیلز کے اندر داخل ہو کر کہا۔

”قیامت کی گود میں؟ میں جیران ہوا۔

”یاد تھو میں تو گود ہی تھی۔ لیکن حقیقت میں۔ میرے سامنے بیسی تھی؟“

”یہ خراب اسی نے پلائی ہے کیا؟“

”نہیں میں نے پلائی ہے۔“

”قیامت کو؟“

”نہیں، جس کے پاس وہ رہتی ہے اُس کو۔“

”کس کے پاس رہتی ہے؟“

”ہیرا منڈی گئے تھے تم؟“

”ہاں ہیرا منڈی میں ہی رہتی ہے وہ۔“

”لاہور کی طوائف ہے؟“

”نہیں ریاست سوات کے کسی گاؤں کی گورن ہے۔ بڑی معصوم بھانجی ہے۔

سوائے پشتو کے دوسری زبان نہیں جانتی۔ اگر نہایت سیکھ لے اور نظم کے پردے پر

آجائے تو سب میر و تنیں مات ہو جائیں۔“

”تم اسے ایکٹریس بنانا چاہتے ہو؟“

یزدانی نے کروٹ بدل کر تیز آواز میں کہہ

”سوتے بھی دو گے؟“ پھر وہ لپک کر اٹھے اور جی بھجا کر تیرپیں گھس گئے۔

حفیظ قندھاری نے چھپسپاتے ہوئے کہا۔

”لوہ کی کا نام انور ہے۔ خوب صورت جوان۔ ایمان کی نظر پڑ جاتے تو پسینا جاتا۔“

جس کے پاس ہے اس کا نام ہے اللہ دیا۔ اس کے مکان پر لوگ آتے ہیں،

بیٹھتے ہیں لیکن صرف خرابیٹے ہیں۔ اور پھر عالی ماتہ چلے جاتے ہیں۔ پیسے نہیں

ترتربڑا ہیں نے لقمہ دیا۔

حفیظ نے کہا: اللہ دیا تو یہی کہتا ہے حضور میں خود اس سے نکاح کرنے

والا ہوں۔ ہم کنبہ ہیں لیکن ہماری بھی عزت ہوتی ہے۔ ہماری بہنیں اور بیٹیاں تو

پہننے پر بیٹھ جاتی ہیں۔ لیکن یہودی میں پردے میں رہتی ہیں۔ ستارے بھی نہیں

چھو سکتے۔ وہ تو صرف آنکھ چھو لی کھلتے ہیں۔ تمہاری نظر میں انور کو ٹھہرائی ہو۔

لوگوں کے ماتہ بھی چھو چکے ہوں گے۔“

”ناممکن؟“ حفیظ قندھاری بدک کر پورا چٹان ہو گیا۔

”میں تم کا کر سکتا ہوں کہ ابھی تک وہ پاک دامن ہے۔ سوات کی گنوا

کلی ہے انور!“

میں نہیں پڑا۔ لاہور سے پشاور تین میل دور ہے۔ پشاور سے سو میل دور۔

مردانہ ہے وہاں سے شرمیل آ کے ریاست سوات کا دار الحکومت منگروہ ہے۔

اور اس سے آگے انور کس گاؤں سے آئی ہے اتنے لمبے سفر میں کلی کیا بھول بھی

مرجھا جائے ————— مرد کے ہاتھ پہ کھڑیوں کو فروج کر ہوس کی پھونکوں سے ٹکڑا دیتے ہیں ادویوں بھی بقول تمہارے عورت اور مرد کا رشتہ صرف ایک ہی ہے اس لئے اب سو جاؤ رات گہری ہو گئی ہے“

حفیظ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے جی جلا دی۔ میں نے لمبا سر منہ چھپا لیا۔ کان بھی لپٹ لئے حفیظ نے لمبا آواز بھینکا وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی نیند لاگئی تھی۔ اور لاہور کی سردی کا احساس بھی غائب ہو چکا تھا۔

دوسرے دن ہم ہیرا منڈی میں تھے۔ ہمارے سامنے سوات ریاست کا پول کش شباب تھا۔ گداز بدن، تیکھے نقش، گورے رنگ میں گلاب کی سُرخ گھٹلی تھی۔ لو کی کی تھی اک سر پہ جلوہ۔ اس کے لبوں میں ہشامیت اور انداز میں نسائیت تھی۔ ہاں اور وہ بونٹ تو تذکیر و تانیث کے فرق کو مٹا دیتی۔ اس پر بھی آدھی کا دل آواز کے آواز چڑھاؤ پر لہریا لیتا رہتا۔ اٹھ دیا پاس بیٹھا آگ تاپ رہا تھا۔ ہم آنکھیں سیدک رہے تھے۔ حفیظ نے ایک سو روپے کا نوٹ نکالا اور کہا۔

”خدا ناشتے کا بندوبست کرنا“

”اٹھو یا نوٹ لے کر کھلے کوڑے سے باہر نکل گیا۔ دروازے کا پرچہ ہتھار گیا۔ میں نے پشتوں میں پوچھا۔

”تو پختہ تھے؟“ (تم ہشامنی ہو؟)

”آہا“ (ہاں ہی) فوراً نے جواب دیا۔

”تو سنگھا پختہ تھے؟“ (تم کیسی ہشامنی ہو؟)

اب اس نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر فرزندگی کا دھندلا

پھیل گیا۔ گالوں کی سُرخ غائب ہو گئی۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی سکرے میں کچھ شراب کی خالی بوتلیں، کچھ خالی گلاس اور سگریٹوں سے اٹے ہوئے ایش ٹرینز دکھائی دے رہی تھیں۔ اند کی نظر میں ان سب چیزوں پر سے گزندِ حفیظ کے چہرے پر گر رکی گئیں۔ وہ دیر سے بولی۔

”دا زمانِ قسمت دینی؟“ (یہ میری قسمت ہے۔)

حفیظ اند کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

میں نے حفیظ سے کہا۔

”مشرق والوں کی یہ خاصیت ہے کہ وہ ہر بُرائی کو قسمت کے ماتھے مندرجہ تھوڑے

حفیظ نے جواب میں مجھے گھور کر دیکھا مگر بولا نہیں۔ اند خالی بوتلیں میٹ کر

اند چلی گئی۔ حفیظ کی نظر میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگیں۔ دل تو پہلے ہی تعاقب

کر رہا تھا، روح کا پتہ نہیں۔

میں نے حفیظ کو مخاطب کیا۔

”یہ جتنی خالی بوتلیں اٹھا کر لے گئی ہے اتنے ہی آدمی رات کو اس گھر میں آتے

ہوں گے۔“

”تو متعجب ہے؟“ حفیظ کے جڑے کلن گئے۔

”قرآن آٹکھوں پر پڑتی باندھ لی ہے؟“ میں نے کہا۔

اتنے میں اند دیا حلال کئے ہوئے چار یا پانچ مرفے اور بہت سا سامان اٹھا کر

لے آیا اور اند کو پکار کر کہا: ”اب کو پکار دے“ اور پھر وہ انجیٹی کے سامنے بیٹھ کر

تاپنے لگا۔ باہر آگن میں دھوپ نہیں تھی۔ آسمان کو بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔

ماحول کھل گیا تھا۔

”ہمیں دکان سے لیتے ہیں۔ انگلیشی دروازے کے آگے رکھ لو! اتنا کہ کر حفیظ نے انور سے پشتوں میں کچھ کہنا شروع کیا۔

اللہ دیا! بعد بھاڑے دیکھئے لگا۔ پھر جھٹکا کر بولا: ”ایتھے آ کے سیدھی سیدھی بولی دہن لگی کیتا کرو یا بو صاحب! اسے دغا راؤ ڈال نہیں چلے گی۔“ اتنا کہ کر اس نے شلوہر کے نیچے سے کمانی دار چاقو نکالا۔ اور مرغیوں کے ٹکڑے کرنے لگا۔ اس کے تھوڑا ایک ایسے دلال کے سے تھے جسے دو پارٹیوں کے آپس میں مل جانے کا دھڑکا رہتا ہو جس میں اس کی اپنی دلالی ڈوبتی نظر آئے۔

مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے اللہ دیا کو ٹھنڈا کرنے کی خاطر کہا۔ ”وہ پشتوں میں صرف یہ کہہ رہا ہے کہ آج دنا پہنچانی انداز میں کھانا کھلا دو۔! اچھے کابل یاد آرہا ہے۔“ نگورا میں اس نے ایک دعوت کھائی تھی۔ اس کا فائدہ آج تک اس کی زبان نہیں بھولی۔

انور آہو جی: کہہ کر ڈمچی انگلیش پر رکھنے لگی۔ میں پیاز چھیلنے لگا۔ بظاہر سب کام میں معروف تھے۔ سب خاموش تھے۔ لیکن ہر ایک کے دل میں طرح طرح کے سوال سر اٹھا رہے تھے۔

پھر جانے حفیظ کو کیا سوچھی! اس نے اپنا کیمرا اٹھایا اور دلش لگی تیار کرنے لگا۔ اللہ دیا نے دیکھ کر پوچھا: ”کیا پھر ٹورے؟“

”ہاں! ایک اخبار کے لئے انور کا نوٹوں کا“ اور نیچے لکھوں گا۔“ بے نام فلم کی ہیروئن۔ نیا چہرہ۔ اودھ کھلی گئی۔“ پھر پنجاب کی ساری فلم انڈسٹری اس کی تھی

میں ماری ماری پھرے گی۔“

اشد دیا نے انور کی طرف دیکھا پھر میری طرف دیکھ کر کہا: یہ گانا نہیں جانتی، ناچنا نہیں جانتی۔ زبان نہیں جانتی یہ کیا ایسی کی تم پھر دس بنے گی۔“
 ”..... اور ساتھ میں تمہاری بھی؟ میں نے فقرہ دیا۔

اشد دیا پہلے حفیظ کو لگتا رہا۔ پھر انور کو گھورنے لگا۔ اس کے بعد بولا: ہر تو
 سکتا ہے لیکن تم اخبار والوں سے ڈر لگتا ہے۔ بڑے بگڑی ہوئے ہیں خبر کچھ بڑی
 ہے چھاپتے کچھا دو ہیں۔“

میں نے کہا: کچھ ایمان دار بھی ہوتے ہیں میاں؟
 ”لڑکی کے معاملے میں سب بے ایمان ہیں۔ باؤ صاحب! اور آپ شاید
 بھگوتے ہیں۔ یہ میری بیوی ہے۔“

”تو پردے میں بٹھاؤ!“ میں نے تنک کر کہا۔
 ”ابھی نکاح نہیں کیا ہے۔ پر کھ رہا ہوں کمال! اُدھو ہے یا نکاح نہیں ہو سکا
 بن جاتے گی تو اس کی زندگی سنور جائے گی۔“

حفیظ نے دلال کے دل میں لالچ بھروا دیا تھا اب وہ بڑے کاروبار کے خواب
 دیکھنے لگا تھا۔ حفیظ نے انور کو چھوٹے بغیر اس کے تین چار فوٹو کیسے اودبات
 کرائے بڑھاتے ہوئے بولا۔

ایکٹرس بننے کے بعد اگر تم شادی کرو گے تو تمہاری تصویریں بھی چسپ
 گی، پروڈیوسر یا ریڈیو میں بلائیں گے۔“

”ایکٹرس شادی کہاں کرتی ہے صاحب! وہ تو ایک قانونی بھڑو پال

لیتی ہے۔ ”اللہ دیا کے اندک انسان بول پڑا۔ اور ہم لوگ بھڑکے نہیں کھڑے ہیں۔ عزت کی روٹی کھاتے ہیں۔ اپنے پیشے کے بار نہیں جھانکتے اب متا ز شانتی کو دیکھ لو ایکٹرس بن گئی... لیکن...“

حفیظ نے بات کاٹ کر کہا: ”وہ بھی تو ولی سے شادی کرنے والی ہے۔“

میں بولا: ”ولی بھی شاید ابھی اسے پرکھ رہا ہے۔“

اللہ دیا نے کہا: ”نظامی کی وجہ سے شادی نہیں ہو سکتی۔“

”نہیں یاد رہے آج کل گیتا کو ٹریننگ دے رہا ہے۔“ حفیظ راز بتانے لگا۔

”گیتا کی ٹریننگ کے لئے اس نے ڈانسنگ کمپنی کھول رکھی ہے۔ متا ز شانتی کے

نام پر روپیہ خورد رہا ہے۔ گیتا جب تیار ہو جائے گی اور متا ز شانتی ولی کی مری ہو

جائے گی۔ تو گیتا کی کئی نظامی کے بڑھاپے کا سہارا بن جائے گی۔“ پھر حفیظ نے

پہلو بدل کر یہ تجویز رکھی کہ متا ز شانتی کی ڈانسنگ کمپنی میں انور کو شامل کر اسے

دیتے ہیں۔ وہاں ناچ بھی سیکھ جائے گی زبان بھی اور ایکٹرس بھی بن جائے گی۔

”میسے کتنا طے گا؟“ اللہ دیا نے پوچھا۔

”تین سو روپے تو متا ز شانتی سے کہہ کر میں دلوادوں گا۔“ حفیظ نے ہڈی کی

”تین سو؟“ اللہ دیا حفیظ کے سہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے چاقو بند

کر کے خفیہ میں رکھ لیا۔

میں نے کہا: ”حفیظ کی بات کو نہ متا ز شانتی ٹال سکتی ہے۔ نہ نظامی ٹال

سکتا ہے۔“

”تو معاملہ پکا کرادیجئے۔“

اگلے دن ہم لوگ اشد دیا کو لے کر متا از شانتی کے یہاں پہنچے، نظامی نے ہمیں کمر روپے کے نوٹ لگ کر اشد دیا کے ہاتھ میں رکھ دیئے، اور کہا: ”ہم لوگ حیدر پور جہاز سے ہیں انور ہمارے ساتھ جہاز سے گئے۔“

”وہ بے چاری اکیلی کیسے جہاز سے گئی؟ میں بھی ساتھ چلوں گا۔“ اشد دیا نے

اڑھیں ڈالی۔

”ہم پر اعتبار نہیں ہے؟“ نظامی نے پوچھا۔

”اعتبار کی بات نہیں ہے۔ میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔“

نظامی نے حفیظ کی طرف دیکھا، حفیظ نے آنکھ سے اشارہ کیا، نظامی نے

اشد دیا کی بات مان لی۔ ”تم بھی چلو، لیکن تمہارا گریہ...؟“

حفیظ نے کہا: ”کینی دے گی۔“

متا از شانتی بولی ”کینی دے گی۔“

معاملہ طے ہو گیا، میرسل شروع ہو گئی۔ حفیظ قندھاری نے دوسرے دن

بینک سے پانچ سو روپے نکلوائے۔ وہ روپے حفیظ نے کہاں خرچ کئے کسی دست

کو پتہ نہ چلا۔

شام کو میں نے منزل ہوٹل میں حفیظ سے پوچھا: ”تم بھی پشاور جاؤ گے؟“

”نہیں ابھی نہیں۔“

میں نے پھر کہا: ”اشد دیا کا عشق سچا معلوم ہوتا ہے۔ پشاور تک ان کو کیا

نہیں جانے دیتا؟“

”عشق کس کا سچا ہے یہ بات ابھی تم لوگ نہیں جانی سکتے۔“

”لیکن تم تو عشق کے قائل ہی نہیں، صرف عیسیٰ کے قائل ہو؟“
 ”میں اسے میری بنانا چاہتا ہوں۔ دشتہ وہی ہے عیسیٰ دنیا کی قظروں میں
 ذرا تافانی ہو جاتا ہے۔“

”اٹھ دیا بھی وہی بنانا چاہتا ہے۔“ میں نے پوٹ کی حفیظہ نے اس بات
 پر دودھ بھری قظروں سے میری طرف دیکھا۔
 مستانہ شادی کی ڈانگ پارتی تو پر چلی گئی۔ اور حفیظہ قندھاری آہیں بھرتے
 رہ گئے۔

عید سے دو دن پہلے انور نے حفیظہ کے نام خط بھیجا۔ پشتون میں گل ایک جگہ
 لکھا تھا: اختر رافیلے تے رائے۔ (عید آگئی۔ تم نہ آئے)
 خط ملتے ہی حفیظہ پشاور روانہ ہو گیا۔

ہم لوگوں نے سمجھ لیا کہ اب حفیظہ لاہور واپس نہیں آئے گا۔ وہ انور کو لے کر
 قندھار یا کہیں دُور بھاگ جائے گا۔ چھ ماہ لوگ ابھی تیا س آرائیاں ہی کر رہے تھے
 کہ ایک دن صبح کی اذان کے ساتھ ہی سہارے دروازے پر اٹھ دیا نے آکر بانگ کی
 وہ اکیلا تھا۔ اس کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ قربانی دے کر شہر
 ہو کر آیا ہو۔

میں نے اسے چائے پیش کی۔ ترمذی نے ٹٹولا۔

”انور کب آرہی ہے؟“

یزدانی نے پوچھا: حفیظہ کہاں ہے؟

اٹھ دیا نے کسی بات کا جواب نہ دیا۔ چائے کی چپکی لے کر بولا:

بابو صاحب آزاد فضا کا چھٹی خنجر میں آکر اڑان بھول گیا تھا۔ آپ جانتے ہیں
 مہرئی تو بن میں ہی چوگری بھرتی ہے پخیرے میں کتنے دن چھے گی۔ میں نے اسے آزاد
 کر دیا۔ قندھاری صاحب نے ایک دن مجھ سے کہا۔ جسے پیار کرے اسے قید کریں
 رکھے۔ اہل میں تمہارے عشق میں خود غرقی کا نہر ط ہے۔ بابو صاحب! حفیظ صاحب
 کھرے آدمی ہیں انھوں نے میرے اندر جو آدمی سو رہا تھا اس کو جگا دیا میں سوچ
 میں پڑ گیا۔ خریف لوگوں کے لئے بیٹی کو وداع کرنا آسانی کام ہے۔ لیکن میں نے
 اپنی بیوی وداع کر دی۔ حفیظ صاحب سے کہا: آپ تو اس علاقے کی زبان جانتے
 ہیں جہاں کا یہ بھی ہے۔ اس علاقے میں جاکر چوڑا کیے، وہ مان گئے اور میں لوٹ
 آیا! اتنا کہہ کر اس نے حفیظ قندھاری کا خط دیا اور سلام کر کے چلا گیا۔

خط میں لکھا تھا: میں مردان جا رہا ہوں۔ سوات سے لوٹ کر آ گیا تو خط
 کھوں گا۔ ورنہ خدا حافظ!

اٹھ دیا کے جانے کے بعد ہم لوگ خوب ہنسے حفیظ نے اٹھ دیا کی ہنسک کا
 ڈالی تھی۔ اب اس کامی چاہے تو سوات جائے، قندھار جائے یا پشاور کے کسی
 ہوٹل میں ٹھہرا رہے۔ حفیظ کے بارے میں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

چار دن کے بعد حفیظ بھی لوٹ آیا۔ اسے دیکھ کر میں حیران ہو گیا۔
 ”تم تو سوات گئے تھے“ میں نے سوال کیا۔

”ہاں مردان سے لوٹ آیا“

”انہ کہناں ہے؟“

”منزل ہوٹل میں“

”یہاں کیوں نہیں لائے اسے؟“

”اٹھ دیا کو خبر ہو گئی تو ڈرامہ ہو جائے گا؟“

”اب ارادہ کیا ہے؟“

”ارادہ وہی ہے نکاح کدوں کا۔“

”اتنے دن مردان میں نکاح کے بغیر کیا کرتے رہے؟“

”انہو تو پانچوں وقت نماز پڑھتی رہی، وظیفہ کرتی رہی، میں اسے دیکھتا رہا۔“

وظیفے کے بعد وہ اللہ سے دعا مانگتی کہ خدا مجھے سکون دے اور ایک نیک انسان بنے۔

”اور تم پہاڑی نیک آدمی بن گئے۔“

”نہیں میں تو جیسا تھا ویسا ہی ہوں، میں نے انور سے کہا چلو تمہیں گاؤں

چھوڑ آؤں۔ وہ نہیں مانی، اس نے کہا میرے قبیلے کے لوگ کسی دھوکے میں نہیں

قتل کر ڈالیں گے۔ مجھے زندہ چھوڑنے والے نہیں۔ میں تو اسی لئے جا رہی ہوں کہ

اب اس زندگی کو ختم کر دینا چاہئے۔ نکاح کے لئے وہ راضی نہیں ہوتی تھی۔ کہتی

تھی تم میرے لائق نہیں ہو۔ اور پھر ہنس دیتی۔ آخر میں اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکا۔

ساتھ لے آیا۔“

تھوڑی دیر بعد ہم سب منزل ہوٹل پہنچ گئے۔ انور وہاں موجود تھی۔ اتنے

میں نہ جانے اٹھ دیا کر بھی کیسے معلوم ہو گیا۔ وہ سیدھا منزل ہوٹل آدھنڈا۔ اور

آتے ہی بولا۔ سلام بابو صاحب! میں جانتا تھا ایک بار گھر واپس سے مجھ کا پہنچا

دوبارہ گھوٹلے میں نہیں جاتا۔ اس لئے تمہارے سپرد کر دیا تھا۔ اب مال میرا ہے۔

میں لئے جاتا ہوں۔“

اتنا کہہ کر اس نے انور سے کہا: ”چلو گھر چلیں۔“

انور بولی: ”میں نہیں جاؤں گی۔“

”میں تیری ناک کاٹ ڈالوں گا۔“ دلال نے آخری دھمکی دی۔ اور ہاتھ پکڑنے

کے لئے آگے بڑھا۔ انور نے ہاتھ جھٹک دیا۔

”پریدا“ (دفعہ) اس نے پشت میں ڈالتا۔

”حرام زادی! اللہ دیا غصے میں آنکھیں نکال کر آگے بڑھا۔ حفیظ نے

اسے روکا۔ یزدانی نے ٹوکا۔ ترمذی اور میں کھڑے ہو گئے۔ اللہ دیا ٹھنڈا فر گیا۔

اس نے یزدانی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تھصور میں کتنا تمنا نا۔ اخبار رولے خبر کچھ مہوتی ہے۔ چھاپتے کچھ اور ہیں۔

لیکن ہم بھی کچھ ہیں۔“

اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔ یزدانی نے حفیظ سے پوچھا۔

”یہ کیا کرے گا؟“

”کیا کرے گا؟ کمر ہی کیا سکتا ہے؟“

ترمذی نے جواب دیا۔ ”ہیرا منڈی کے غنڈوں کو لا سکتا ہے۔“

”ہم پولیس کو بلا سکتے ہیں۔“ حفیظ نے فوراً کہا۔

یزدانی بولا پہلے اس لڑکی کو یہاں سے کیس اور کھجواں لے بنا چاہئے۔“

حفیظ نے میری طرف دیکھا: ”تمہاری ایکٹرس ہیں کے گھر؟“

”وہ تو باہر گئی ہے۔ لاہور میں نہیں ہے۔“ میں نے جھوٹ بولا۔

حفیظ نے فون اٹھایا اور سیلبر کے بعد حفیظ فارسی بولنے لگا تھوڑی۔

بعد بے صاحب! کہہ کر حفیظ نے فون رکھ دیا اسانہ کو برقع پہنا کر تانگے میں بٹھا کر چلا گیا میں نے پوچھا: کہاں لے جائے گا اسے؟ "ترندی نے جواب دیا: آقا نور احمد کے گھر۔"

یزدانی بولا: "وہ سفیر افغانستان کا خاص آدمی ہے؟"
 "خاص آدمی کیا نام؟ سفیر مقیم لاہور کہو؟" ترندی نے اس کا تعارف کرایا۔
 میں نے کہا: یہ کہانی تو سوشل سے ایک دم سیاسی ہوتی جا رہی ہے۔
 "ہو جانے دو۔ حفیظ چوکھا آدمی ہے۔ وہ منٹ لے گا۔"

اسی شام کو منزل ہوٹل کے سامنے تین چار تانگے آکر ٹک گئے۔ میری مٹی کے بد معاش، غنڈے اور پہلوان اتر کر زندنا تے ہوئے ہوٹل کے اندر گھس گئے۔
 ہوٹل کے مالک ظفر زبیری اور امیر پہلوان کالڑ کا فضل الہی حفیظ کے ساتھ بیٹھے ٹپ لڑا رہے تھے۔

آتے ہی ایک غنڈے نے حفیظ کو گھسیٹ لیا۔ حفیظ دھماں یاں آدمی جھٹک کر فرش پر آگرا۔ اٹھو یا چلا یا! کہاں ہے انور؟

حفیظ اٹھ کر کھڑا ہوا اور تاؤ میں بولا: تم انور کے کیا لگتے ہو؟
 ایک پہلوان نے آگے بڑھ کر کہا: جانی بچا نا چاہتے ہو تو انور کو ہمارے حوالے کرو۔
 فضل الہی پہلوان پہلے تو سبکا بگاؤ دیکھنے رہے پھر یکا یک بھرک اٹھے۔ اور
 سب سے مضبوط پہلوان کے ایک سکا مارا۔ وہ کھابازی کھا کر میز پر آگرا پھر فضل الہی
 نے میز اٹھائی تو وہ جیت نہیں پر جا پڑا۔ باقی پہلوان کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔
 فضل الہی نے سب کو گھور کر کہا: کس کو چاہئے انور؟

حفیظ قندھاری نے اللہ دیا کو دکھا کر کہا: ”یہ ہے وہ بھڑوا۔“ اللہ دیا۔
اس کو چاہتے انور۔“

فضل الہی کو سب جانتے تھے۔ اس کے باپ امیر پہلوان کے اکھاڑے کی
مشق پہنانک کر یہ سب جوان ہوئے تھے اور پہلوان بنے تھے۔ وہ سب اللہ دیا کی
طرف دیکھنے لگے۔

اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ عاشق نام کے ایک پہلوان نے کہا:
”یاد ہی۔ (جہانی صاحب) ہمیں کیا معلوم تھا کہ آپ کے پاس ہے ہم
کبھی آتے ہی نہیں۔“

ایک کبوتر پہلوان بولا۔ ہم اس کا فیصلہ استام امیر پہلوان کے سامنے کریں
گئے۔ اتنا کہہ کر وہ سب کو لے کر چلا گیا۔

ان کے جانے کے بعد فضل الہی کو خطرے کا احساس ہونے لگا۔
اس نے حفیظ سے کہا۔ یار آبا جان تو مار ڈالیں گے۔ وہ ہمیشہ پھری کرے
باندھے رہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے وہ اب میری کمزور چلے گی۔“

حفیظ قندھاری نے کہا: ”گھبراؤ نہیں“ میں پہلوان صاحب سے خود بات
کر لوں گا۔“

دوسرے دن امیر پہلوان کے حجرے میں بیٹھ کر حفیظ نے اللہ دیا کے سامنے
کہا: ”چا چا جی! یہ معاملہ بڑا سیریس ہے۔ انور غیر علاقے کی لڑکی ہے۔ یہ اس کو
اڑا کر لے آیا ہے اب حکومت افغانستان نے انگریزی سرکار سے پوچھا ہے کہ یہ
لڑکی لاہور میں کیسے پہنچ گئی۔ اور اس وقت وہ افغانستان کے بغیر کے قبضے میں ہے۔“

اٹھ دیا نے کہا: اس کا باپ خود نکاح پڑھا کر اسے میرے پاس چھوڑ گیا ہے۔

وہ میری بیوی ہے۔“

امیر پہلوان سیدھے سارے بزرگ آدمی تھے۔ یہ سب گو رکھ دھندھا جس کر
انہیں میں پڑ گئے۔ نکاح، حکومت افغانستان، انگریزی سرکار، فضل الہی نے جینا کی
حمایت کی تو وہ بولے: ”میاں میرا لڑکا تمہاری حمایت کر رہا ہے۔ اس لئے میں تو
اس کا فیصلہ کروں گا نہیں کسی اور کی بیخ بنادیتا ہوں اور آقا فوراً محمد اچھا آدمی
ہے۔ اس کو بھی ملا لیتا ہوں۔ اس معاملے کو سیاسی کہیں بنا رہے ہو۔ اگر وہ اٹھ دیا
کی بیوی ہے اور اس کے پاس رہنا چاہتی ہے تو کوئی حکومت اسے روک نہیں
سکتی۔ اور اگر نہیں رہنا چاہتی تو کوئی قانون رکھ نہیں سکتا۔“

یزدانی صاحب نے کہا: مولانا سلطان محمود کے پاس مسئلے کو بھیج دیجئے؟
سب نے کہا: ہاں وہ نیک آدمی ہیں اور بے لوث ہیں۔ دوسرے دن آقا فوراً
گلے میں مستقل لشکری حفیظ قندھاری کے ساتھ انور کو لے کر مولانا سلطان محمود
کے مکان پر آ پہنچے۔ ایک طرف کھڑے بیٹھے۔ اٹھ دیا ان کے آگے تھاہم دوسری طرف
بیٹھے۔ حفیظ قندھاری ہمارے سامنے تھا۔ بیچ میں انور بیٹھ گئی۔ مولانا نے پوچھا۔
”لڑکی تیرا نام کیا ہے؟“

”انور۔!“

”تمہارا نام کیا ہے؟“ انہوں نے اٹھ دیا سے سوال کیا۔

”جی، اٹھ دیا۔“

”کام کیا کرتے ہو؟“ مولانا نے پوچھا۔

”کام۔؟ جی ہم جہاں جوتے ہیں“ اللہ دیا نے جواب دیا۔
 ”میں نے پوچھا ہے کام کیا کرتے ہو“ آواز میں قہر کے کڑھکی تھی۔ اللہ دیا
 نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”جی پہلے میری بہنیں مجھ کو کتنی نصیحتیں، اب تو جھگڑا کر آئی ہیں“
 سننا اچھا لگا۔ مولانا نے پہلو بدل کر بیٹھتے ہوئے کہا ”تو کیا چاہتا ہے؟“
 اللہ دیا بولا ”یہ میری بیوی ہے، مجھے ملتی چاہئے“
 ”کیوں بی بی یہ تیرا خاوند ہے؟“ مولانا نے انور سے پوچھا۔
 انور نے جیسے زور سے انکار میں سر ہلا کر کہا ”یہ جھوٹ بولتی، ہمارا شادی نہیں ہوا۔“
 پھر سنا اچھا لگا۔ حنیف نے خوش ہو کر بھیڑی طرف دیکھا۔
 مولانا نے پھر پوچھا ”تو اللہ دیا کے پاس رہنا چاہتی ہے؟“
 انور نے پھر سر ہلا کر کہا ”ہم نہیں رہتا۔“
 مولانا تھوڑی دیر سب چہروں کو دیکھتے رہے۔ پھر بولے ”اچھا تو کس کے
 پاس رہنا چاہتی ہے؟“

انور نے جھٹ جواب دیا ”حنیف کے پاس“
 ”حنیف کون؟“ مولانا نے آغا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
 قندھاری نے مسکرا کر کہا ”جی میرا نام حنیف ہے“
 مولانا نے حنیف سے پوچھا ”یہ تیری کون ہے۔؟“
 حنیف ”جی یہ میری.... جی میری....“ کہہ کر لا جواب سا ہو گیا۔ اللہ دیا
 ہنس پڑا۔ حنیف نے انور کی طرف دیکھا۔

مولانا نے کہا: "بھئی میں یہ جانتا تھا بتا ہوں کہ یہ تیرے پاس کس رشتے سے رہنا چاہیے؟
حفیظ رشتہ کیا بتاتا۔ وہ آج تک تو ایک ہی رشتے کا قائل تھا۔

مولانا نے انور کو مخاطب کر کے کہا: "یہ تیرا کوئی گناہ ہے؟"

انور نے ایک سانس لیا، پہلو بدلا، اور بولی: "حفیظ میرا بھائی لگتا ہے؟"

"بھائی! میں یزدانی اور ترمدی چھ تک اُٹھے۔

"آہوجی — دوازاں دور سے؟"

مولانا نے کہا: "یہ کیا بولتی ہے؟"

میں نے پشتو کا ترجمہ کر کے کہا: "کتنی ہے۔ ہاں جی! یہ میرا بھائی ہے؟"

مولانا نے کہا: "تو تو اپنے بھائی کے ساتھ جا سکتی ہے۔ اس کے پاس رہ سکتی

ہے۔ کوئی قانون تجھے نہیں روک سکتا۔ بہن بھائی سے زیادہ پاک مقدس رشتہ کوئی نہیں ہے۔

حفیظ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے انور کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا: "رازا کو رتالا ڈشوا

خود سے مراد (وہیں گھر چلیں) اور وہ دونوں باہر اندھیری گلی میں نکل گئے۔

حفیظ قندھاری کہاں گیا؟ انور کہاں ہے؟ کوئی نہیں جانتا تھا۔ آٹھ دن تک

ہم لوگ سوچتے رہے کہ حفیظ قندھاری صرف ایک رشتے کو ماننے والا آدمی نہیں کہہ کر

مقدمہ جیت کر اور اڑکی لے کر چلا گیا۔ ترمدی نے کہا: "حفیظ پڑھا لکھا آدمی ہے اور

انگریزی کی اس کمات کو خوب جانتا ہے۔" جنگ اور محبت میں سب کچھ جانتا ہے۔"

یزدانی کہتے: "لیکن وہ ہندوستانی ہے مسلمان ہے۔" قول خجانا جانتا ہے۔"

اور میں بالکل ہی الجھن میں پڑ گیا۔ حفیظ قندھاری کے کردار سے ایک طرح کی نفرت ہوئی۔

ایک دن صبح موہنہ اندھیرے گھر کے نیچے ایک ٹرک آ کر رکھا۔ حفیظ قندھاری

ایک اُتار پڑا تو لڑکی کے ساتھ اوپر گایا۔ لڑکی اندر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ تنہا ہی نے کہا نیچے ٹرک میں سامان دکھا ہے میرے ساتھ چلو، سامان اُتار کر اوپر لائیں؟

”سامان کیسا؟“

”جینز ہے“ حفیظ نے کہا۔

”جینز؟“

”کہاں سے لائے؟“

”بازار سے خرید کر لایا ہوں۔ آج شام کو نکاح ہے۔ چار بجے برات آنے گی منزل ہوٹل میں دعوت کا انتظام کر دیا ہے؟“

برات آنے گی کہ جائے گی؟“ میں نے سوال کیا۔

حفیظ نے کہا: ”آئے گی ہمارے گھر اور میری بہن کی شادی ہوگی اس گھر میں؟“

”تنہا ہی بہن؟“ میں نے پوچھا۔

”اندر۔ میری بہن۔“ حفیظ نے سنجیدگی سے کہا۔

یزدانی نے میری طرف دیکھا۔ میں فروش پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

”تو رخصتی نے کہا؟ لڑکا کون ہے میاں؟“

”ابراہیم پیلوان؟“

”وہ جو ریٹو سے میں نوکر ہے؟ فضل الملکی کا مرنہ بولا بھائی خوب صورت جوان؟ وہی؟“

جوا میر پیلوان کے گھر میں ہی رہتا ہے؟

”ہاں۔“ آتا کہہ کر حفیظ نیچے چلا گیا، اور جینز کا سامان اُتارنے لگا۔

”شمع“ دہلی